مطالبہ اقلیت

کا

عالمی پس منظر

دوست محمد شاہد مورخ احمدیت

فہرست مضامین

مطالعۂ اقلیت

دجّالی طاقتوں کی ایک سو سترہ '117' سال پر محیط خوفناک
عالمی سازشوں کا دستاویزی انکشاف اور ان کی آلہ کار
مسلم ممالک اور مذہبی شخصیات
عکسی حوالوں سے مرصّع
(مئی 1857ء۔ ستمبر 1974ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانانِ ہند کے خلاف 1857ء کی تحریکِ بربادی جو کارل مارکس کے پراپیگنڈا (Propaganda) سے چلائی گئی۔ نظریہ قدیم مزدیک دجال خراسانی (بہائیت) اور آریہ سماج جیسی اسلام دشمن تحریکیں اور ان سے متاثر مشہور مسلم زعماء (ابوالکلام آزاد، سراقبال)۔ برٹش انڈیا میں خالص ہندوراج کے قیام کی سازش کو بروئے کار لانے کے لئے آل انڈیا کانگرس کے اجلاسِ راوی، دسمبر 1929ء میں مجلس احرار کا قیام۔ احمدیت، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ۔ احرار کا مطالبہٗ اقلیت اور اس کے پس پردہ کارفرما عیسائیت کی دجّالی اور استعماری طاقتوں کی عالمی سطح پر پشت پناہی۔ عرب ممالک سے خفیہ روابط اور انڈر گراؤنڈ (Underground) سکیموں کا انکشاف جن سے مسلم دنیا کا ایوان عظمت وسیادت لرزہ بر اندام ہے۔

مقدمہ

پُراسرار پردوں میں پوشیدہ

اصل تاریخ

(جدید تحقیقات واکتشافات کا خلاصہ)

احراری مطالبہ اقلیت (اکتوبر1934ء تا ستمبر1974ء) کے عالمی پس منظر کی تفصیل اس باب کے آئندہ صفحات میں بیان ہوگی۔ یہاں صرف جدید تحقیقات واکتشافات کے حوالہ سے اس کا خلاصہ دیا جانا مقصود ہے۔

قدیم تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم پر یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی اوراقتصادی واخلاقی زوال انیسویں صدی کے آغاز ہی میں انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ اور ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ ابونصر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر (ولادت1775ء۔ وفات7 نومبر1862ء) محض ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار تھے جن کی سب سطوت وشوکت صرف دلّی کے لال قلعہ تک محدود ہوکے رہ گئی تھی اور ملک کی پوری معیشت پر عملاً ہندواکثریت اور ہندوراجے قابض ہوچکے تھے اور اگر ہم اس دور کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو یہ انکشاف ہوگا کہ 1857ء کا غدر جوبظاہر ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف تھا، درپردہ ہندوراج کے قیام کی منظم سازش تھی جس کی تشکیل بانیٔ سوشلزم کارل مارکس (1818ء۔1883ء) کی رہین منت تھی جواُن دنوں لندن میں مقیم تھا اور امریکی پریس میں آرٹیکل لکھ کر غدر سے قبل کئی سال سے ہندوؤں کو مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف مشتعل کررہا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت پر اکساتا چلا آرہا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے خلیفۃ المسلمین نے مسلمانان ہند کے تحفظ کیلئے برطانوی افواج کو رستہ دیا اور رام راج کی ہندوبغاوت ناکام ہوگئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی برطرف کردی گئی اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858ء کے مطابق

ہندوستان کی حکومت براہ راست تاجِ برطانیہ کے ماتحت کر دی گئی اور اس کا انتظام ایک وزیر ہند کے سپرد ہوا۔ حکومت انگلستان نے کمپنی کا قرضہ اپنے ذمہ لے لیا۔ برّی اور بحری سپاہ سرکار کی ملازمت میں منتقل ہوگئی اور ہندوستان کی کل آمدنی کے خرچ کا اختیار وزیر ہند اور اس کی کونسل کو سونپ دیا گیا۔

مورّخِ پاکستان مولوی محمد شفیع صاحب ایم۔اے۔ ''تاریخ ہند'' حصہ دوم کے صفحہ 191 تا 193 میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ملکہ معظمہ وکٹوریہ نے غدر کے واقعات سے متاثر ہوکر ایک اعلان کیا جو اعلان قیصری کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اعلان تاریخ ہند میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور ہندوستان کی آزادی کا چارٹر کہلاتا ہے۔ اس میں ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی وہ تمام مراعات درج ہیں جو اس نے ہندوستان کی بہبودی کے لئے عطا کیں۔''

یکم نومبر 1858ء کو الہ آباد کے مقام پر لارڈ کیننگ (Lord Canning) نے جو ہندوستان کا پہلا وائسرائے مقرر ہوا، ایک شاہی دربار منعقد کیا جس میں یہ اعلان پڑھ کر سنایا گیا۔

> ''مابدولت کی طرف سے والیان ریاست کو متبنے بنانے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ ان کے جو معاہدے کمپنی کے ساتھ تھے وہ برقرار رہیں گے۔ رعایا کو اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل رہے گی۔ حکومت کی طرف سے ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی۔ ہندوستان جب اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنا انتظام آپ کر سکے تو اسے حکومت خوداختیاری عطا کی جائے گی۔ قانون ملکی امیر وغریب پر یکساں حاوی ہوگا۔ سرکار کے نزدیک انگریز۔ عیسائی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ سب یکساں ہیں۔ ان باغیوں کو جنہوں نے قتل میں اقدام نہیں کیا، غیر مشروط معافی دی جائے گی۔ ملک کی بہبودی اور امن کا ہر وقت خیال رکھا جائے گا۔ ملازمتیں خواہ انگریز ہوں یا ہندوستانی، ان کی قابلیت کے مطابق عطا کی جائیں گی۔ اعلان قیصری کے بموجب ہندوستان کی عنان حکومت براہِ راست حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں آگئی۔''[1]

غدر کی آگ فرو ہونے کے بعد آخری مغل تاجدار کے خلاف فوجی عدالت دیوان خاص قلعہ میں زیر ایکٹ 16۔1857ء مقدمہ چلایا گیا۔ 27 جنوری 1858ء کو پہلا اجلاس ہوا جس میں فرد قرارداد جرم یہ عائد کی گئی کہ بغاوت کے دوران انہوں نے انگریز افسروں اور برطانوی رعایا کے، جس میں بے گناہ اور معصوم بچے بھی شامل تھے، قتل میں مدد دی اور والیانِ ریاست کے نام احکام جاری کئے

کہ وہ عیسائیوں اور انگریزوں کو اپنی حدود میں جہاں پائیں، قتل کر دیں۔

9مارچ 1858ء کو بہادر شاہ ظفر نے تحریری بیان دیا کہ غدر کا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ سب بغاوت میرٹھ کے مفسد بلوائیوں نے برپا کی۔ انہوں نے مجھے بھی قید کر لیا۔ خود احکام لکھ کر مجھے مہر ثبت کرنے پر مجبور کرتے تھے چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

''میں نے کبھی اُن کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ انہوں نے اس طرح بدوں میری مرضی یا خلاف حکم میرے ملازموں ہی کو نہیں لوٹا بلکہ کئی محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا، قید کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جو جی چاہتا تھا کر گزرتے تھے۔ جبراً معزز اہل شہر سے اور تجّار سے جتنی رقم چاہتے وصول کرتے تھے اور یہ مطالبات اپنی ذاتی اغراض کے لئے کرتے تھے۔ **جو کچھ گزرا ہے وہ سب مفسدہ پرداز فوج کا کیا دھرا ہے۔ میں اُن کے قابو میں تھا اور کر کیا سکتا تھا؟** وہ اچانک آ پڑے اور مجھے قیدی بنا لیا۔ میں لاچار تھا اور دہشت زدہ۔ جو انہوں نے کہا میں نے کیا ورنہ انہوں نے مجھے کبھی کا قتل کر ڈالا ہوتا۔ اسی لئے میں نے فقیری کا تہیہ کر لیا تھا اور گیروے رنگ کی صوفیانہ پوشاک پہننی شروع کر دی تھی۔ پہلے قطب صاحب کی درگاہ۔ وہاں سے اجمیر شریف اور اجمیر شریف سے بالآخر مکّہ معظمہ جانے کا عزم تھا لیکن فوج نے مجھے اجازت نہیں دی۔ جس نے میگزین و خزانہ لوٹا۔ یہ سپاہ ہی تھی جو چاہا کیا.... باغی فوج کی عادتوں کی نسبت معلوم ہو کہ انہوں نے مجھے کبھی سلام تک نہیں کیا۔ نہ میرا کسی قسم کا ادب و لحاظ کیا۔ وہ دیوان خاص و دیوان عام میں بے دھڑک جوتیاں پہنے چلے آتے تھے۔ میں ان فوجوں پر کیا اعتبار کرتا جنہوں نے اپنے ذاتی آقاؤں کو قتل کر دیا۔ جس طرح انہوں نے ان کو قتل کیا مجھے بھی مقید کر لیا۔ مجھ پر جور کئے، مجھے حکم میں رکھا اور میرے نام سے فائدہ اٹھایا.... میں بے فوج، بے خزانہ، بے سامان جنگ، بے توپخانہ کیونکر انہیں روک سکتا تھا یا ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتا تھا؟ لیکن میں نے کبھی کسی طرح ان کی مدد نہیں کی۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو گورنمنٹ کی حفاظت میں دے دیا۔ باغی فوجیں مجھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی تھیں مگر میں نہ گیا۔''

شاہ نے تحریری بیان کے آخر میں تحریر فرمایا:

"مذکورہ بالاجواب میرا خود تحریر کیا ہوا ہے اور بلامبالغہ ہے۔ حق سے اصلاً انحراف نہیں کیا ہے۔ خدا میرا عالم وشاہد ہے کہ جو کچھ بالکل صحیح تھا، جو کچھ مجھے یاد تھا، وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں میں نے آپ سے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر ملاوٹ کے وہی لکھوں گا جو حق اور راست ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی میں نے کیا ہے۔" دستخط بہادر شاہ بادشاہ[2]

یہ مقدمہ ایک فوجی کمیشن کے تحت تھا جس کا پریذیڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل ڈاس افسر توپ خانہ تھا۔ دوران مقدمہ 8 فروری 1858ء کو سر تھیوفلس میٹ کاف نے عدالت میں حلفیہ گواہی دی کہ غدر سے چند روز قبل جامع مسجد دہلی کی دیوار پر میلے سے کاغذ کا ایک چھوٹا ٹکڑا چسپاں کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ شاہ ایران عنقریب اس ملک میں آنے والے ہیں اور انہوں نے تمام مسلمانوں کو، کافر انگریزوں کو فنا کرنے کی دعوت کی ہے۔ جو لوگ اسمیں شامل ہوں گے اجر عظیم کے مستحق ہوں گے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اشتہار دیکھ کر دہلی کے پانچ سو مسلمانوں نے جہاد کرنے کی آمادگی ظاہر کی تھی۔ یہ اشتہارات کے وقت تقریباً تین گھنٹہ تک چسپاں کیا گیا۔ صبح کے وقت اس کے پاس آدمیوں کا ہجوم لگ رہا تھا اور جب میں نے سنا تو جا کر اُتار ڈالا۔ عام خیال تھا کہ **کسی بدمعاش نے چسپاں کر دیا ہو گا۔**"[3]

بہادر شاہ ظفر کے ہندو سیکرٹری مکند لال اور چنی لال اخبار نویس نے عدالت میں مغل تاجدار کے خلاف گواہیاں دیں اور قتل وغارت کی ذمہ داری اس بے گناہ اور مظلوم بادشاہ پر ڈال دی۔

چنانچہ اس نے بیان دیا کہ قلعہ دہلی میں محصور معصوم لیڈیوں اور بچوں کا قتل بادشاہ کی اجازت سے ہوا اور سنبت علی خان نے چلّا کر کہا کہ بادشاہ نے قیدیوں کے قتل کئے جانے کی اجازت دی ہے جس کے بعد بادشاہ کے مسلح سپاہی زیر حراست قیدیوں کو مقتل تک لے گئے اور باغی فوجیوں سے مل کر غریب قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ مکند لال نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا۔

"جونہی باغی آئے مسلمان فی الفور اُن سے مل گئے۔"[4]

اسی طرح چنی لال اخبار نویس سے پوچھا گیا کہ انگریزوں کو کس کے حکم سے قتل کیا گیا تھا تو اُس نے جواب دیا "بادشاہ کے حکم سے ہوا تھا اور کون ایسا حکم دے سکتا تھا۔"[5]

9 مارچ 1858ء کو بہادر شاہ ظفر کی تحریری شہادت کے معاًبعد فریڈ جے ہیرائٹ ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل ووکیل سرکاری نے اپنی بحث میں ہندوؤں کی انہیں گواہیوں پر سب سے زیادہ زور دیا

اور اسی بناء پر فوجی عدالت نے بالاتفاق فیصلہ دیا کہ "ملزم محمد بہادر شاہ سابق بادشاہ دہلی تمام جرائم کے مجرم ہیں۔"6

اس فیصلہ کے نتیجہ میں جو ہندوؤں کی مفتریانہ اور جھوٹی شہادت کی بناء پر کیا گیا، بہادر شاہ ظفر رنگون میں قید کر دیئے گئے اور غریب مسلمان انگریزوں کے جوش انتقام سے تباہ و برباد ہو گئے اور چالاک ہندو و سرمایہ دار وقتی طور پر انگریزی حکومت کی اطاعت کا دم بھر کے کلیدی محکموں اور ملازمتوں پر چھا گیا۔ دوسری طرف برٹش انڈیا کا مسلمان برسوں تک انگریزوں کا معتوب رہا۔ ہندو ساہو کاروں اور سرکاری افسروں نے اس پر ترقی کے دروازے مسدود کر دیئے، حتٰی کہ اس کی قومی ہستی بھی خطرے میں پڑ گئی۔ دسمبر 1895ء میں چند معتدل مزاج انگریزوں نے جن میں اے او ہیوم (A.O.Hume) سر ڈبلیو ویڈرزبرن (Sir W. Weddars Burn) سر ڈیوڈ یول (Sir David Yule) اور سر ہنری کاٹن (Sir Henry cotton) بھی شامل تھے، بمبئی میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ یہی تینوں انگریز 1885ء سے 1900ء تک اس کے پریذیڈنٹ تھے۔ کانگرس کا بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ بلاتمیز مذہب و ملت ملک کے تمام باشندوں کو ملکی مشینری اور معیشت و سیاست میں نیابت دی جاسکے مگر شروع ہی سے عملاً یہ ہندوؤں ہی کی نمائندہ جماعت بن گئی۔7 جس پر مسلمانوں کے بیدار مغز اور مدبر لیڈر سر سیّد احمد خان (1817ء۔1898ء) نے 1892ء میں مطالبہ کیا کہ لیجسلیٹو کونسلوں اور لوکل باڈیز میں مسلمانوں کو خاطر خواہ تعداد میں نمائندگی دی جائے۔ انہوں نے قبل ازیں 1886ء میں محمڈن اینگلو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی اور واضح کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور ان کی روایات، ان کے مفادات، ان کی سیاسی اور سماجی مصروفیات اور میلانات، ان کی مذہبی رسوم اور عقائد علیحدہ اور ہندوؤں سے یکسر مختلف ہیں۔ اس لئے مسلمان نمائندوں کا انتخاب بھی جداگانہ ہونا چاہیے۔8 لارڈ کرزن ہندوؤں کے بیدار مغز اور رعایا پرور وائسرائے تھے۔ انہوں نے محکمہ آثار قائم کر کے مسلمانوں کی تاریخی عمارتوں اور ہندو دور کے آثار کو محفوظ کیا اور نہ صرف مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا بلکہ 1905ء میں تقسیم بنگال کا جرأت مندانہ اقدام کر کے مشرقی بنگال کو ایک الگ صوبہ بنا دیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس طرح عرصہ بعد دوبارہ بنگالی مسلمانوں کے پھلنے پھولنے کی راہ ہموار ہو گئی مگر بقول سیّد رئیس احمد جعفری:

> "یہ اتنا بڑا حادثہ ہندو سامراج کے لئے تھا کہ ہندوؤں میں ایک شورش پیدا ہو گئی۔ انارکسٹ اور دہشت انگیز لوگ پیدا ہو گئے، بم پھٹنے لگے، گولیاں چلنے لگیں،

امن وامان برباد ہو گیااور شورش واضطراب کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کو مناصب بلند پر فائز دیکھ کر ہندو آگ کی طرح بھڑک اٹھے۔ باغیانہ مظاہرے ہوئے۔ اشتعال انگیزیاں کی گئیں۔ قتل وخونریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ حد یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس تک چیخ اٹھی۔"9

دراصل بات یہ تھی کہ گو غدر میں ہندوراج کا منصوبہ شکست کھا گیا مگر جوں جوں غیر ملکی حکومت میں اس کے قدم مضبوط ہوتے گئے، ہندو دماغ میں مسلمانوں کے خلاف انتقامی جذبات تیز تر ہوتے گئے اور ایک نئے غدر کے ذریعہ انگریزی حکومت کا تختہ الٹ کر پورے ملک کو ہندو ریاست بنانے کی سازشیں اندر ہی اندر وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان کے طول وعرض میں کانگرس کے علاوہ بہت سی ہندواور سکھ انارکسٹوں کی پارٹیاں وجود میں آگئیں جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ بغاوت کرکے انگریزی حکومت کی جگہ ہندوراج قائم کر دیا جائے۔ تقسیم بنگال کے فیصلہ نے اس خیال پر چونکہ ضرب کاری لگائی اس لئے ہندوؤں کے مخفی عزائم شورش بنگال کی شکل میں پہلی مرتبہ کھل کر سامنے آگئے جس نے غریب اور پسماندہ مسلمانوں کو بھی احساس دلایا کہ ہندوؤں کو مسلم قوم کا وجود ہی ناقابل برداشت ہے اور اگر غیر ملکی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو ہندو ان کی تکابوٹی کر دیں گے۔

ہندوستان اور بیرونی ممالک کی ایسی تمام باغیانہ تحریکوں کے روح رواں مشہور انقلابی لیڈر لالہ ہردیال ایم اے تھے جنہوں نے اپنے ایک بیان میں واضح لفظوں میں اعلان کیا کہ:-

"ہندو قوم اور ہندوستان اور پنجاب کا مستقبل ان چار آدرشوں (مقاصد) پر منحصر ہے۔ ۱۔ہندو سنگھٹن ۲۔ ہندوراج ۳۔ اسلام اور عیسائیت کی شدھی ۴۔افغانستان اور سرحد کی فتح اور شدھی۔"10

لالہ جی نے کئی مرتبہ اپنے اس بیان کے مختلف پہلوؤں پر ہندوستان میں مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف نہایت زہر آلود تقریریں کیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا:-

"جوش پیدا ہو گا تو سوراج، شاہی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، فجی اور دوسرے ملکوں پر قابض ہو جائیں گے جہاں ہندو بھائی آباد ہیں، کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو دنیا بھر میں غلامی کی حالت میں نہ چھوڑیں گے۔ ایسی دیش بھگتی کی لہر چلے گی۔ نام کی گنگا میں چڑھاؤ آئے گا۔ پس **اگر ہندوستان**

کو کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندوراج قائم ہو گا۔"[11]

پھر بدترین فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوؤں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف اکساتے ہوئے یہ تجویز پیش کی:-

"سوراج پارٹی کا اصول ہونا چاہئے کہ ہر ہندوستانی بچہ کو قومی رتن[12] دئے جائیں خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی۔ اگر کوئی فرقہ ان کو لینے سے انکار کرے اور ملک میں دورنگی پھیلائے تو اس کی قانونی طور پر مخالفت کر دی جائے یا اس کو عرب کے ریگستان میں کھجوریں کھانے کے لئے بھیج دیا جائے۔ ہمارے ہندوستان کے آم، کیلے اور نارنگیاں کھانے کا انہیں کوئی حق نہیں۔"[13]

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوؤں اور ان کے ہم خیال سکھوں نے انٹر نیشنل سوشلسٹوں سے عالمی سطح پر گٹھ جوڑ کیا اور انڈر گراؤنڈ بغاوت کی خوفناک تیاریاں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں۔ 1905ء میں وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے مسلمانان بنگال کی بہبود و ترقی کے لئے تقسیم بنگال کا اعلان کیا تو بنگال کے ہندو انارکسٹ ابھر کر سامنے آ گئے جس میں کانگرسی لیڈر جناب ابوالکلام آزاد نے انارکسٹوں کی بھرپور پشت پناہی کی اور بنگالی مسلمانوں کے خلاف نہایت افسوسناک کردار ادا کیا۔

1911ء میں انٹر نیشنل سوشلسٹ پارٹیوں کے گٹھ جوڑ سے "ہندو سکھ غدر پارٹی" کا قیام عمل میں آیا جس میں جناب آزاد بھی شامل ہو گئے۔ اس پارٹی کے پیچھے امریکہ میں مقیم سوشلسٹ لیڈر سرگرم عمل تھے۔ پارٹی کی مشیر خاص پولینڈ کی مشہور سوشلسٹ رہنما مسز گولڈ تھیں۔ کینیڈا میں پناہ گزین ہندوؤں اور سکھوں کی تمام ہمدردیاں غدر پارٹی کے ساتھ تھیں۔ پارٹی نے "غدر" کے نام سے امریکہ سے ایک رسالہ جاری کیا جو اردو، گورمکھی، گجراتی، ہندی، گورکھا زبانوں میں چھپتا تھا اور امریکہ کے علاوہ کینیڈا، فلپائن، فجی، جاپان، چین، شنگھائی، ہانگ کانگ، جاوا، سماٹرا، ملایا، برما، سیام، مشرقی افریقہ اور ہندوستان میں بھیجا جاتا تھا۔[14]

اس رسالہ کے مقاصد اس کے پہلے شمارہ میں حسب ذیل بتائے گئے۔

"اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں، ان کو تباہ کر دیں، ان کی بیخ کنی کر دیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی کرم خوردہ درخت ہو۔ اور ہمارا بنیادی مقصد انگریز کو نکال کر ہندوستان میں ایک حکومت قائم کرنا ہے۔"

ایک اور شمارہ میں لکھا تھا۔

"1857ء کے غدر کو50سال ہو گئے ہیں۔ اب ہمیں ایک اور بغاوت کی ضرورت ہے۔ آج ہم انگریزی سرکار کے خلاف ایک جنگ کا آغاز کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد غدر ہے۔بغاوت برپا کرنا ہے۔ ہمارا کام ہے غدر۔یہ غدر کہاں برپا ہو گا؟ ہندوستان میں۔وہ وقت دُور نہیں جب رائفل اور خون، قلم اور اس کی روشنائی کی جگہ لے لے گا۔"15

غدر پارٹی کا ایک مقبول نعرہ تھا کہ "اتحاد کی بنیاد سوشلزم" اس پارٹی نے اس نعرہ کو عملی شکل دینے کیلئے جو سکیم تیار کی اس کے بعض اہم اور بنیادی نکات یہ تھے۔

1۔ ہندوستان کے اندر اور باہر سامراج دشمن طاقتوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کرنا۔

2۔اپنے مالی وسائل کی مضبوطی کے لئے ڈاکے ڈالنا۔

3۔بم بنانا اور انہیں مناسب مواقع اور مقامات پر استعمال کرنا۔

4۔ریلوے اور تار کا نظام تباہ کرنا۔

5۔نوجوانوں کو غدر پارٹی میں شامل کرکے انہیں اسکی انقلابی سرگرمیوں کے لئے تیار کرنا۔

6۔ پولیس تھانوں اور سرکاری خزانوں کو لوٹنا اور وہاں سے اسلحہ اور پیسہ حاصل کرنا، تا مالی استحکام ہو۔

دہلی میں بھارت ماتا سوسائٹی، بنگال میں ہندو پارٹیاں اور لندن میں انڈیا ہاؤس غدر پارٹی کے خفیہ مراکز تھے جو اس کی سازشوں کی تکمیل میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔

ہفت روزہ "غدر" نے ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ:-

"1857ء میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے پہلا غدر ہوا تھا۔ اب دوسرا غدر ہو رہا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں غدر برپا کرنے کے لئے نڈر بہادر سپاہیوں کی ضرورت ہے۔"16

رسالہ "غدر" مورخہ 20نومبر 1914ء کے اردو ایڈیشن میں عثمانی حکومت کے ایک وزیر انور پاشا کی تقریر شائع ہوئی کہ:-

"یہی وہ وقت ہے جب ہندوستان میں غدر کا اعلان کر دیا جانا چاہئے۔ انگریزوں

کے میگزین لوٹ لئے جانے چاہییں اور انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیئے۔ہندوستانیوں کی تعداد 32 کروڑ جبکہ ہندوستان میں انگریز فقط دولاکھ ہے۔ان انگریزوں کو قتل کر دینا چاہیئے۔ وہ جو مر کر اپنے وطن کو آزاد کرائے گا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

پہلی جنگ عظیم (جون1914ء تا ستمبر 1918ء) کے دوران غدر پارٹی کی خفیہ سرگرمیاں عروج تک پہنچ گئیں۔ جرمنی عثمانی حکومت کا حلیف تھا۔ برلن ہندوستانی انقلابیوں کا گڑھ بن گیا جہاں حکومت جرمنی کی مدد سے انڈیا برلن کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ کمیٹی کی درخواست پر حکومت جرمنی نے غدر پارٹی کو پیسہ اور اسلحہ فراہم کرنا منظور کر لیا اور ساتھ ہی غدر پارٹی کی فوری مدد کے لئے قسط اول کے طور پر پانچ ہزار ریوالوروں کی پہلی کھیپ مہیا کر دی جسے ہندوستان تک پہنچانے کے لئے ایک جہاز دی ہنری ایس کرایہ پر حاصل کیا گیا اور کرایہ جرمنی حکومت ہی نے دیا۔ لیکن یہ جہاز جب ہانگ کانگ کے ساحل پر پہنچا تو ایک جاپانی ڈاکٹر داؤس دیکر نے جہاز میں موجود اسلحہ کے بارہ میں مخبری کر دی اور جملہ معلومات برطانوی حکام کو فراہم کر دیں جس پر جہاز پر قبضہ کر لیا گیا۔

جرمن حکومت نے (جس کا بادشاہ ولیم دوم تھا) ہندوستانی انقلابیوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ جرمنی یا کسی اور ملک میں ہندوستان کی ایک آزاد عبوری حکومت قائم کر لیں۔ اس حکومت کو متعدد ممالک سے ہمدردی حاصل ہو جائے گی اور تقریباً آدھی دنیا اسے تسلیم کر لے گی۔ 17

کانگرس، غدر پارٹی اور دوسری باغیانہ تحریکوں کے اتفاق سے ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی جس کے سربراہ راجہ مہندر پرتاپ کو نامزد کیا گیا جنہوں نے ماسکو، نیپال اور ہندوستان میں وفود بھیجے۔ حکومت کا وزیر داخلہ مولوی عبید اللہ سندھی کو بنایا گیا تا اس بغاوت کو اسلامی لبادہ پہنا کر مسلمان حکومتوں سے امداد حاصل کی جاسکے۔ سندھی صاحب نے عرب اور ہندوستان کے دوستوں اور رشتہ داروں کو ریشمی رمالوں میں عبوری اور باغی حکومت سے متعلق خطوط لکھے جس میں بتایا کہ آزاد حکومت آخر کار مدینہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانا چاہتی ہے جہاں شہزادہ محمد حسن کو اس کی فوج کا جنرل انچیف مقرر کیا جائے گا اور اس کے دفاتر تہران، کابل اور قسطنطنیہ میں بھی قائم کئے جائیں گے۔ اور وہاں فوج کی سربراہی خود سندھی صاحب کریں گے۔ یہ سازش بہت جلد بے نقاب ہوگئی اور ریشمی رومال کی یہ ہندو باغیانہ تحریک دم توڑ گئی۔

ابتداء میں کابل حکومت نے سوویٹ یونین کی بالشویک حکومت سے درخواست کی تھی کہ

آزاد عبوری حکومت کو تسلیم کر لیا جائے اور اسی غرض کے لئے راجہ مہندر پرتاپ نے ماسکو کا دورہ کیا۔ لینن نے خوش آمدید کہا اور ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا لیکن جونہی وہ کابل واپس پہنچے، جرمنی اور ترکی کو جنگ میں شکست ہوگئی اور افغانستان نے برطانیہ کے ساتھ امن کا معاہدہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی نام نہاد عبوری حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا مگر ساتھ ہی ابوالکلام آزاد اور دوسرے دیوبندی علماء کی کمیٹی اور غدر پارٹی دونوں نے گاندھی کی سربراہی میں ملک بھر میں بد امنی اور فساد کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ چنانچہ بھارت کے ایک انقلابی مصنف بھگت سنگھ کا بیان ہے:-

> "پہلی جنگ عظیم کے وقت غدر پارٹی کو خلافت کے روپ میں انگریز کے خلاف لڑائی کرنے کے لئے ایک ساتھ مل گیا تھا۔......غدر پارٹی، خلافتی اور بنگال کے انقلابیوں نے اس لڑائی سے فائدہ اٹھا کر انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ملک کو آزاد کرانے کا بیڑا اُٹھایا۔"[18]

ظاہر ہے کہ اس آزادی کا دوسرا نام ہندوراج تھا۔ کانگرسی لیڈر پنڈت نہرو نے کانپور میں تقریر کرتے ہوئے صاف طور پر اعتراف کیا کہ۔

> "میں ایسا ہی ہندو ہوں جیسے خود پنڈت مالوی ہیں۔ میں ایک قدم بڑھ کر کہتا ہوں کہ **خود کانگرس ہندو جماعت ہے۔** اس میں 1920-21ء میں تھوڑے سے مسلمان شریک ہوگئے تھے ورنہ وہ ابتدا ہی سے **ہندو جماعت** ہے۔"[19]

1927ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کے بائیں بازو کے سوشلسٹ لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو صاحب یورپ گئے اور سوشلسٹوں کی دعوت پر برسلز کی سوشلسٹ کانفرنس میں شرکت کی۔ بعد ازاں وہ ماسکو گئے اور ایک خصوصی اجلاس میں سٹالین (Stalin) سے ملاقات کی۔[20] اور پھر ملک میں واپسی کے ایک سال بعد **31 دسمبر 1929ء کو کانگرس کے اجلاس راوی میں مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا۔** احراری لیڈروں نے جو تحریک خلافت ہی سے کانگرس سے سازباز کئے ہوئے تھے، پنڈت نہرو اور کانگرس کے پروگرام کے مطابق نہ صرف سوشلزم کے حق میں پُرزور پراپیگنڈا کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا بلکہ جماعت احمدیہ کے خلاف سیاسی اور مذہبی طور پر اشتعال انگیز تقریروں سے پورے ملک میں فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا دی۔

1935ء میں انڈیا ایکٹ کا نفاذ ہونے والا تھا جس کے نتیجہ میں مسلم اقلیت کو اپنی آبادی کے تناسب سے سیاسی حقوق کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ آل انڈیا کانگرس نے مسلم حقوق پر ضرب کاری لگانے کے

لئے راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کے مسلم نمائندوں پر شرمناک پھبتیاں کسیں۔ مگر جب انہیں ناکامی ہوئی تو گاندھی جی نے ایک طرف اچھوتوں کو ہندو قوم میں شامل کرنے کے لئے مرن برت رکھا دوسری طرف مسلم اقلیت کی تعداد کو کم کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ اکتوبر 1931ء میں احراری اور کانگرسی مولویوں کے ذریعہ احمدیوں کو دوسرے ہندوستانی مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا جس کی پُرزور تائید سر اقبال نے کی جو نہ صرف سوشلزم کے زبردست حامی اور بالشیویک روس کے زبردست مداح اور عقیدت مند تھے بلکہ ایران کے پیغمبر اشتراکیت مزدک کی علمبردار تحریک بابیّت اور اس کی ناقوس خصوصی اور گستاخِ رسولؐ قُرۃ العین طاہرہ کو ایک برگزیدہ ہستی یقین کرتے تھے۔ سر اقبال کے علاوہ جناب ابوالکلام آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ پر بھی بابیت و بہائیت کی چھاپ اس درجہ نمایاں ہے کہ احمدیت کے بدترین معاند دیوبندی عالم انور کشمیری کو بھی اس کے خلاف احتجاج کرنا پڑا جس کی تفصیل مع اس کے مستند مراجع و مصادر کے دوسرے حقائق کی طرح اپنے موقع پر آگے آرہی ہے۔

23 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قرارداد لاہور پاس کی گئی جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا۔ 1945-46ء کے مرکزی اور صوبائی الیکشن ہوئے تو حضرت مصلح موعودؓ کی قیادت میں برصغیر کے احمدیوں نے مسلم لیگی امیدواروں کی زبردست تائید کی۔ جماعت احمدیہ وہ واحد مذہبی جماعت تھی جس نے تحریک پاکستان میں قائداعظم کے دوش بدوش بھرپور حصہ لیا۔ اس کے مقابل آل انڈیا نیشنل کانگرس اور دیوبندی جمعیۃ علماء ہند اور احراری مولویوں نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ذمہ دار برطانوی افسر کو یہ راز کی بات بتائی کہ ہم مسٹر جناح کو کمزور سا پاکستان بالآخر ضرور دے دیں گے مگر ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ اہل پاکستان خود ہندوستان کی آغوش میں آجائیں گے اور ملک پھر متحد ہو جائے گا۔

چنانچہ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات (11 ستمبر 1948ء) کے بعد پاکستان سے ایک احراری لیڈر دہلی گئے اور خفیہ طور پر پنڈت جی سے ملاقات کی اور درخواست کی کہ پاکستانیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اگر ہماری مدد کی جائے تو ہم دونوں ملکوں کو متحد کر سکتے ہیں۔ [21] اس ملاقات کے بعد احرار نے "ختم نبوت" کے نام پر باغیانہ تحریک چلائی اور مملکت خداداد پاکستان کے امن وامان کو تہ وبالا کر دیا اور نوبت 1953ء کے خونیں فسادات پنجاب تک پہنچ گئی۔

ایجی ٹیشن کی ناکامی کے بعد اکثر احرار لیڈر مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ میں شامل ہو کر دونوں

بازؤوں میں نفرتوں کا بیج بونے لگے اور جب دسمبر 1971ء میں سقوط ڈھاکہ ہوا تو احرار نے آل انڈیا نیشنل کانگرس کی سکیم کے عین مطابق اپنی توجہ بچے کھچے پاکستان میں فرقہ پرستی کو ہوا دینے پر مبذول کر دی اور ضربِ خفیف کے ایک معمولی واقعہ کی آڑ لے کر افترا پردازیوں کی ایسی انسانیت سوز مہم چلائی کہ پاکستان کی سرزمین جس کے لئے احمدیوں نے قربانیاں دی تھیں اور خون کے نذرانے پیش کئے تھے، کربلا بنادی گئی اور ظلم و ستم کی حد یہ تھی کہ پاکستان کے سوشلسٹ وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی ہوس میں جماعت احمدیہ پاکستان کے خلاف نیشنل اسمبلی میں 7 ستمبر 1974ء کی قرارداد تکفیر پاس کرائی۔

"سانحہ ربوہ" کا منصوبہ کہاں اور کس ملک میں تیار ہوا؟ اُس کا انکشاف انہی دنوں وزیر اعظم پاکستان نے اپنی نشری تقریر میں کر دیا اور واضح لفظوں میں بتایا کہ اس کے پیچھے ماسکو اور کابل کا ہاتھ ہے۔[22]

جدید تحقیقات واکتشافات کے اس اجمالی خلاصہ کے بعد احراری مطالبہ اقلیت کے پس منظر کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

حواشی:

[1] تاریخ ہند حصہ دوم صفحہ 191-193 از مولوی محمد شفیع صاحب ایم اے سابق ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور مطبوعہ بک ڈپو اردو بازار لاہور۔

[2] "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" (از خواجہ حسن نظامی دہلوی) صفحہ 2-3 و صفحہ 157 تا 163 اشاعت جولائی 1920ء۔ طبع دوم اپریل 1990ء ناشر الفیصل غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔

[3] "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" صفحہ 56-57۔

[4] "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" صفحہ 106۔

[5] "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" صفحہ 197۔

[6] "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" صفحہ 225۔

[7] "The Oxford History of India" p.737 (By The Late Vincent Smith, C.I.E) Oxford University Press Karachi 1992.

[8] اکابرین تحریک پاکستان صفحہ 169-170۔ از جناب محمد علی چراغ صاحب۔ ناشر سنگ میل پبلیکیشنز لاہور اشاعت 1997ء۔

[9] قائد اعظم اور ان کا عہد صفحہ 42-43۔ مولفہ جناب رئیس احمد جعفری مورخ پاکستان۔

[10] اخبار ملاپ 23 جون 1925ء صفحہ 9 بحوالہ "ہندو راج کے منصوبے" از محقق احمدیت ملک فضل حسین صاحب قادیان۔ طبع ہفتم۔ اشاعت دسمبر 1931ء قادیان۔

11 اخبار ملاپ 23 جون 1925ء صفحہ 9 بحوالہ "ہندوراج کے منصوبے" صفحہ 84-85 از ملک فضل حسین صاحب قادیان اشاعت اپریل 1946ء بار نہم۔

12 ہندو لٹریچر، ہندو تہذیب اور ہندو دیو تاوغیرہ۔

13 اخبار "پیغام صلح" لاہور (بحوالہ ہندوراج کے منصوبے صفحہ 182)

14 (تلخیص) "پنجاب میں بائیں بازو کی سیاست" 1909ء۔ 1947ء مولف جناب اجیت جاوید مترجم محترم طاہر کامران صاحب ناشر فکشن ہاؤس مزنگ روڈ لاہور۔ اشاعت 1998ء۔

15 پنجاب کی انقلابی تحریکیں (1906ء۔1946ء) صفحہ 41-42 از پروفیسر سید ایم رائے صاحب مترجم محمود زمان ناشر جمہوری پبلیکیشنز نیلا گنبد لاہور۔ اشاعت اول جولائی 2004ء۔

16 پنجاب کی سیاسی جدوجہد (1857ء تا 1944ء) صفحہ 47 تالیف جناب بھگت سنگھ صاحب گورمکھی سے اردو ترجمہ از قلم جناب یاسر جواد صاحب شائع کردہ فکشن ہاؤس 18 مزنگ روڈ لاہور۔ اشاعت 2003ء۔

17 پنجاب کی انقلابی تحریکیں صفحہ 69-70۔

18 "پنجاب کی سیاسی جدوجہد" 1857ء تا 1944ء صفحہ 62-63۔

19 اخبار شیر پنجاب لاہور 19 ستمبر 1926ء صفحہ 18۔ بحوالہ "ہندوراج کے منصوبے" صفحہ 207۔

20 تفصیل آگے آرہی ہے۔

21 یہاں صرف ایک اشاراتی خاکہ پیش کیا جارہا ہے مکمل اور مستند حوالے مفصل پس منظر میں موجود ہیں۔

22 امروز 14 جون 1974ء صفحہ 1۔

احراری مطالبہ اقلیت
کا
عالمی پس منظر

حرف اوّل

پیشتر اس کے کہ احراری مطالبہ اقلیت کے سیاسی اور مذہبی خدوخال اور اس کے عالمی پس منظر پر جدید تحقیقات پیش کی جائیں، یہ بتانا لازم ہے کہ جس طرح حضرت بانی سلسلہ احمدیہ، موعود شخصیّت اور آپ کی جماعتِ آخرین، ایک موعود جماعت ہے جس کا قیام منہاجِ نبوّت کے عین مطابق عمل میں آیا اور پھر سنت اللہ کے مطابق اُس نے تدریجی ترقی کی۔ اس طرح خدا کی اس مقدس جماعت کے خلاف اٹھنے والے یاجوج ماجوج اور دجّال کے فتنوں کی خبریں بھی کتاب اللہ، احادیث نبویؐ اور بائبل میں صدیوں قبل دی گئی تھیں جیسا کہ سلسلہ احمدیہ کے لٹریچر میں بالتفصیل بتایا جاچکا ہے۔ 1891ء میں حضرت اقدس مسیح موعود پر دعویٰ مسیحیت کے ساتھ جناب الٰہی کی طرف سے انکشاف کیا گیا کہ یاجوج ماجوج سے مراد انگریز اور روس کی دو اقبال مند قومیں ہیں جو آتشیں ہتھیاروں سے دنیا پر حکمرانی کر رہی ہیں اور گرجے سے نکلنے والا دجال پادریوں کا گروہ ہے جو انگریزوں کی پشت پناہی میں کرۂ ارض پر پھیل رہا ہے اور دنیا بھر کے مسلمان صلیبی طوفان میں بہتے چلے جارہے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور دجال کی بھی پیشگوئی فرمائی جو خراسان سے خروج کرے گا۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں بابیوں کا مرکز بدشت واقع ہے۔ اسی جگہ 1264ھ (مطابق 1848ء) میں بابیوں کا اجتماع ہوا جس میں ایک سوچی سمجھی سازش کے مطابق قرآنی شریعت کی منسوخی کا اعلان کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارض خراسان ہی کے متعلق فرمایا۔

"الدّجال یخرج من ارضٍ بالمشرق یُقالُ لَهَاخراسان یتّبعه' اقوام کانو وجوههمالمجآن المطرقه"[1]

یہ اہم حدیث صدیق اکبر حضرت امیر المومنین ابو بکر خلیفہ اول رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے کہ دجال مشرقی علاقہ خراسان سے نکلے گا۔ اس کی پیروی وہ قومیں کریں گی

جن کے چہرے ایسی ڈھالوں کی مانند ہونگے جن پر ہتھوڑے مارے گئے ہوں گے۔ 2

گرجاگھر سے برآمد ہونے والا دجال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کے وقت انگریزوں کی پشت پناہی میں پوری دنیاپر محیط ہو چکا تھا جس کے خلاف اسلام کے بطل جلیل اور فتح نصیب جرنیل نے ایسا عظیم الشان قلمی ولسانی جہاد کیا جس کی نظیر گزشتہ چودہ صدیوں میں نہیں مل سکتی۔

خراسانی دجال جو قدیم ایران کے پیغمبر اشتراکیت مزدک کے بنیادی نظریہ کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کی خاطر اٹھا، اگرچہ ابتداء ہی سے عملاً کارل مارکس کے نظریات کا پاسبان تھا مگر اسے عالمی شہرت اشتراکی روس کی بدولت نصیب ہوئی جس کا نشان ہی ہتھوڑا ہے۔ اور یہ واقعہ خلافت ثانیہ کے اوائل میں رونما ہوا جس کے بارہ سال بعد آل انڈیا نیشنل کانگرس کے سوشلسٹ بلاک کے لیڈر پنڈت جواہر لال کی سیاسی سازش اور جناب ابوالکلام آزاد کی نگرانی میں 31 دسمبر 1929ء کے اجلاس راوی کے دوران معرض وجود میں آئی۔ انڈیا ایکٹ کے نفاذ سے چندماہ قبل اُس نے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ "قادیانیوں" کو مسلمانان ہند سے الگ غیر مسلم اقلیت تسلیم کرے جس کا واحد مقصد برٹش انڈیا کی مسلم آبادی کو کم کر کے کانگرس کو ملک کی نمائندہ جماعت ثابت کرنا تھا۔احرار کی پچاس سالہ سرگرمیاں اسی مطالبہ کے گرد گھومتی رہیں جس کے بعد بالآخر 7 ستمبر 1974ء کو پاکستان کی سوشلسٹ حکومت نے سوشلسٹ علماء سے گٹھ جوڑ کر کے یہ مطالبہ قبول کر لیا۔

اس باب میں اسی احراری مطالبہ کے اسباب وعلل اور اُس کے پردہ میں کارفرما عناصر، شخصیات اور بعض عالمی طاقتوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور اُن کے طریقہ وار دات اور سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور اس کے ہر گوشہ اور ہر پہلو کا واقعاتی ثبوت مستند مآخذ ومصادر اور ناقابل تردید معلومات سے فراہم کیا گیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ترتیب قرآنی تاریخ کی مرہون منت ہے اور اوّل سے آخر تک اس سے راہنما اصول کے طور پر اکتساب فیض کیا گیا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے اس میں بیان شدہ تاریخی واقعات کو قرآن مجید اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت وحقانیت کا نشان قرار دیا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔

تاریخ کا رہنما اصول

دینی اور روحانی سلسلوں خصوصاً اسلام کے دور ثانی اور جمالی ظہور پر قلم اٹھانے والے وقائع نگاروں اور تاریخ نویسوں کے لئے سلطان القلم سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود ومہدی معہود علیہ السلام کا یہ رہنما اصول قیامت تک سنہری حروف میں لکھا جائے گا کہ

"اس عالم کا مورّخ اور واقعہ نگار بجز خدا کے کلام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔
جس کے مضامین صرف قیاسی اٹکلوں میں محدود نہیں بلکہ وہ عقلی دلائل کے علاوہ
بہ حیثیت ایک مورّخِ صادق، عالم ثانی کے واقعات صحیحہ کی خبر بھی دیتا ہے اور چشم
دید ماجرا بیان کرتا ہے۔"[3]

قرآن مجید زمانہ قبل از تاریخ اور بعد از تاریخ دونوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتا ہے:-

"ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيۡكَ مِنۡهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيۡدٌ"

(ھود۔101)

یہ اُن بستیوں کی خبروں میں سے (ایک خبر) ہے جس کا قصہ ہم تیرے سامنے بیان کرتے ہیں۔

کتاب اللہ نے علم تاریخ کو فلسفہ اور نفسیات کی روشنی میں دیکھنے اور پس پردہ کار فرما عوامل کو تلاش کرکے واقعات کی حقیقی کڑیوں کو ملانے کی ہدایت کی ہے چنانچہ وہ بار بار اَفَلا تَعۡقِلُوۡن (البقرہ۔77) کی تاکید فرماتا ہے اور اس امر کو فضل عظیم سے تعبیر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر کتاب کے ساتھ ہی حکمت بھی نازل کی ہے اور وہ علوم بھی سکھائے جن سے آپ ناآشنا تھے۔ اس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ہر چیز اور ہر واقعہ کی حکمت ہوا کرتی ہے جسے سیکھنے کی کوشش کرو۔ اس حکمت کا دوسرا نام فلسفہ ہے اور دوسرے علوم کی طرح علم تاریخ کے فلسفہ سے بھی قرآن بھرا ہوا ہے۔ مورخ اسلام علامہ ابن خلدون (ولادت1323ء۔ وفات1406ء) نے قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی اور تنقید اخباراور روایت کو درایت سے جانچنے کے بہترین اصول ایجاد کرکے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ علامہ کا "مقدمہ ابن خلدون" فلسفہ تاریخ کا مُسَلَّم شاہکار ہے جس نے مغربی محققین سے بھی خراج تحسین وصول کیا ہے۔ آپ سے قبل ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (متوفی922ء) نے بھی انہی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے جو بعد ازاں علامہ ابن خلدون نے قرآن کی روشنی میں وضع کرکے فلسفہ تاریخ میں انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ حضرت مصلح موعودؓ نے24 جنوری 1944ء کو اسلامی نقطہ نگاہ سے تاریخ نویسی پر بلیغ روشنی ڈالتے ہوئے بیان فرمایا:-

"ابن جریر نے ایسی طرز پر تاریخ لکھی ہے کہ وہ خود راہ نمائی کرتی ہے کہ ہم
کس کو لیں اور کس کو نہ لیں۔ ابن جریر ان تمام اصول کو جن کو ابن خلدون وغیرہ نے
بیان کیا، عمل میں لے آیا ہے۔ پس اسلام میں اختلافات کے صحیح اسباب کا مطالعہ
کرتے کرتے مجھے خدا تعالیٰ کے فضل سے ابن جریر ایک ایسا مورّخ مل گیا جس کا

طریق یہ ہے کہ زید یا بکر سے جو مختلف روایتیں آتی ہیں پہلے ان کے ٹکڑے بیان کردے گا پھر ایک اور مکمل روایت لکھے گا۔ اس طرح وہ ان مکمل روایات کی ایک مکمل زنجیر پیش کردے گا۔روایات کے ٹکڑے وہ بے شک دیتا چلا جائے گا لیکن وہ اس زنجیر میں ٹھیک نہیں آئیں گے۔وہ ہمارے سامنے واقعات کی ایسی زنجیر رکھ دے گا کہ جس سے تمام اعتراضات جو صحابہؓ پر پڑتے ہیں دور ہو جائیں گے اور جو صحیح ودرست روایت ہوگی وہی اس زنجیر میں ٹھیک آئے گی... ان اصول کے ماتحت میں نے دو لیکچر اسلامی تاریخ پر اسلامیہ کالج لاہور میں دیئے تھے جن میں سے ایک ''اسلام میں اختلافات کا آغاز'' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔''[4]

مشہور عالم تاریخ طبری کے مخصوص اسلوب اور منفرد انداز کے تتبع میں اب تک تاریخ احمدیت میں بھی احراری مطالبہ ٔ اقلیت (1934ء۔1974ء) کی چہل سالہ جارحانہ سرگرمیوں کا ذکر اپنے اپنے موقع پر ترتیب زمانی کے مطابق کیا جا چکا ہے۔ اب اس باب میں اس مطالبہ کے حقیقی عالمی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے گی جس سے ضمناً مطالبہ کے اصل ملکی خدّوخال بھی انشاالله نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے اور بتوفیقہٖ تعالیٰ نہ صرف دنیا بلکہ خدا کی مقدس جماعت کو پتہ چلے گا کہ تحریک احمدیت کے خلاف عالمی سطح پر کتنے خوفناک طوفان اٹھے مگر رب العرش نے اپنے وعدوں کے مطابق نظام خلافت کی برکت سے اُن کے رخ پلٹ دیئے اور احمدیت کی کشتی پوری شان وشوکت سے ساحل مراد تک پہنچی۔ اسی طرح پہلی بار احمدیت کی مخالف طاقتوں اور ان کے آلہ کار بہت سی مسلم اور غیر مسلم شخصیات کا اصل چہرہ ان کے سامنے آجائے گا اور اُن کے بہت سے سربستہ رازوں اور خفیہ واقعات سے پردہ اٹھ جائے گا۔

حواشی:

1 ترمذی۔ کتاب الفتن باب ماجاء من این یخرج الدجال۔

2 عربی میں ہتھوڑے کو مطرقہ کہتے ہیں (القاموس الجدید تالیف وحید الزمان قاسمی کیرانوی ناشر ''ادارہ اسلامیات'' لاہور اشاعت جون 1990ء)

3 براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ 289 طبع اول مطبع ریاض ہند امرتسر باہتمام محمد حسین صاحب مرادآبادی سال اشاعت 1884ء۔

4 ''الفضل'' 2 فروری 1944ء صفحہ 3۔

پہلی فصل

قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت مہر نیم روز کی طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ "ختم نبوت" کے نام پر پہلی تحریک اولوا لعزم پیغمبر خدا سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات (1817ق م)[1] کے معاً بعد اٹھی اور یہ کتاب اللہ کا ایک محیر العقول معجزہ ہے کہ جہاں بائبل اس اہم پہلو کے بارے میں پوری طرح خاموش ہے، وہاں اُس نے نہ صرف واضح لفظوں میں اس کا ذکر فرمایا ہے بلکہ مستقبل میں اسی نام سے فتنہ برپا کرنے والے گمراہوں کی بھی چودہ سو سال قبل پیشگوئی کی ہے جو ختم نبوت کی آڑ میں قرآنی آیات پیش کر کے مجادلہ کریں گے۔ ان کی سرگرمیاں خدا اور اس کے مومن بندوں کی ناراضگی کا موجب ہوں گی۔ اُن کی تحریک متکبرانہ اور اسکی عملی تشکیل جابرانہ ہو گی جیسا کہ 1974ء میں ہوا۔ چنانچہ اللہ جلشانہ سورہ مومن آیت 35-36 میں فرماتا ہے:

"وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ۔ اِلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ۔ (المومن 35،36)

"یقیناً تمہارے پاس اس سے پہلے یوسف بھی کھلے کھلے نشانات لے کر آچکا ہے۔ مگر تم اُس بارہ میں ہمیشہ شک میں رہے جو وہ تمہارے پاس لایا۔ یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم کہنے لگے کہ اب اس کے بعد اللہ ہرگز کوئی رسول معبوث نہیں کرے گا۔ اسی طرح اللہ حد سے بڑھنے والے اور شک میں مبتلا رہنے والے کو گمراہ ٹھہرائے گا۔[2] ان لوگوں کو جو آیات اللہ کے بارے میں بغیر کسی غالب دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، جھگڑا کریں گے جو اللہ کے نزدیک بھی بہت بڑا گناہ ہے اور مومنوں کے نزدیک بھی۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر اور سخت جابر کے دل پر مہر لگا دے گا۔"

سبحان اللہ! خاتم النبیین حضرت محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وعدے والے زندہ خدا نے چودہ سو سال قبل کیسا واضح نقشہ احرار کی نام نہاد تحریک ختم نبوت اور ان کے مطالبہ اقلیت کا کھینچ کر رکھ دیا ہے اور اُن کے مذہبی اور سیاسی حربوں کی نشان دہی فرما دی ہے کہ شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ اس سے بڑھ کر تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان آیات کے معاً بعد فرعون کی

تکذیب اور اس کی نامرادی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:-

''وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ۔ (المومن:37،38)

اور فرعون نے کہا، اے ہامان میرے لئے محل بنا تا کہ میں ان راستوں تک جا پہنچوں جو آسمان کے راستے ہیں تا کہ میں موسیٰ کے معبود کو جھانک کر دیکھوں۔ بلکہ در حقیقت میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں اور اسی طرح اس کے بد اعمال خوبصورت کر کے دکھائے گئے اور وہ راستے سے روک دیا گیا اور فرعون کی تدبیر اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ نامرادی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

خدا کی قدرت! مسیح دوراں، کلیم خدا، حضرت مہدی موعود علیہ السلام کو بھی الہام ہوا:

”واذ یمکر بک الذی کفر۔ اوقدلی یا ھامان لعلی اطلع علٰی الٰہ موسٰی وانی لاَظنہ من الکاذبین تبت یدا ابی لھب وتب ما کان لہ ان ید خل فیھا الاخائفا وما اصابک فمن اللہ الفتنۃ ھٰھنا فاصبر کما صبر اولو العزم الااِنّھا فتنۃ من اللہ لیحب حباً جما۔ حبا من اللہ العزیز الاکرم“

اور یاد کر وہ وقت جب تجھ سے وہ شخص مکر کرنے لگا جس نے تکفیر کی اور تجھے کافر ٹھہرایا اور کہا کہ اے ہامان! میرے لئے آگ بھڑکا تا میں موسیٰ کے خدا پر اطلاع پاؤں اور میں اُس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ ہلاک ہوئے دونوں ہاتھ ابی لہب۔ کے وہ آپ بھی ہلاک ہو گیا۔ اس کو نہیں چاہیے تھا کہ اس معاملہ میں دخل دیتا مگر ڈرتے ڈرتے اور جو کچھ تجھے رنج پہنچے گا وہ تو خدا کی طرف سے ہے۔ اس جگہ ایک فتنہ برپا ہو گا پس صبر کر جیسا کہ اولوالعزم نبیوں نے صبر کیا۔ وہ فتنہ خدا کی طرف سے ہو گا تا وہ تجھ سے محبت کرے۔ وہ اس خدا کی محبت ہے جو بہت غالب اور بزرگ ہے۔“[3]

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود (جن کے زمانہ خلافت میں 1934ء اور 1953ء کی احراری شورش اٹھی) قرآن مجید خصوصاً سورۃ الفجر کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ جماعت احمدیہ کو بھی اس صدی میں کسی فرعون کی طرف سے خطرناک مظالم کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چنانچہ آپ نے کم و بیش اٹھائیس برس پیشتر یہ خبر دی کہ:-

"جب جماعت احمدیہ کسی فرعون کے مظالم کی وجہ سے سخت گھبرا اُٹھے گی۔
اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام جماعت احمدیہ کو روحانی طور پر اُس کے خلیفہ
اور امام کی زبان سے کیونکہ وہ دو نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہوں گے جبکہ وہ غم و ہم کے
تمثیلی سمندر کے کنارے پر کھڑا ہوگا یا ممکن ہے کہ مصر یا کسی اور ملک میں ایسے ہی
حالات پیدا ہونے پر اور واقعہ میں دریائے نیل کے کنارے پر یا اور کسی دریا کے
کنارے پر بڑے جاہ و جلال کے ساتھ فرمائیں گے کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ۔ کلاّ
کے معنی یہی ہیں کہ لَاتَحْزَنْ غم مت کرو۔ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ میرے
ساتھ میرا رب ہے... اور وہ اس نیل میں سے ہمیں نکال کر لے جائے گا۔"[4]

مسٹر بھٹو اپنے عہد اقتدار میں فرعونِ پاکستان اور قاتلِ عوام کے نام سے مشہور ہو گئے تھے بلکہ لاہور کے روزنامہ آفاق 30 اگست 1977ء کے اداریہ کا عنوان ہی یہ تھا "پاکستان کا فرعون" اسی طرح بہاولپور کے روزنامہ سیادت (4 ستمبر 1977ء) میں اُن کی گرفتاری پر یہ سرخی تھی "قاتلِ عوام مسٹر بھٹو گرفتار"۔

مسٹر بھٹو نے ابتداء ہی سے اپنی نئی پارٹی کے منشور میں ریاست کے نظام معیشت کا سرچشمہ سوشلزم ہی کو قرار دے رکھا تھا جس پر پاکستان کے مذہبی رہنماؤں نے بھی سخت نوٹس لیا اور اُن پر کفر کے فتوے لگائے۔ انہوں نے 16 ستمبر 1967ء کو ایک نئی پارٹی کے قیام کا اعلان میر رسول بخش تالپور کی رہائش گاہ پر ایک پریس کانفرنس میں کیا۔[5] اسی دن انہوں نے حیدرآباد کے مقامی ہوٹل میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ اُن کی پیپلز پارٹی نوجوان نسل پر مشتمل ہوگی۔ یکم اکتوبر کو بھٹو صاحب نے طلبہ کوئٹہ کو بتایا کہ ان کی پارٹی عوامی ہوگی اس کی بنیاد سوشلزم پر رکھی جائے گی۔[6]

ازاں بعد بھٹو نے 20 اکتوبر 1967ء کو مشرقی پاکستان کا دورہ شروع کیا اور اسی روز انہوں نے ڈھاکہ کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں پہلی کانفرنس منعقد کی جس میں یہ بھی اعلان کیا کہ اُن کی پارٹی جس سوشلزم پر مبنی ہوگی۔ وہ پاکستانی عوام کی ضرورتوں کی کفالت کا ضامن بن سکے گا۔"[7]

اس امر کی مزید وضاحت انہوں نے کراچی پہنچ کر اپنی قیام گاہ پر ایک پریس کانفرنس میں یہ کی کہ ہم جو سوشلزم یہاں قائم کریں گے وہ پاکستان کے حالات کے عین مطابق ہوگا۔ یورپ کے چند ملکوں میں جن میں ناروے اور سویڈن شامل ہیں، جس طرح پُر امن طریقے سے سوشلزم رائج کیا گیا ہے اس طرح ہم بھی پرامن ذرائع اختیار کریں گے۔[8]

5نومبر 1967ء کو انہوں نے پشاور کے ایک مقامی ہوٹل کی دعوت استقبالیہ میں بتایا۔

''اسلام اور سوشلزم میں انسان کی معاشی زندگی سے متعلق قدریں مشترک ہیں۔
اگر ہم انہیں اپنالیں تو ہماری بہت سی تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔"[9]

ان ملک گیر طوفانی دوروں کے بعد بھٹو صاحب نے 7نومبر 1967ء کو لاہور میں پیپلز پارٹی کا باقاعدہ اعلان کیا اور اپنے باطنی عقیدہ کے راز کو ایک بار پھر فاش کرتے ہوئے واضح کیا کہ

''میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام اور سوشلزم کے معاشی نظام میں زیادہ فرق نہیں ہے۔[10]

ازاں بعد انہوں نے قصور کے ایک عوامی عظیم اجتماع میں پہلی بار یہ نعرہ بلند کیا کہ ''**پیپلز پارٹی بیک وقت اسلام، جمہوریت اور سوشلزم کی مبلغ اور علمبردار ہوگی۔**"[11]اسی نعرہ کے مطابق منشور پاکستان پیپلز پارٹی کے اختتامیہ میں اس پارٹی کے حسب ذیل چار بنیادی اصول درج ہیں جو اسکی اساس تھے۔یعنی

''اسلام ہمارا دین ہے۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔"[12]

منشور میں اسلام کے برعکس خالق کائنات کی بجائے عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار ادینے سے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا کہ بھٹو اور ان کی سوشلسٹ پارٹی کا خدا تعالیٰ پر ہرگز کوئی ایمان نہیں اور ان کی پوری سیاست عوامی خواہشات کے تابع ہو گی اور جمہوریت کے پردہ میں عوامی اکثریت ہی کو ترجیح دے گی خواہ وہ قرآن مجید کے کس درجہ منافی ہو۔ حالانکہ قرآن کا واضح نظریہ ہے:

''وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ''

(الانعام۔117)

اگر تو زمین میں اکثریت کی اطاعت کرے گا تو وہ تمہیں اللہ سے گمراہ کر دیں گے۔

پھر فرمایا:

قَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ۔(سبا۔14)

میرے شکور بندے قلیل یعنی اقلیت میں ہوتے ہیں۔

یہ محض اتفاق کا کرشمہ نہیں ہے کہ جماعت احمدیہ کے خلاف احراری مطالبہ کی پذیرائی جس فرعون وقت نے کی وہ پکا کمیونسٹ اور سوشلسٹ تھا، بلکہ اس کے بعد واقعات وعلل کا ایک لمبا سلسلہ

کار فرما ہے جو چودہ صدیوں پر محیط ہے اور اپنے دامن میں مزدکیہ (قدیم اشتراکی مذہب) بابیت (مزدکیہ کا ماڈرن روپ) اور مارکسزم کو سمیٹے ہوئے ہے اور جسے بالشویکی روس کے عالمی منصوبوں نے پروان چڑھایا ہے۔

پاکستان کے ایک اہل قلم جناب محمد اسماعیل قریشی صاحب فتنہ سوشلزم کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "سوشلزم فتنہ نہایت برق رفتاری کے ساتھ اٹھا اور اٹھارھویں صدی کی لائی ہوئی ظلم پر مبنی سرمایہ دارانہ معیشت کی تباہ کاریوں کے خلاف عالمی انقلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔ کارل مارکس اور اینجلز کے افکار اور لینن واسٹالن کے عملی اقدام سے یہ سیل بے پناہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتا جارہا تھا۔ سب سے پہلے وہ دین و مذہب کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کے درپے تھا، کیونکہ پیروان مذہب اس نوزائیدہ اشتراکی مذہب کی راہ میں حائل تھے۔ روس کی ملحقہ مسلم ریاستوں کو زیروزبر کرنے کے بعد سوشلزم کا یہ سیلاب ہندوستان کے اندرداخل ہوگیا۔ اگرچہ اس وقت برطانوی سامراج نے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، زبان وثقافت اور اقدارحیات کو بڑی حدتک اپنے کلچر میں تحلیل کرکے اپنی استعماری گرفت کو مضبوط کرلیا تھا لیکن اشتراکیت کے مقابلے میں اس کی گرفت کمزور ہوتی جارہی تھی۔ یہ فتنہ مسلمانوں پر 1857ء کے ابتلاء سے بڑھ کر تباہ کن اور ہلاکت خیز تھا۔"[13]

اور احراراور اُن کا مطالبہ اقلیت اسی فتنہ کی کوکھ سے پیدا ہوا جیسا کہ آئندہ صفحات سے بالبداہت ثابت ہوجائے گا۔

قدیم اشتراکیت کی ارتقائی تاریخ

تاریخ عالم سے پتہ چلتاہے کہ اشتراکیت اور سوشلسٹ نظام کا تصور پہلی بار افلاطون (327–427ق م) نے اپنی کتاب "Plato Republic ریاست" میں پیش کیا جو صرف حکومت اور سپاہیوں تک محدود تھا کہ وہ سب ایک جگہ ایک سا کھانا کھائیں اور ایک سا کپڑا پہنیں۔ افلاطون نے اشتراک املاک کے ساتھ ساتھ اشتراک ازواج کی بھی حمایت کی اور کہا کہ حکمرانوں کا کام ہے کہ مقررہ اوقات پر تندرست نوجوان مرد عورتوں کو یکجا کردیں اور ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہو، اسے اس کا علم ہی نہ ہو کہ اس کے والدین کون ہیں۔ بچوں کو پیدا ہوتے ہی ریاست ماؤں سے لیکر اپنے آغوش میں پرورش

دے تاکہ ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کو من حیث الکل اپنے ماں باپ سمجھے۔ اس کی خواہش تھی کہ شخصی خاندانوں کو مٹاکر ریاست کے دواعلیٰ طبقوں (حکمران۔ فوج) کو بس ایک خاندان بنادے۔[14]

افلاطون کی کتاب کا نام Plato Republic ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے قلم سے "ریاست" کی شکل میں پہلی بار قیام پاکستان سے برسوں قبل شائع ہوا تھا۔ افلاطون کو اقبال کی قدیم ممدوح شخصیات میں سرفہرست سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ افلاطون اور قرآن کی تعلیم میں ہم آہنگی کا فلسفہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قرآن، مذہب، ریاست، اخلاقیات اور سیاسیات میں اُسی طرح ایک باہمی ربط بہت ضروری خیال کرتا ہے جس طرح **افلاطون نے اپنی تصنیف " ریاست "** میں بیان کیا ہے۔[15]" [16]

سر اقبال کا یہ مقالہ 1908ء میں لوزاک اینڈ کمپنی 46 گریٹ رسل اسٹریٹ لنڈن سے زیرِ عنوان The Development of Metaphysics in Persia شائع ہوا۔ جناب تصدق حسین تاج (حیدرآباد دکن) نے 1936ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ فلسفہ عجم کے نام سے شائع کیا۔

پیغمبر اشتراکیت

ظہور اسلام سے ذرا قبل ایرانی فلسفی مزدک نے (487-538ء) دعویٰ پیغمبری کرکے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جس کی روح رواں افلاطون ہی کا فلسفہ اشتراکیت تھا۔

سر اقبال نے اپنے مقالہ The Development of Metaphysics in Persia میں مزدک کو اشتراکیت کا پہلا پیغمبر تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے اس کی نگاہ میں تمام انسان مساوی ہیں اور انفرادی جائیداد کا تصور مخالف دیوتاؤں کا پیش کردہ ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی کائنات کو لامحدود تباہی کا منظر بنادیں۔[17]

حضرت علامہ ابن حزم اندلسی (وفات 1063ء) فرقہ مزدکیہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مجوس روشنی، آگ اور پانی کی تعظیم کرتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ زردشت کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں اور اپنی شریعت کو زردشت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان میں ایک فرقہ مزدکیہ ہے یہ لوگ مزدک کے متبع ہیں جو مجوسیوں میں ایک مذہبی پیشوا گزرے ہیں۔ ایسے پیشواؤں کو ان کی اصطلاح میں موبد کہتے ہیں۔"

پیروان فرقہ مزدکیہ کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر شخص جو کمائے، اکتساب کرے۔ اس میں سب کا حق

برابر برابر ہے، یہ لوگ عورتوں میں بھی مساوات کے قائل ہیں کہ ہوا اور پانی کی طرح عورتیں بھی ''ملکِ مشاع'' ہیں۔ ہر ایک مرد اُن سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

بابک خرمی (جو خلیفہ معتصم باللہ العباسی کے ہاتھوں قتل ہوا) مزدک ہی کا ہم عقیدہ تھا۔ اس کے پیرو (جو اسلام کو مٹا کے ایرانی مجوسی قائم کرنا چاہتے تھے) اسی مساوات واشتراکیت کا عقیدہ رکھتے تھے۔ خرمیہ بھی فرقہ مزدکیہ کی ایک شاخ ہے۔ فرقہ اسماعیلیہ جو اسماعیل بن جعفر صادق کی امامت کا قائل ہے، ان کے مذہب کا راز بھی فرقہ خرمیہ ہی کی تعلیم ہے اور وہیں سے انہوں نے اپنے اصول اخذ کئے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو قرامطہ اور بنی عبید اور اُن کے عنصر کے قول پر ہیں۔''[18]

پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی اپنی معرکہ آرا تالیف ''تاریخ ایران'' جلد اوّل میں مزدک اور مُزدکیوں کے عقائد واحوال کی نسبت تحریر فرماتے ہیں۔

''مزدک کی شخصیت کے متعلق قدیمی تاریخوں میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس بات پر تو سب متفق ہیں کہ وہ بامداد کا بیٹا تھا۔ لیکن وہ رہنے ولا کہاں کا تھا؟ اس کے متعلق مورخین کی آرا مختلف ہیں۔ طبری لکھتے ہیں کہ وہ صوبہ خراسان کے شہر کا رہنے والا تھا۔ دینوری اسے استخر کا باشندہ لکھتے ہیں۔ تبصرۃ العوم میں لکھا ہے کہ وہ تبریز کا رہنے والا تھا۔ بہر حال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ایرانی الاصل تھا۔''

مزدکیوں کا اہم ترین عقیدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے روئے زمین پر زندگی کے وسائل پیدا کیے تاکہ سب یکساں طور پر ان سے متمتع ہوں اور کسی کو دوسرے کی نسبت زیادہ حصہ نہ ملے۔ لیکن لوگ دوسرے پر ظلم روا رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالفت پر تل جاتے ہیں۔ طاقتور کم زوروں پر غلبہ پاکر اناج اور زرومال کو اپنے لیے مخصوص کر لیتے ہیں۔ پس ضروری ہے کہ امراء سے دولت لے کر غرباء میں تقسیم کی جائے۔ ''مال ودولت کو اس طرح مشترک بنانا چاہیے جس طرح کہ پانی، آگ اور چراہ گاہیں ہیں۔ خدا نے مخلوقات کے لئے مساوات کی بنیاد قائم کی ہے، اس کے نزدیک سب برابر ہیں۔ نہ کسی کو اس کے حق سے زیادہ ملتا ہے نہ کم۔ ہر چیز سب کے لئے مشترک ہے، یہاں تک کہ ازواج بھی۔'' مزدک کی یہ تحریک شروع شروع میں مذہبی تھی لیکن بعد میں اس نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ مزدک نے قباد سے ملاقات کی اور اپنی مؤثر گفتگو سے اسے گرویدہ بنا لیا۔ چنانچہ اس نے مزدک کے عقاید اختیار کر لیے۔ اور اس تحریک کو نہ صرف تقویت حاصل ہو گئی بلکہ اس نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ لوگ دلیر ہو گئے۔ اشتراکیت کا پرچار ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر

جگہ کسانوں نے بغاوتیں برپا کیں۔ لوٹ مار کرنے والے امراء کے محلوں میں گھس جاتے اور مال واسباب لوٹ لیتے تھے، عورتوں کو پکڑ کرلے جاتے تھے اور جاگیروں پر قبضہ کر لیتے تھے۔ زمینیں رفتہ رفتہ غیر آباد ہونے لگیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ابتری کس حد تک پھیل چکی تھی۔

قباد نے شروع میں مزدکیوں کو اپنی حمایت میں اس لیے لیا تھا کہ اس طرح وہ اُمرا کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتا تھا لیکن اب صورت حال بے قابو ہوتی دیکھی تو مزدکیوں سے بیزار ہو گیا۔ آخر جب مزدکیوں نے یہ کوشش کی کہ نوشیر واں کے بڑے بھائی کاؤس کو شاہ قباد کا جانشین مقرر کیا جائے جو مزدکیوں کا پُرجوش حامی تھا تو قباد کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

قباد نے مزدکیوں کو نیچا دکھانے کے لیے ایک مذہبی کانفرنس منعقد کی جس میں مزدکیوں کے سرکردہ رہنماؤں کو مناظرے کی دعوت دی گئی۔ قباد نے اس میں خاصی دلچسپی لی۔ نوشیر واں اب ولی عہد سلطنت مقرر ہو چکا تھا۔ اس کے لیے مزدکیوں کا گروہ سب سے بڑے خطرے کا باعث تھا۔ اس لیے اس نے اس کانفرنس میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مزدکی مناظرے میں شکست کھائیں۔ مزدکی پیشواؤں سے زرتشتی عالموں نے مذاکرہ کیا جس میں مزدکیوں کو شکست ہوئی۔ شکست کا اعلان ہونا تھا کہ سپاہی مزدکیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مزدکی پیشوا سب کے سب مارے گئے۔ ان میں خود مزدک بھی تھا۔ ان سب کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور مزدکی خطرے کا خاتمہ ہو گیا۔ مزدکیت اگر باقی رہی بھی تو اس کی حیثیت خفیہ مذہب کی سی ہو کر رہ گئی۔[19]

مزدکیہ فرقہ شیعہ

تیسری صدی ہجری کے شیعہ مولّف ابو محمد الحسن موسی البغدادی نے اپنی کتاب "فرق الشیعہ" میں انکشاف کیا کہ شیعوں میں نہ صرف ایسے غالی فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی دونوں کو خدا سمجھتے ہیں بلکہ **مزدکیہ فرقہ** بھی موجود ہے۔[20] "علامہ السید محمد صادق آل بحر العلوم" نے اس مقام پر کتاب کے حاشیہ میں واضح کیا ہے کہ مزدکیہ مزدک کے پیروکار تھے جو نوشیر واں کے والد قباد کے زمانہ میں ظاہر ہوا۔ مزدک کا دعویٰ تھا کہ اس پر ویستا و کتاب نازل ہوئی۔ مزدکی محرمات کو جائز سمجھتے تھے اور اشتراکی مذہب رکھتے تھے یعنی اُن کا نظریہ تھا کہ تمام مرد وزن اموال میں برابر کے شریک ہیں۔

مزدکیہ کا احیاء بابیت کی شکل میں

تحریک بابیت اسی شیعہ فرقہ مزدکیہ کے احیاء کا نام ہے جو اسی کے خمیر سے کارل مارکس کے فلسفہ سوشلزم کی تائید کے لئے ایران میں اس وقت اٹھی جبکہ اس سرزمین میں تمام آئمہ اہلبیت کی خدائی اور موجودہ قرآن مجید کے جعلی ہونے کے عقائد مدتوں کے پراپیگنڈا کے نتیجہ میں عوامی حلقوں میں راسخ ہو چکے تھے اور دشمنان اسلام کا یہ باطل خیال شیعوں کا جزوایمان بن چکا تھا کہ اصل قرآن کو بکری کھا گئی ہے۔[21]

مزدکیوں کی طرح بابیت نے بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز دہشت گردی اور بغاوت ہی کی سکیم سے کیا۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور میں زیر لفظ بابیت لکھا ہے:-

"باب کے دعوے کے ساتھ ہی بابیوں نے مسلح اقدامات شروع کر دیئے۔ باب کے دعویٰ پر ابھی آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ بعض بابیوں نے شاہ ایران پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ صاحب ناسخ التواریخ نے صاف صاف لکھا ہے کہ ایران میں سیاسی انقلاب لانے کے لئے کوفے سے مسلح بغاوت کی سکیم باب نے تیار کی تھی اور میرزا جانی کاشانی (جو بابی مذہب کا سب سے پہلا مؤید مورخ ہے) کے الفاظ بھی خاصی حد تک اس کی تائید کرتے ہیں (نقطۃ الکاف صفحہ 111) پھر بابیوں کی بہت سی سرگرمیاں مخفی بھی تھیں۔ اس حقیقت کو غیر جانبدار مصنّف براؤن اور جانب دار میرزا جانی کاشانی دونوں نے تسلیم کیا ہے (مقالہ سیاح انگریزی ترجمہ تعلیقات از براؤن صفحہ 80-409)۔ بابی تاریخ کے آغاز سے پہلے ملک میں جو سیاسی خلفشار تھا اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور فرقہ باطنیہ اور حسن بن صباح کی آزمائشیں لوگوں کے سامنے تھیں۔ 1840ء میں سبعہ شیعہ ایک بغاوت کر چکے تھے اور اس سے صرف چار سال بعد بابی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔(The Babi Movement-P.89)

حکومت ایران میں سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ قدیم مزدکیوں کی طرح ایک نئی کتاب کے نزول کا دعویٰ کر کے شیعہ عوام کی مذہبی ہمدردیاں حاصل کی جائیں اس لئے بابیوں نے بھی یہ سیاسی حربہ استعمال کیا۔ یہی نہیں بابیوں کے بانی رکن بہاء اللہ نے اپنی کتاب اقتدار میں یہ اقرار کر کے اس سیاسی چال کے چہرے سے نقاب سرکا دیا ہے جو عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔ لکھتے ہیں "اگر اعتراض واعراض اہل فرقاں نبود ہر آئینہ شریعت فرقاں دریں ظہور نسخ نمے شد۔"[22] یعنی اگر شیعہ علماء اور قاچار حکومت اعراض واعتراض نہ کرتی تو اسلامی شریعت کی منسوخی کی

نوبت ہی نہ آتی۔ دوسرے لفظوں میں اگر اُن کے سوشلسٹ مزدکیہ خیالات کے سامنے عوام وخاص ہتھیار ڈال دیتے تو بدشت کانفرنس (منعقدہ 1848ء) میں نسخ قرآن کی انتقامی کارروائی اور یہ مذہبی ہتھکنڈا استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی ؏

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

بدشت کانفرنس میں بانی رہنما قرۃ العین طاہرہ نے باب کی خود ساختہ شریعت کا اعلان کیا اور اس کے معاً بعد نظریہ سوشلزم کی پُرجوش تائید کی نیز بتایا کہ مرنے کے بعد تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھو جو کچھ کرنا ہے ابھی کرلو۔ اُس نے کہا۔

"اسمعوا ایھاالاحباب والاغیار: ھاتان الکلمتان فی عرف البابیۃ کنایۃ عن المؤمن والکافر بدینھم: واعلمواان احکام الشریعۃ المحمدیۃ قد نسخت الآن بظھور الباب،وان احکام الشریعۃ الجدیدۃ البابیۃ لم تصل الینا،وان اشتغالکم الآن بالصوم والصلوۃ والزکوۃ وسائر ماأتی بہ محمد کلہ عمل لغو وفعل باطل، ولا یعمل بھابعد الآن الاکل غافل وجاھل،ان مولانا الباب سیفتح البلاد، ویسخر العباد وستخضع لہ الاقالیم السبع المسکونۃ،وسیوحد الادیان المجودۃ علی وجہ البسیطۃ،حتی لا یبقی الادین واحد وذالک الدین الحق ھو دینہ الجدید،وشرعہ الحدیث، الذی لم یصل الینا الی الآن منہ الانزریسیر:فبناء علی ذالک أقول لکم وقولی ھو الحق،لاأمر الیوم ولاتکلیف،ولا نھی ولاتعنیف،وانانحن الآن فی زمن الفترۃ،فاخرجوا من الواحدۃ الی الکثرۃ،ومزقواھذا الحجاب الحاجز بینکم وبین نسائکم بأن تشارکوھن بالاعمال،وتقاسموھن بالافعال،واصلوھن بعد السلوۃ،وأخرجوھن من الخلوۃ الی الجلوۃ،فماھن الازھرۃ الحیاۃ الدنیا،وان الزھرۃ لا بدمن قطفھاوشمھا، لانھا خلقت للضم وللشم۔ولا ینبغیی ان یعد أویحدشاموھا بالکیف والکم،فالزھرۃ تجنی وتقطف، والاحباب تھدی وتتحف،وامادخار

المال عند أحد كم وحرمان غير كم من التمتع به والا ستعمال، فهو أصل كل وزر واساس كل وبال،لانه لم يخلق لنفس واحدة تتلذذبه من حيثيتحسر المحروم،بل هوحق مشاع غير مقسوم،جعل للاشتراک بين الناس، وللتداول من دون احتكار ولا اختصاص، فليشارک بعضكم بعضابالاموال،ليرفع عنكم الفقر ويزول الوبال،ساووا افقير كم بغنيكم، ولاتحجبوا حلائلكم عن أحبابكم،اذلاردع الآن ولاحد، ولامنع ولاتكليف ولا صد،فخذوا حظكم من هذه الحياة، فلاشييء بعد الممات،انتهى۔"[23]

(مفتاح باب الابواب محمد المہدی الحکیم محمد المتقی صفحہ 180-181 مطبوعہ ایران)

ترجمہ:

"سنو اے پیارو اور غیرو (یہ دو لفظ بابی اصطلاح میں کنایۃً ان کے دین کے ماننے والوں اور منکروں کے لئے استعمال ہوتے ہیں) تم جان لو کہ اب ظہورِ باب کے ذریعہ شریعتِ محمدیہ کے احکام منسوخ ہوچکے ہیں اور نئی شریعت بابیہ کے احکام ہم تک نہیں پہنچے۔ اب روزہ، نماز، زکوۃ اور دیگر احکام جو محمد نے دیئے تھے ان کی بجاآوری ایک لغو اور بے کار کام ہے۔ اِس وقت کے بعد ان احکام (شریعت محمدیہ کے احکام) پر غافل اور جاہل شخص کے سوا کوئی عمل نہ کرے گا۔ ہمارا آقا باب عنقریب شہروں کو فتح کرلے گا اور لوگوں کو مسخر کرلے گا اور ساتوں آباد براعظم اس کے آگے سر تسلیم خم کردیں گے۔ وہ (باب) اس وقت موجود تمام ادیان کو وسیع تر صورت میں ایک کردے گا۔ یہاں تک کہ صرف ایک ہی دین باقی رہ جائے گا اور یہی سچا دین ہے جو کہ اس (باب) کا وہ نیا دین اور اسکی وہ جدید شریعت ہے جس میں سے صرف بالکل معمولی سا حصہ ہی ہم تک پہنچا ہے۔ پس اس پر بَنا کرتے ہوئے میں تم سے کہتی ہوں اور میری بات حق ہے۔ کہ آج کوئی شرع حکم باقی نہیں۔ اس وقت فترت (دووحیوں یا دوشریعتوں کا درمیانی وقفہ) کے دور میں ہیں۔ پس تم وحدت سے کثرت کی طرف چلو اور یہ جو تمہارے اور تمہاری عورتوں کے درمیان پردہ ہے اسے پھاڑ دو، اس طرح کہ انہیں بھی کاموں میں شریک کرو۔ ان میں بھی کام تقسیم کرو۔ اور تفریح اور استفادہ کے بعد اُن سے تعلق قائم رکھو اور انہیں خلوت سے نکال کر لوگوں کے سامنے لاؤ۔ کیونکہ وہ تو دنیاوی زندگی کی خوبصورتی ہیں اور لازمی ہے کہ خوبصورت پھول کو (پودے سے) توڑا اور سونگھا جائے۔ یہ عورتیں تو ساتھ لگانے اور سونگھنے کے لئے

ہیں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد کو کم و کیف کے لحاظ سے محدود رکھنا درست نہیں اور پھول چُنا اور توڑا جاتا ہے اور احباب یعنی مذہب باب کے پیروکاروں کو ہدیہ اور تحفہ میں دیا جاتا ہے۔ اور جہاں تک تم سے کسی کا مال اپنے پاس ذخیرہ کر رکھنے اور دوسروں کو اسے استعمال کرنے اور فائدہ اٹھانے سے روکنے کا تعلق ہے تو یہ ہر مصیبت اور وبال کی جڑ ہے۔ کیونکہ مال صرف کسی ایک فرد کے لئے نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ اکیلا اس سے مزہ اڑاتا رہے جبکہ محروم حسرت کرتا رہے۔ بلکہ یہ مال عام حق ہے جو صرف کسی ایک سے مختص نہیں اور سب لوگوں کی برابر شراکت کے لئے بنایا گیا ہے۔ ذخیرہ اندوزی کرنے اور صرف اپنے لئے رکھ لینے کی بجائے لوگوں میں گردش دینے کے لئے ہے۔ پس تم ایک ودسرے کو مالوں میں شریک کرو تاکہ تم سے غربت اور تکلیف جاتی رہے۔ اپنے غریب کو اپنے امیر کے برابر بنادو۔ تم اپنی بیویوں کو اپنے احباب (باب کے پیروکاروں) سے پردہ میں نہ رکھو کیونکہ اب کوئی روک ٹوک نہیں، نہ کوئی ممانعت ہے نہ کوئی شرعی حکم ہے۔ پس تم اس زندگی سے اپنا حصہ لے لو کیونکہ موت کے بعد کچھ نہیں۔

قرۃ العین نے اس اعلان کے بعد ناصر الدین قاچار شاہ ایران کے دربار میں باب جیسے بدترین دشمن اسلام اور ناسخ شریعت قرآن کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں نبیوں کے سردار خاتم النبیین رحمۃٌ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان اقدس میں ایسی دریدہ دہنی، بدزبانی اور گستاخی کی جس کا تصور بھی ایک عاشق رسولؐ کے قلب ورُوح کو تڑپا دیتا ہے۔ اس نے کہا۔

دوہزار احمد مجتبیٰ زبروقِ آں شہہ اصطفاء
شدہ مختفی شدہ درخفا متدثراً متزملاً

ترجمہ: یعنی شہہ اصطفاء باب کی چمک دمک سے دوہزار احمد مجتبیٰ بالاپوش اوڑھے جھرمٹ مارے ہوئے پوشیدہ ہوگئے۔ 24

اقبال اور قرۃ العین

سر اقبال نے "جاوید نامہ" میں بابی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا ہے۔

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں کائناتِ تازۂ آید بروں!
شوقِ بے حد پردہ ہا را بردرد کہنگی را از تماشامی برد!

آخر از دارورسن گیرد نصیب　　　برنگردد زندہ از کوئے حبیب!

جلوۂ او بنگر اندر شہر ودشت　　　تانہ پنداری کہ از عالم گزشت!

درضمیر عصر خود پوشیدہ است

اندریں خلوت چساں گنجیدہ است؟[25]

ترجمہ: ایک صاحب جنون بندے (طاہرہ) کے قیام سے نئی کائنات ظہور میں آرہی ہے۔ غیر محدود عشق حجابات کو چاک کر دیتا ہے۔ کہنگی وقدامت کو منظر سے ہٹا دیتا ہے۔ آخرکار اسے دارورسن نصیب ہو جاتے ہیں اور وہ کوچہ محبوب سے زندہ نہیں لوٹتا۔ آج اس (طاہرہ) کا جلوہ شہر اور دیہات میں دیکھ لو۔ یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ وہ اس دنیا سے گزر گئی۔ وہ تو اپنے عصر کے ضمیر میں چُھپی ہوئی ہے۔ دیکھ لیجئے کہ اس خلوت میں کس طرح سمائی ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں "جاوید نامہ" میں ہی قرۃالعین کو "خاتون عجم" کا خطاب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پیش خود دیدم سہ روح پاکباز　　　آتش اندر سینہ شاں گیتی گداز!

دربر شاں حلّہ ہائے لالہ گوں　　　چہرہ ہا رخشندہ ازسوز دروں !

در تب تابے زہنگام الست　　　ازشراب نغمہ ہائے خویش مست!

گفت رومی این قدرانہ ازخود مرو　　　از دم آتش نوایاں زندہ شو!

شوق بے پروا ندیدستی نگر!　　　زور ایں صہبا ندیدستی نگر!

غالب و حلاج و خاتون عجم　　　شورہا افگندہ درجان حرم!

ایں نواہا روح را بخشد ثبات

گرمی او از دروں کائنات!

میں نے اپنے سامنے تین پاکباز روحوں کو دیکھا جن کے سینے میں دنیا کو جلا دینے والی آتش عشق تھی۔ انہوں نے سرخ کپڑے پہن رکھے تھے۔ان کا چہرہ دل کی گرمی سے چمک رہا تھا۔ یہ ارواح روزالست سے ہی تب وتاب میں تھیں اور اپنے ہی نغمات کی شراب میں مست تھیں۔ رومی نے مجھ سے کہا اس قدر مت کھو جاؤ۔ آتش نواؤں کے نفس سے زندہ ہو جاؤ۔ اگر بے نیاز عشق نہیں دیکھا تو یہ

دیکھو۔ شراب عشق کی طاقت نہیں دیکھی تو ان کو دیکھ لو۔ غالب، منصور اور خاتون عجم (قرۃ العین طاہرہ) نے حرم کی جان میں ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ یہ نغمات روح کو ثبات عطا کرتے ہیں۔ ان کی گرمی کائنات کے اندر سے ہے۔

اقبال کسی اور اسلام کا بانی

اقبال نے "بانگ درا" میں خود تسلیم کیا ہے کہ سیالکوٹ میں اُن کی ہمسائیگی میں رہنے والے ایک بزرگ نے اُن کے مذہبی خدوخال کا قریبی جائزہ لیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کا آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی شریعت پر قطعاً ایمان نہیں بلکہ وہ "کسی اور اسلام کے بانی" ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادت میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اُسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی[26]

اقبال کے ایک پرستار شورش کاشمیری صاحب نے سر اقبال صاحب کی زندگی کا ایک چونکا دینے والا واقعہ اپنی کتاب "نور تن" صفحہ 52-53 (مطبوعہ 1967ء) میں لکھا ہے جسے بھارتی صحافت نے بعد ازاں بڑے طمطراق سے شائع کیا۔ شورش صاحب عبدالمجید سالک صاحب مدیر "انقلاب" و مولف "ذکر اقبال" کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ایک واقعہ سنایا کہ مولانا گرامی لاہور تشریف لائے تو مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے۔ علامہ ان دنوں بازار حکیماں میں رہتے تھے۔ علی بخش سے پتہ چلا کہ علامہ بیمار ہیں۔ دھسہ لیکر لیٹے ہوئے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی، چہرہ اُترا ہوا، آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ گرامی دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ پوچھا خیریت ہے۔ معلوم ہوا

کہ امیر کی ماں نے میل ملاقات بند کر دی ہے۔ پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔
گرامی کھکھلا کر ہنس پڑے۔ پنجابی میں کہا۔
او چھڈ یار توں وی غضب کرنا ایں، او تینوں اپنی ہنڈی کس طرح دے دین۔
(چھوڑو یار تم بھی غضب کرتے ہو، بھلا وہ تمہیں اپنی ہنڈی کیونکر دے دے)۔ علامہ بیحد غمگین تھے۔ گرامی نے علی بخش سے کہا۔ گاڑی تیار کرو۔ مجھے ساتھ لیا اور اُس بازار کو روانہ ہو گئے۔ امیر کے مکان پر پہنچے۔ دستک دی۔ امیر کی ماں نے گرامی کو دیکھا تو خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔

آپ اور یہاں....؟ اھلاً و سھلاً

گرامی نے امیر کی ماں سے گلہ کیا کہ تُونے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے۔ اُس نے کہا۔ مولانا شاعروں کے پاس کیا ہے، چار قافیے اور دو ردیفیں۔ کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دے کر فاقے مر جاؤں؟ آپ کا شاعر تو ہمارے ہاں نقب لگانے آتا ہے۔ میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہو گا؟

گرامی نے اُجلی داڑھی کا واسطہ دیا اور دو گھنٹہ کی شخصی ضمانت دے کر امیر کو ساتھ لے آئے۔ میں علی بخش کے ساتھ، گرامی امیر کے ساتھ، گھوڑا دڑکی میں چلا آرہا تھا۔ علامہ کے ہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

اٹھو جی، آگئی امیر۔ سچ مُچ؟ علامہ نے حیرت سے پوچھا۔ امیر سامنے کھڑی تھی۔ دفعتاً اُن کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

سالک صاحب نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ انسان کو ان راستوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ فرمایا۔ جس زمانہ میں اقبال انارکلی میں رہتے تھے، ان دنوں لاہوری دروازہ اور پرانی انارکلی میں بھی کسبیوں کے مکان تھے۔ ایک دن میں علامہ کے ہمراہ انارکلی سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہ ایک ٹکیائی کے دروازہ پر رک گئے۔ ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت، مونڈھے پر بیٹھی حقہ سلگا رہی تھی۔ اندر گئے۔ حقہ کا کش لگایا۔ اٹھنی یا روپیہ اس کے ہاتھ میں دے کر آ گئے۔"

بانی آریہ سماج اور بابیت

جناب بشیر احمد صاحب نے اپنی کتاب "بہائیت" کے صفحہ 131-132 میں لکھا ہے۔

"1872ء کے لگ بھگ بہاء اللہ نے جمال آفندی بہائی کو اپنا سفیر بنا کر ہندوستان روانہ کیا۔ اس نے ہندوستان اور پنجاب کے بعض علاقوں کا دورہ کیا۔ گوالیار کے مشہور آریہ سماجی رہنما نتھولال گپتا نے انکشاف کیا ہے کہ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند نے جمالی آفندی سے طویل ملاقاتیں کیں۔ تین ملاقاتوں کے بعد اُس نے اپنے اصول وضع کئے اور آریہ سماج تحریک کی بنیاد رکھی۔ سوامی دیانند کی رسوائے زمانہ کتاب ستیارتھ پرکاش میں تمام بڑے مذہب خصوصاً اسلام کے خلاف لایعنی باتیں درج ہیں۔ نتھولال آریہ سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ بہائیوں کا مبلغ بھی تھا۔ اُس نے 1977ء میں وفات پائی۔ بہائیوں کا ایک اہم مجلہ "دی بہائی" ورلڈ 9-1976 نتھولال کی وفات پر لکھے گئے اپنے نوٹ میں ان امور کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جمال آفندی کی بمبئی میں سوامی دیانند سے ملاقات اور پھر آریہ سماجی تحریک کا آغاز ایک اچھوتا مضمون ہے جو مستقبل کے بہائی دانشوروں کو اس عنوان سے مزید تحقیق کی دعوت دیتا ہے۔"[27]

جمال آفندی کے بعد کئی بہائی ہندوستان آتے رہے۔

اقبال اور بابیت

اقبال کے پیغمبر اشتراکیت مزدک تحریک کا احیاء دور حاضر میں مسلح بابیت کی شکل میں ظاہر ہوا جس کی دہشت گرد سکیم عراق کے شہر کوفہ میں بنائی گئی اور اس کا خروج خراسان کی سرزمین بدشت سے ہوا۔ خراسان وہی علاقہ ہے جس کی نسبت آنحضرت خاتم الانبیاء ﷺ نے پیشگوئی فرمائی تھی۔

"الدجال يخرج من ا رض بالمشرق يقال لها خراسان يتبعه اقوام كان وجوههم المجان المطرقه"

دجال ارض مشرق سے جسے خراسان کہا جاتا ہے ظاہر ہوگا۔ اس کی پیروی وہ اقوام کریں گی جن کے چہرے ایسی ڈھالوں کی مانند ہونگی جن پر ہتھوڑے مارے گئے ہیں۔[28]

اس پیشگوئی اور تاریخی حقیقت کے پیش نظر سر اقبال کا یہ پُراسرار شعر ملاحظہ ہو۔

رہ عراق و خراساں زن اے مقام شناس

دلم گرفتہ ز آہنگ بربط عربی است[29]

اے مقام کو پہنچاننے والے عراق و خراسان کی رہ پر چل۔ **میرا دل بربط عربی کے آہنگ سے آزردہ ہو چکا ہے۔**

یہ سب نثری اور شعری کلام "شاعر مشرق" کے اصل اور باطنی عقیدہ کا آئینہ دار اور عکاس ہے۔ اس بنیادی نقطہ سے آگاہی کے بعد یہ معمہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے کہ تمام ماہرین اقبالیات خصوصاً "در گاہ اقبال" کے غلام جناب غلام احمد پرویز جیسے مبصر اپنے مقتدا اور پیشوا کے نظریات میں بے شمار تضادات واختلاف دیکھ کر کیوں محو حیرت رہ گئے ہیں؟ جیسا کہ ان کی ضخیم کتاب "تصوف کی حقیقت" کے ہر صفحہ سے عیاں ہے۔ وہ ساری عمر اقبالیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ

> "جس.... کو وہ اس سے پہلے یکسر اسلام کے خلاف قرار دیتے تھے، اس کے بعد وہ ان کے کس قدر **مبلغ بن گئے**۔ اگر وہ خود (اپنے دعویٰ کے مطابق) ہر عقیدہ اور مسلک کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھتے تو **ان کے خیالات اور عقائد میں اس قدر تضاد نہ ہوتا۔**"[30]

> "جب وہ.... پیچھے چلتے ہیں تو پھر پوری کی پوری عقل کو اٹھا کر جہنم رسید کر دیتے ہیں "زیر کی از ابلیس" خالص تصوف ہے اور **قرآن کے خلاف اعلان جنگ۔**"[31]

پھر لکھا۔

> "اس تنقید سے میرا مقصد علامہ اقبال یا کسی اور شخصیت کی تنقیص یا توہین نہیں۔ میں تو کسی عام انسان کی توہین کو بھی بارگاہ خداوندی میں جرم عظیم سمجھتا ہوں چہ جائیکہ ایسی شخصیتوں کی توہین یا تنکیر جو کسی حلقہ میں بھی واجب الاحترام سمجھی جاتی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کسی شخص کی عقیدت یا احترام **اظہار حق کے راستے میں رکاوٹ بن جائے تو یہ بھی عدالت خداوندی میں کچھ کم سنگین جرم نہیں۔ میں اس جرم کے ارتکاب سے خدا کی پناہ طلب کرتا ہوں۔**"[32]

اگر جناب پرویز خالی الذہن ہو کر مزید تحقیق و تفحص فرماتے تو انہیں یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ

نہ ہوتا کہ ایک ایسا فلاسفر اور شاعر جو اوائل عمر سے زندگی کے آخری لمحات تک مزدک کو پیغمبر اشتراکیت اور سوشلزم کو عین اسلام یقین کرتا ہے۔ عرب کی بجائے خراسان اور عراق کا والا و شیدا ہے اور ان کی خاک سے اٹھنے والی دہشت گرد تحریک اور اس کی ہیرو قرۃ العین طاہرہ پر فریفتہ اور اس کا شمار عرش کی پاکباز روحوں میں ہونے کا معتقد ہو۔ اور اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی عقیدتوں کا مرکز بننے اور اپنی موت کے بعد اپنی **پرستش** کا خواب دیکھ رہا ہو۔ اس کے لئے نظریاتی تضادات کا مرقع بننا لازم اور ناگزیر ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ پیغمبر اشتراکیت کی جانشین تحریک کا مقدس اصول اور ہدایت ہے۔ "**استر ذھبک و ذھابک و مذھبک**" کہ اپنی دولت، اپنا سفر اور اپنا مذہب چھپائے رکھنا۔

(بہجۃ الصدور صفحہ 83 مطبوعہ بمبئی مارچ 1914ء تالیف میرزا حیدر علی اصفہانی)

ابو الکلام آزاد۔ ظفر علی خاں اور بابیت

مولوی سید محفوظ الحق علمی (1895ء۔ 8 فروری 1978ء) بہائیت کے پرُجوش مبلغ تھے۔ اُن کے سوانح نگار محمد یوسف بجنوری کے بیان کے مطابق نہ صرف ڈاکٹر سر اقبال اور ابو الکلام آزاد بلکہ مولوی ظفر علی خاں کو "امر بہائی" سے محبت تھی اور اسی لئے علمی صاحب کے ساتھ ان کے گہرے روابط و مراسم تھے۔ چنانچہ بجنوری صاحب رقمطراز ہیں۔

مولانا ابو لکلام آزاد دہلی میں علمی صاحب سے بہت سی بہائی کتابیں لے گئے۔ امر بہائی سے محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سفیر ایران نے بہائیوں کے متعلق گمراہ کہا۔ مولانا نے انہیں فوراً ٹوکا اور کہا جناب سفیر کو مفتی کس نے بنایا ہے۔ آپ اپنی سفارت کے فرائض انجام دیجئے۔

ڈاکٹر اقبال، مولانا ظفر علی خاں

لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر بہت بار ملاقاتیں ہوئیں اور امر اللہ کے متعلق باتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ میں پورا پورا ہفتہ مرزا محمود زرقانی (مبلغ) سے ملاقات اور بہائی مذاکرات کرتا رہا ہوں اور ایک بار فرمایا کہ میں **سید باب کو شارع اعظم سمجھتا ہوں** اور ایک دفعہ مولانا ظفر علی خاں نے سید علمی کی ختم نبوت پر تقریر سن کر کہا کہ حضرت ڈاکٹر صاحب! بہائیت تو بڑا علمی سلسلہ ہے۔ تو ڈاکٹر اقبال صاحب نے فرمایا۔ میں تو آپ سے پہلے ہی کہتا تھا بہائیت تو ایک مستقل امر ہے۔ مولانا ظفر علی خاں ایک مرتبہ بمبئی تشریف لے گئے تو بہائی ہال میں سید علمی نے اُن کو دعوت دی اور محترمہ شیریں فوجدار اور محترمہ شیریں بہن سے بھی امری بات چیت ہوئی جن

کے بچوں نے حضرت عبد البہاء کی ایک لوح توحید انگریزی میں پڑھ کر سنائی تو مولانا ظفر علی خاں نے بڑی مسرت سے فرمایا کہ جن بچوں کو توحید الٰہی کی ایسی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، اُن کا مستقبل بہت شاندار ہے۔[33]

اشتراکی حکومت کی جدوجہد میں بابیت کی جارحانہ پالیسی

کارل مارکس نے اشتراکیت پھیلانے کے لئے بورژوا طبقہ کو تہس نہس کرنے کی جو جارحانہ پالیسی پیش کی اس کی ترویج کی خاطر بابی لیڈروں نے اول قدم پر ہی عملی اقدامات شروع کروائے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ کارل مارکس نے اپنا انقلابی پروگرام معاشیات کے حوالہ سے مرتب کیا تھا کیونکہ یورپ مذہبی اقدار سے آزاد ہو چکا تھا اور اسے مذہب کے بارہ میں نہ صرف کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے مقابل ایران غالی شیعوں کا گہوارہ اور مرکز تھا۔ وہ معاشیات کی بجائے مذہب کے فریفتہ اور والا و شیدا تھے اس لئے بابی پارٹی نے اشتراکیت کی راہ ہموار کرنے اور مخالفین اشتراکیت کو "مذہب"[34] کی طاقت سے کچل دینے کا فیصلہ کیا۔ بایں ہمہ کارل مارکس کے انقلابی پروگرام پر بھی آنچ نہیں آنے دی۔

اس ضمن میں بابیت کے بعض پُر تشدد وحشیانہ اور امن شکن احکام ملاحظہ ہوں۔

1۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ باب کی کتاب البیان کے سوا کوئی دوسری کتاب پڑھے یا پڑھائے۔[35]

2۔ دنیا میں جس قدر کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، سب کو نیست و نابود کر دیا جائے۔[36]

3۔ جو لوگ بابی تحریک پر ایمان نہیں لاتے، وہ پلید اور واجب القتل ہیں۔ [37]

4۔ ہر وہ چیز جو غیر بابی کے قبضہ میں ہے، پلید ہے مگر جو نہی وہ بابی کے قبضہ میں آجاتی ہے، پاک ہو جاتی ہے۔[38]

5۔ ہر غیر بابی کی جائیداد لوٹ لینی چاہیے کیونکہ اس کا قبضہ ناجائز ہے۔[39]

6۔ بابی مملکت میں کسی غیر بابی کو آنے جانے کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔[40]

اگرچہ بابیت ایران میں کوئی اشتراکی حکومت نہیں بنا سکی مگر تاریخ گواہ ہے کہ اُس نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے قتل و غارت سے قطعاً کوئی دریغ نہیں کیا۔ اور 1917ء میں جو اشتراکی انقلاب برپا ہوا، وہ وسیع پیمانہ پر خونریزی، غنڈہ گردی اور لوٹ مار ہی کا رہین منت تھا۔ جس کے قیام سے بابی

انقلابیوں کی آواز بھی پوری ہوگئی کہ ان کی حکومت کی سرحدیں مخالفین کے لئے بند کر دی جائیں۔ چنانچہ لینن اور سٹالین روسی حکومتوں نے برسر اقتدار آکر اپنے ملک کو آہنی پردہ بناڈالا۔

حواشی:

[1] انبیائے قرآن صفحہ 362 از محمد جمیل احمد صاحب ایم اے ناشر غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ اشاعت دسمبر 1954ء۔

[2] یہاں قرآن مجید نے ماضی کے نہیں بلکہ مضارع کے صیغے استعمال فرمائے ہیں جو حال اور مستقبل دونوں پر محیط ہیں۔

[3] "حقیقۃ الوحی" صفحہ 81 مع حاشیہ (طبع اول) اشاعت 15 مئی 1907ء۔

[4] تفسیر کبیر سورۃ الفجر جلد ہشتم (جدید ایڈیشن) صفحہ 548 نظارت اشاعت ربوہ۔

[5] خبر بذریعہ اے پی پی مطبوعہ ڈان (کراچی) نوائے وقت (لاہور) پاکستان آبزرور ڈھاکہ۔ 17 ستمبر 1967 بحوالہ "ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی سوانح حیات" پہلا حصہ صفحہ 401 از مولوی رشید اختر ندوی ناشر ادارہ معارف ملی اسلام آباد۔ اشاعت دسمبر 1974ء۔

[6] جنگ و نوائے وقت 18 ستمبر 1967ء بحوالہ تالیف اختر ندوی صاحب صفحہ 402۔

[7] پاکستان آبزرور ڈھاکہ 21 اکتوبر 1967ء بحوالہ "ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی حیات" صفحہ 404-406۔

[8] ڈان۔ یکم نومبر 1967ء۔ نوائے وقت 2 نومبر 1967ء بحوالہ کتاب مذکور صفحہ 407۔

[9] ایضاً کتاب مذکور صفحہ 407۔

[10] نوائے وقت 9 نومبر 1967ء بحوالہ کتاب مذکور صفحہ 410۔

[11] بحوالہ کتاب مذکور صفحہ 411۔

[12] منشور (جنوری 1977ء) شائع کردہ مرکزی دفتر پاکستان پیپلز پارٹی طابع خورشید پرنٹرز اسلام آباد۔

[13] رسالہ "ترجمان القرآن" اکتوبر 2003ء صفحہ 324۔

[14] "ریاست" صفحہ 24-25۔ اردو ترجمہ ریپبلک مولفہ افلاطون مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی۔

[15] Plato Republic

[16] The Reconstruction of Religious Thought in Islam (اردو ترجمہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجم سید نذیر نیازی)

[17] "فلسفہ عجم" ترجمہ صفحہ 396-400۔ مترجم میر حسن الدین بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ یونیورسٹی) ناشر نفیس اکیڈمی کراچی طبع پنجم مارچ 1962ء۔

[18] ترجمہ الملل والنحل جلد اول صفحہ 66 مترجم مولوی عبداللہ العمادی ناشر محمدی کتب خانہ آرام باغ کراچی۔

[19] جلد اول صفحہ 450 تا 488 ناشر مجلس ترقی ادرو ادب 2 کلب روڈ لاہور۔ اشاعت اکتوبر 1967ء۔

[20] "فرق الشیعہ" صفحہ 46 ناشر المطبعۃ الحیدریہ نجف اشاعت 1355ھ / 1936ء۔

[21] "تذکرۃ الائمہ" صفحہ 62 از محمد باقر مجلسی مطبوعہ شیراز۔ جلاء العیون جلد دوم صفحہ 85-86 از مُلّا باقر مجلسی۔ جنرل بک ایجنسی انصاف پریس لاہور "ہزار تمہاری دس ہماری" صفحہ 553 مصنف عبدالکریم مشتاق رحمت اللہ بک ایجنسی کراچی (قرآن اصلی نہیں) الانوار النعمانیہ جلد 2 صفحہ 360 مطبوعہ بیروت از السید نعمۃ اللہ الجزائری (اصل قرآن ظہور مہدی تک نظر نہیں آئے گا) کتاب البرھان فی تفسیر القرآن جلد 1 صفحہ 38۔ سید سلیمانی البحرانی طبع ثانی مطبوعہ تہران (قرآن بکری کھا گئی) ایضاً "تاریخی دستاویز" (مجموعہ عکسی حوالہ جات شیعہ لٹریچر) مرتب ضیاء الرحمٰن فاروقی مطبوعہ جھنگ نومبر 1995ء۔

[22] اقتدار صفحہ 47 مصنفہ 13 رجب المرجب 1310ھ مطابق 19 فروری 1893ء۔

[23] "اجتناب اہل السنہ" صفحہ 222 تالیف جناب ابوالطاہر محمد طیب صاحب۔ مطبوعہ بریلی الیکٹرک پریس بریلی 1361ھ مطابق 1942ء۔

24 مکمل قصیدہ براؤن کے حوالہ سے ابوالقاسم رفیق دلاوری نے اپنی کتاب "آئمہ تلبیس" حصہ دوم صفحہ 226 تا 228 میں بھی شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب "مکتبہ تعمیر انسانیت" موچی دروازہ لاہور نے 1978ء میں شائع کی ہے۔

25 جاوید نامہ صفحہ 144۔

26 بانگ درا صفحہ 51-52۔

27 بہائی ورلڈ 9-1976 صفحہ 444۔

28 ترمذی ابواب الفتن "باب من این یخرج الدجال"۔

29 کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ 297 ناشر اردو اکادمی دہلی اشاعت دوم 1993ء۔

30 "تصوف کی حقیقت" صفحہ 333 از غلام احمد پرویز شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام گلبرگ لاہور نمبر 11 طبع اول ستمبر 1981ء۔

31 ایضاً صفحہ 341۔

32 ایضاً صفحہ 384۔

33 "بہائی میگزین" کراچی 5۔ جنوری، فروری 1980ء صفحہ 18-19۔

34 بابیت کوئی مذہب نہیں بلکہ بزور شمشیر انقلاب کے خود ساختہ اصول تھے یہی وجہ ہے کہ جب ایرانی شیعہ علماء نے جو موجودہ قرآن کو مصحف عثمان قرار دیتے تھے، باب پر دباؤ ڈالا تو انہوں نے اپنے عقائد سے توبہ نامہ لکھ کر سامنے کر دیا جو مجلس شوریٰ ملی ایران میں محفوظ ہے اور حیدر آباد دکن میں مطبوعہ حاجی فتح اللہ مفتون کی کتاب "باب و بہاء را بشناسید" کے صفحہ 288 پر شائع شدہ ہے۔

35 البیان باب 10 واحد صفحہ 4۔

36 ایضاً البیان "الباب السادس من الواحد السادس فی حکم محو کل الکتب کلھا الخ (صفحہ 198)"۔

37 نقطۃ الکاف (مقدمہ)۔

38 البیان باب 14 و 51۔

39 البیان باب 5 واحد 5-8۔

40 ایضاً۔

دوسری فصل

روس اور بابیت

پاکستان کے نامور مصنّف جناب بشیر احمد صاحب کے قلم سے اپریل1993ء میں اسلامک سٹڈی فورم راولپنڈی کے زیر انتظام ''بہائیت'' کے نام سے ایک فکر انگیز کتاب شائع ہوئی ہے۔

فاضل مؤلف بابیت کی مسلّح بغاوت اور بابیوں کے روس سے گہرے تعلقات کو بے نقاب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

1۔(بدشت کانفرنس جون 1848ء) ''اس اسلام دشمن اجتماع میں روسی پٹھو بشرومی نے شرکت نہ کی۔ وہ خراسان کے شورش زدہ علاقے میں بابیوں کو مسلّح کر رہا تھا۔'' (صفحہ53) قلعہ شیخ طبرسی کے واقعہ سے ظاہر ہو گیا کہ بابی غیر ملکی اشارے پر ایران کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بے گناہ لوگوں کا قتل عام کیا۔ ان کے گھر جلائے اور غلہ لوٹا۔ ہندوستان اور ترکی سے بھی ہم خیال لوگ بلوائے گئے۔ بابیوں کو یہ بھی اُمید تھی کہ آذر بائیجان سے حکومت مخالف عناصر ان کی مدد کو آجائیں گے''(صفحہ55)

2۔ ''بابی بغاوت کے آغاز ہی سے روسی، فرانسیسی اور برطانوی لیگیشن اور ایرانی دربار کے امراء سفارتی اور دیگر طریقوں سے حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ بابیوں پر سختی نہ کی جائے''(صفحہ57)[1]

3۔ تاریخ نبیل کا بہائی مصنف لکھتا ہے کہ باب کے قتل کے دوسرے دن صبح سویرے روسی قونصل ایک ماہر نقاش کے ساتھ خندق پر پہنچا جہاں ''حضرت باب'' کا جسد پھینکا گیا تھا۔ خندق کے اردگرد سخت پہرہ تھا۔ اس نے ان دوپاک جسدوں کی اسی حالت میں نقاشی کرائی۔[2] قرن بدیع کامولف شرقی آفندی ایک ہمعصر مورخ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ.... باب کے قتل کے واقع کو روس میں ایک خونیں ڈرامے کے طور پر پیش کیا گیا۔ دیگر یورپی ممالک میں بھی اس کی تشہیر کی گئی۔'' (صفحہ59)

4۔ بہاء اللہ معمولی پڑھا لکھا تھا۔ اس نے بنیادی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ مذہب سے زیادہ لگاؤ نہ رکھتا تھا۔ جاہ پرست ایرانی امراء کے طور طریقوں کے مطابق ایرانی دربار سے وابستہ ہو گیا۔ 1839ء–1842ء تک ایرانی دربار میں کافی رسوخ پیدا ہو گیا۔ اسکے سیاسی عزائم کی تکمیل میں تہران

میں موجودہ روسی سفارت خانے (Legation) کو گہرا دخل ہے۔ اس کے بعض قریبی رشتہ دار روسی لیگیشن (Legation) سے وابستہ تھے۔ اس کا بہنوئی عبدالمجید آہی روسی نمائندے مقیم ایران پرنس ڈول گورکی کا پرائیویٹ سیکریٹری تھا۔ اس کا پھوپھا مرزا یوسف روسی شہری اور پرنس کا بہترین دوست تھا۔ اس کے علاوہ اس کے خاندان کے لوگوں کی روس میں رشتہ داریاں، سیاسی روابط اور کاروبار تھے۔ ایک لحاظ سے یہ خاندان روس کا خود کاشتہ پودا تھا۔" (صفحہ 78)

5۔ "جون 1848ء میں بدشت کانفرنس کے انعقاد کے تمام انتظامات اسی نے کئے۔ طاہرہ کو قزوین میں نظر بندی سے رہائی دلوائی اور دیگر سرکردہ بابیوں کو بدشت میں جمع کیا۔ اس کانفرنس میں باب کی رہائی کی تجاویز پر بحث کی گئی۔ اسلامی شریعت کی تنسیخ کا اعلان ہوا اور بابیت کو پھیلانے کے لئے ایک پروگرام تیار کیا گیا۔ اس سازش کے پیچھے سب سے بڑا کردار حسین علی کا تھا۔ باب اور دیگر بابیوں کو محض مہروں کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اسلامی شریعت کی تنسیخ کے اعلان کے بعد غیر ملکی طاقتوں کو بابی اقلیت کے تحفظ کا موقع حاصل ہو گیا اور ہر طرح کی مدد دینے کا جواز پیدا ہو گیا۔ (صفحہ 79)

6۔ 15 اگست 1852ء کو کئی بابی گرفتار ہوئے۔ بہائیوں کا یہ کہنا کہ بیس ہزار بابی بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے گئے اور زندہ جلا دیئے گئے، قطعاً غلط اور تاریخی حقائق کو مسخ کر کے اپنی مظلومیت کو ظاہر کرنے کی گھٹیا حرکت ہے۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی بہاء شاہ کے قتل کے منصوبے سے پہلے سے آگاہ تھا۔ شاہ پر قاتلانہ حملہ سے قبل حسین علی نے کربلا میں بابیوں سے رابطہ کیا اور واپسی پر وزیر اعظم مرزا تقی کے بھائی کے پاس شمران میں قیام کیا۔ ایرانی دربار میں حسین علی کا نام بابی سازشیوں میں سرفہرست تھا۔ شاہ ناصر الدین کی والدہ آقا جان وزیر جنگ اور حسین علی پر کھلے بندوں قتل کی سازش کا الزام لگاتی تھی۔[3] آخر کار حسین علی کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیئے گئے لیکن جب اسے گرفتار کر کے تہران لایا جا رہا تھا تو روسی لیگیشن (Legation) نے اس کو اپنے ہاں پناہ دے دی۔ یہ ایک غیر متوقع اور غیر معمولی اقدام تھا۔ ایک قتل کے ملزم کو پناہ دینا سفارتی آداب کے منافی تھا۔ اس امر کی اطلاع شاہ ایران اور وزیر اعظم کو دی گئی۔ شاہ ایران نے اپنے اعلیٰ افسروں کو روسی لیگیشن روانہ کیا جنہوں نے روسی سفیر پرنس ڈول گورکی سے پُرزور مطالبہ کیا کہ شاہ کے قتل میں ملوث اس ملزم کو ان کے حوالے کیا جائے لیکن لیگیشن نے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔[4]

حکومت کے مسلسل دباؤ کے نتیجہ میں پرنس ڈول گورکی سفیر روس نے وزیر اعظم ایران کو

ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں کہا گیا تھا کہ مرزا حسین علی کو پناہ دی جائے اور اس کی جان کی حفاظت کی جائے۔ وزیر اعظم ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اپنی معزولی اور عوام اور علماء کے ڈر کی وجہ سے وہ اس بات کو ماننے پر آمادہ نہ ہوا۔ حسین علی کو تہران کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔" (صفحہ 80-81)

7۔"1917ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد عبد البہاء کا وظیفہ کم کر دیا گیا۔ اس کا باپ بہاء اللہ تمام زندگی روس کا وظیفہ خوار رہا۔ روسی انقلاب کے ابتدائی سالوں میں اشتراکیوں نے بہائیوں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا بلکہ جہاں کہیں روس کی مذہب دشمنی کا ذکر ہوتا وہاں بہائیوں کے ساتھ حسن سلوک کو بطور مثال پیش کیا جاتا کیونکہ اشتراکی روس میں بہائی آزادی سے رہ رہے تھے۔ 1925ء کے وسط میں اشتراکی روس کی تیرہ کروڑ آبادی میں صرف ایک مذہبی پرچہ نکلتا تھا جو بہائی جریدہ خورشید خاور (انگریزی) تھا۔ مئی 1927ء میں برطانیہ اور روس کے تعلقات خراب ہوگئے۔ روس نے ہندوستان کے انقلابیوں کو تاشقند کے مراکز میں فوجی تربیت دینی شروع کی جس پر برطانوی حکومت نے احتجاج کیا۔ ستمبر 1927ء کے "بہائی نیوز" (Bahai News) نے ترکستان میں محفل روحانی ملی کے قیام کا اعلان کیا۔"(صفحہ 220)

حواشی:

[1] بحوالہ شورش بابیان در ایران جلد 20 (143-159) روسی کلچرل سینٹر ماسکو کا ماخوذ التوحید شمارہ 1 جلد 1 مضمون مجتبیٰ سلطانی۔

[2] تاریخ نبیل 56 نیز قرن بدیع 91۔

[3] تاریخ نبیل 180۔

[4] ایضاً صفحہ 181۔

تیسری فصل

جدید سوشلزم اور اس کا بانی (کارل مارکس)

دور حاضر کی سوشلزم کا بانی یہودی نژاد کارل مارکس (Karl Marx) تھا جو 5مئی 1818ء کو جرمنی میں پیدا ہوا اور 14مارچ 1882ء کو لنڈن میں وفات پائی۔ اور لنڈن کی ایک پہاڑی پر واقع ہائی گیٹ نامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ کارل مارکس نے اکتوبر 1842ء میں اپنے معاشی خیالات کی اشاعت کے لئے "رائین گزٹ" کی ادارت سنبھالی۔ حکومت کی دھمکی پر اخبار کے مالکوں نے اخبار کی پالیسی تبدیل کرنے کا ارادہ کرلیا جس پر مارکس نے ایڈیٹری سے استعفادے دیا اور ساتھ ہی حکومت نے اخبار ضبط کرلیا۔ جس کے بعد وہ پیرس آگیا جہاں اُس نے ایک جرمن فرانسیسی سالنامہ کی ادارت قبول کرلی۔ اس سالنامہ کا پہلا شمارہ 1845ء میں نکلا۔

اس پرچہ میں اس کے ہمعصر فریڈرک اینجلز نے ایک مقالہ رائج الوقت اقتصادی نظام کے خلاف لکھا جس سے مارکس بہت متاثر ہوا۔ اینجلز بھی جرمنی کے اسی علاقہ بریمن (Bremen) میں پیدا ہوا جہاں کارل مارکس کی ولادت ہوئی تھی۔ اینجلز کو 1871ء میں لازمی فوجی بھرتی کے قانون کے تحت توپ خانہ میں کام کرنا پڑا۔ پھر وہ انگلستان کے صنعتی شہر مانچسٹر میں کپڑے کے ایک کارخانہ کا ایجنٹ بن گیا۔ 1845ء میں اینجلز برسلز میں کارل مارکس کے پاس ہی آگیا۔ 1847ء میں اینجلز فرانسیسی مزدوروں کے نمائندہ کی حیثیت سے لندن آیا۔ اسی دوران کارل مارکس نے بھی لندن میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اسی سال لندن میں کمیونسٹ لیگ کی پہلی کانگرس لندن میں منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر کے عوام کو مندرجہ ذیل تین نعرے دیئے۔

۱۔ سرمایہ داری کا خاتمہ۔ ۲۔ مزدور حکومتوں کا قیام۔ ۳۔ دنیا بھر کے مزدوروں کا اتحاد۔

لیگ کا دوسرا اجلاس اس سال 23 دسمبر کو منعقد ہوا۔ مارکس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ مارکس اور اینجلز کمیونسٹ لیگ کے اغراض ومقاصد تحریر کریں۔ چنانچہ دونوں نے ایک منشور مرتب کیا جو فروری 1848ء میں صنعتی انقلاب فرانس (فروری 1848ء) سے چند ہفتے قبل طباعت کے لئے دیا گیا۔ یہ وہی شہرہ آفاق عالمی کمیونسٹ مینوفیسٹو ہے جس نے دنیا میں انقلاب کی بنیاد ڈالی اور دنیا بھر کی سوشلسٹ پارٹیوں کا لائحہ عمل بنا۔

مارکس کے برسلز میں قیام کے باعث کمیونسٹ لیگ کا صدر دفتر لنڈن سے برسلز منتقل کر دیا گیا۔ مگر انقلاب فرانس کے بعد اس کا صدر دفتر دوبارہ لنڈن میں قائم کر دیا گیا اور بالآخر23 اگست 1849ء کو مارکس بھی لندن آگیا اور زندگی کے آخری سانس تک یہیں رہا۔

کارل مارکس کی ایسٹ انڈیا کمپنی پر تنقید

کارل مارکس نے قیام لندن کے دوران یورپ اور تیسری دنیا خصوصاً ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف زبردست تنقیدی مضامین لکھے جن کو امریکی پریس نے شائع کیا۔ چنانچہ 10جون1853ء کو اس نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جو نیویارک ڈیلی ٹریبیون (25جون 1853ء) کو شائع ہوا۔ جس میں ہندوستان میں مغلوں اور انگریزوں کے اقتدار کو نفس پرستی اور رنگ رلیوں کا مذہب قرار دیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:-

"ہند وستان میں سماجی انقلاب لانے کے سلسلے میں انگلستان کے محرکات ذلیل ترین تھے اور اس کا اپنے ذلیل مفاد کو ہندوستان پر ٹھونسنے کا طریقہ بھی بہت احمقانہ تھا۔"

پھر بتایا:-

"قدیم دنیا کی تباہی کا نظارہ کتنا ہی تلخ اور ناگوار کیوں نہ ہو لیکن ہمیں تاریخی نقطۂ نظر سے گئیٹے کی ہم نوائی میں یہ کہنے کا حق ہے۔[1] یہ تعذیب جو ہمارے واسطے زیادہ مسرت لے کر آئی ہے کیا اسی لئے تکلیف دہ ہونی چاہیے۔ تیمور کے عہد حکومت میں کیا روحوں کی بیحد وحساب تباہی نہیں ہوئی۔"[2]

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی مذمت

اس کے بعد مارکس کا ایک اور مضمون نیویارک ڈیلی ٹریبیون (18اگست1853ء) میں بھی چھپا جس کے بعض اقتباس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"ہندوستان میں برطانوی اقتدار آخر کیسے قائم ہو گیا۔ مغل اعظم کے اقتدار اعلیٰ کو مغل صوبے داروں نے پاش پاش کیا۔ صوبے داروں کی قوت کو مرہٹوں نے توڑا۔ مرہٹوں کی قوت کو افغانیوں نے ختم کیا اور اس وقت جبکہ سب ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزما تھے۔ برطانوی جھپٹ کر پہنچ گیا اور وہ ان سب کو زیر کر سکا۔ یہ ایک

ایسا ملک تھا جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں بلکہ مختلف قبیلوں اور مختلف ذاتوں میں بھی تقسیم تھا.... ایسے ملک اور ایسے سماج کے مقدر میں بھلا مفتوح اور مسخر ہونا نہیں تو اور کیا لکھا تھا۔"

"ہندوستان کا سیاسی اتحاد جو آج عظیم مغلوں کے زمانے سے کہیں زیادہ استوار اور وسیع ہے ہندوستان کے حیات نو پانے کی اوّلین شرط تھا۔ یہ اتحاد جسے برطانوی تلوار نے ہندوستان پر عائد کیا تھا، اب تار برقی کے ذریعہ اور زیادہ مستحکم اور پائیدار بنے گا"

"وہ سب کچھ جو انگریز بورژوا طبقہ کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے جنتا کی سماجی حالت میں نہ تو کوئی قابل ذکر بہتری پیدا کرے گا اور نہ جنتا کو آزاد کرے گا۔.... لیکن انگریز بورژوا طبقہ ان دونوں مقاصد کو پورے کرنے کے لئے بنیاد ضرور رکھ دے گا۔ اور بورژوا طبقے نے کبھی اس سے زیادہ بھی کچھ کیا ہے؟ کیا وہ کبھی افراد اور قوموں کو خون اور غلاظت، مصیبتوں اور ذلّتوں میں جھونکے بغیر کسی قسم کی ترقی کو بروئے کار لایا ہے؟ ہندوستانی اس وقت تک نئے سماج کے ان عناصر کا فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جو برطانوی بورژوا طبقے نے ان کے درمیان بکھیر رکھے ہیں جب تک کہ خود برطانیہ عظمیٰ میں صنعتی پرولتاریہ حکمران طبقوں کی جگہ نہ لے لے۔ یا پھر جب تک خود ہندوستانی اتنے طاقتور نہ ہو جائیں کہ وہ انگریزی حکومت کے جوئے کو مکمل طور پر اپنی گردنوں سے نکال کر پھینک سکیں۔"

کارل مارکس نے اپنے مضمون کے آخر میں ملک کی اکثریتی آبادی رکھنے والے ہندوؤں کی مظلومیت کی زبردست وکالت کرتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

"موسیٰ سے مارکس" تک کے کمیونسٹ مورّخ جناب سبط حسن نے اپنی کتاب کا بیسواں باب مارکس اینجلز اور ہندوستان کے موضوع کے لئے وقف کیا ہے۔ موصوف نے کارل مارکس اور اینجلز کے متعلق تفصیل سے بتایا ہے کہ غدر 1857ء میں ان کی تمام ہمدردیاں باغی ہندوستانیوں کے ساتھ تھیں۔ نیز لکھا ہے:-

"مارکس ایک خبر نامے میں برطانوی پارلیمنٹ کے حزب اختلاف کے لیڈر بنجامن ڈزریلی کی تقریر کے اقتباسات دیتا ہے اور اس کی رائے سے اتفاق کرتا ہے کہ

ہندوستان کی شورش فوجی بغاوت نہیں بلکہ قومی انقلاب ہے۔"[3]

جناب سبط حسن نے اپنی کتاب میں کارل مارکس کا یہ خیال نمایاں رنگ میں پیش کیا ہے کہ

"ہندوستانیوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ انگریزوں کے نافذ کردہ معاشرے کے نئے عناصر یعنی مشینی صنعت کاری کا پھل اُس وقت تک نہیں کھا سکیں گے جب تک برطانیہ میں موجودہ حاکم طبقے کی جگہ پرولتاریہ کا راج نہ ہو جائے یا خود ہندوستانی اتنے قوی نہ ہو جائیں کہ انگریز کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں۔"[4]

ہندوؤں سے کارل مارکس کی ہمدردی

ہندو قوم کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے غلیظ زبان بھی استعمال کی اور انتہائی غیظ و غضب سے لکھا:

"جب بورژوا تہذیب اپنے وطن سے جہاں وہ معقول اور معزز شکلیں اختیار کرتی ہے، نو آبادیات کی طرف بڑھتی ہے جہاں وہ بالکل عریاں ہو جاتی ہے تو اس کی گہری ریاکاری اور بربریت، جو اُس کی فطرت کا خاصہ ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ ملکیت کے حامی ہیں لیکن کیا کوئی انقلابی جماعت کبھی اس قسم کے زرعی انقلابات عمل میں لائی ہے جیسے بنگال، مدراس اور بمبئی میں ہوئے ہیں۔ میں خود اس مہا ڈاکو لارڈ کلائیو کا ایک فقرہ استعمال کر کے کہتا ہوں کہ جب معمولی رشوت ستانی ان کی حرص و ہوس کو آسودہ نہیں کر سکی تو کیا انہوں نے ہندوستان میں زور اور زبردستی سے بے اندازہ دولت نہیں بٹوری؟ جبکہ وہ یورپ میں قومی قرضوں کی اہمیت اور تقدس کے متعلق بکواس کرتے نہیں تھکتے تھے تو اسی کے ساتھ ساتھ کیا انہوں نے ہندوستان میں ان راجاؤں کے منافع ضبط نہیں کئے جنہوں نے اپنی نجی بچت کو خود کمپنی کے سرمائے میں لگا دیا تھا۔ وہ "ہمارے مقدس مذہب" کی حمایت کا نام لے کر ادھر تو فرانسیسی انقلاب سے جنگ آزما رہے اور ادھر ہندستان میں کیا انہوں نے عیسائیت کے پرچار کی قطعی مخالفت نہیں کی۔ اور کیا انہوں نے اوڑیسہ اور بنگال کے مندروں میں جوق در جوق آنے والے یاتریوں سے روپیہ اینٹھنے کے لئے جگن ناتھ کے مندر میں ہونے والی عصمت فروشی اور قتل کی گرم بازاری میں ہاتھ

نہیں رنگے۔ یہ ہیں ملکیت، قاعدہ، قانون، خاندان اور "مذہب" کے نام لیوا لوگ۔
انگریزی صنعت کے تباہ کن اثرات کا مطالعہ اگر ہندوستان کے سلسلے میں کیا جائے جس کی وسعت پورے یورپ کے برابر ہے اور جس میں 15 کروڑ ایکڑ زمین موجود ہے تو وہ صریحاً مگر حیران کن معلوم ہوں گے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اس پورے نظام پیداوار کا فطری نتیجہ ہیں جو اس وقت موجود ہے۔ اس پیداوار کی بنیاد سرمائے کی حکومت عالیہ پر ہے۔ سرمائے کی مرکزیت اس کے ایک خود مختار قوت کی حیثیت سے قائم رہنے کے لئے ناگزیر ہے۔ سرمائے کی اس مرکزیت کا دنیا کی منڈیوں پر تخریبی اثر نہایت بڑے پیمانے پر سیاسی معاشیات کے فطری قوانین کو بے حجاب کرتا ہے جو اس وقت دنیا کے ہر مہذب شہر میں مصروف عمل ہیں۔ تاریخ کے بورژوا دور کو نئی دنیا کے لئے بنیاد کی تخلیق کرنی ہے.... جب ایک عظیم سماجی انقلاب بورژوا عہد کے سارے ثمروں پر دنیا کی منڈی پر اور جدید پیداوری قوتوں پر قابض ہو جائے گا اور انہیں سب سے زیادہ ترقی یافتہ لوگوں کی مشترکہ نگرانی اور تسلط میں لے آئے گا، صرف اسی وقت بت پرستوں کے اس کریہہ المنظر دیوتا سے انسانی ترقی کی مشابہت ختم ہو گی جو مقتولوں کی کھوپڑیوں کے علاوہ اور کسی چیز میں آسمانی شراب نہیں پیتا تھا۔"[5]

تحریک بربادی 1857 اور جہادی ملاؤں کا رُخ کردار

رام راج کے علمبرداروں کی یہ تحریک جو کارل مارکس کے پراپیگنڈے کے مطابق اس کے خطوط پر چلائی گئی۔ بیک وقت ایسٹ انڈیا کمپنی اور بہادر شاہ ظفر اور مسلمانوں کے خلاف تھی جس میں جہادی ملاؤں کا کردار نہایت گھناؤنا اور شرمناک تھا۔ اس حقیقت کا اندازہ صرف الہ آباد میں بغاوت کے حالات سے بخوبی لگ سکتا ہے۔

ایک غیر جانبدار وقائع نگار اور تاریخ نویس پنڈت کنہیالال کا بیان ہے۔

"مفسدین نے خوب شور مچایا، **رام چندر کی جے کے نعرے لگائے** اور چند ایک نے جیل خانے کی طرف جا کر وہاں سے اڑھائی ہزار قیدیوں کو رہائی دلوائی۔ ان کی رہائی نے الہ آباد کے تمام ساکنین کو پریشان کیا۔ قیدیوں کی زنجیروں کی صدا کئی گھنٹے

شہر میں گونجتی رہی۔ تمام قیدی مل کر صاحبان کی جانب روانہ ہوئے اور تمام بنگلوں کو جلادیا۔ انہوں نے اور سرکش سپاہیوں نے سب سے پہلے رجمنٹ 6 سے متصل اجیٹن صاحب کے بنگلے کو جلایا اور پھر برل صاحب کی کوٹھی کو آگ لگائی۔ یوں وہ آگ لگاتے لگاتے ڈاک خانے تک پہنچے اور ایسلی ہاؤس، میجر ہور ہوس، مسز ہیملٹن اور پامر صاحب کے بنگلوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ بنگلوں کو نذر آتش کرنے اور مال اسباب لوٹ لینے کے بعد قیدی گردونواح میں پھیل گئے۔ بعض نے اپنے گھروں کا رخ کیا اور کچھ سرکش سپاہی لوٹے ہوئے مال کی بار برداری کے لئے پکڑے گئے۔ اکثر نے رعایا کا مال اسباب غارت کرنا شروع کر دیا۔ اگلے روز یعنی 8 جون کو ساری فوج پریڈ گراؤنڈ پر جمع ہوئی اور فیصلہ کیا کہ خزانہ کو آپس میں تقسیم کر لیں جو بیس لاکھ روپے تھے۔ اگرچہ قبل ازیں یہ سارا خزانہ شاہ دہلی کو پیش کرنے کا فیصلہ ہوا تھا لیکن حرص نے ساری تدبیر بدل دی اور تمام مشوروں پر حرص غالب آگئی۔ دوپہر دو بجے کے قریب خزانے کے صندوق کھلے۔ کسی سپاہی نے روپے کے تین توڑے، کسی نے چار توڑے اٹھائے (فی توڑا ہزار روپے کا تھا)۔ جب ان میں مزید روپیہ اٹھانے کی ہمت نہ رہی تو قیدیوں اور شہر کے بدمعاشوں کو حکم دیا کہ باقی ماندہ روپیہ آپس میں تقسیم کر لیں۔

اس واقعہ کے فوراً بعد **ایک مولوی صاحب نے (جن کا نام معلوم نہیں ہوسکا) انگریز سرکار کے خلاف سرکشی کا علم بلند کر کے اکثر بدمعاشوں کو جمع کیا۔** مشہور ہے کہ یہ شخص کسی مکتب میں پڑھاتا تھا، لیکن جب ان احسان فراموش سپاہیوں نے عام فساد برپا کیا اور ان کی سرکوبی کے لیے گورا فوج موجود نہ رہی تو اس نے بھی سرکار کے خلاف سرکشی شروع کر دی۔ اگرچہ حکومت چند روز تھی لیکن دو باتیں کھل کر سامنے آگئیں: اول یہ کہ مسلمانوں میں اتفاق کی شہرت بے بنیاد نہیں، دوسرے یہ کہ مسلمان انگریزوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ جس وقت مسلمانوں نے سنا کہ ایک مولوی کھڑا ہوا ہے تو روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں اس کے پاس آنے لگے۔ سب کا مطمح نظر یہ تھا کہ انگریزوں کا بالکل صفایا کر دیں۔ مولوی اپنے جلسے چھاؤنی کے جنوب مغربی گوشے میں واقع ایک باغ میں لگایا کرتا تھا جو سلطان خسرو کا

باغ کہلاتا ہے۔ یہاں اس نے اپنی ایک ہفتے کی خیالی حکومت چلائی اور اکثر وقت وعظ اور نماز میں بسر کرتا تھا۔ وہ بہ آواز بلند کہتا تھا کہ اے مجاہدو، قلعے پر جاؤ کیونکہ اب فرنگی موجود نہیں۔ وہ قرآن سے نیک فال نکال کر اعلان کرتا۔ مسلمان کئی مرتبہ اس کی ہدایت پر قلعے کی جانب آئے لیکن فصیل پر نصب توپوں کو دیکھ کر واپس ہو گئے۔ راستے میں وہ عام لوگوں کی شامت لاتے۔ اس طرح وہ کئی بار قلعے پر آئے لیکن مایوس واپس لوٹے۔

14 جون کو قلعہ میں موجود صاحبان نے ایک انگریز افسر کے ماتحت کچھ سکھ سپاہیوں کو قلعے سے باہر روانہ کیا تاکہ سرکشوں کو سزا دے سکیں۔ لیکن مولوی کے ساتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کے باعث یہ دستہ واپس قلعے میں چلا گیا۔ نیتجۃً مولوی کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور کہنے لگا۔ خدا نے میری دعا قبول کر لی۔ دیکھو خدا کی مدد سے انگریزوں کو باہر نکال دو۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ قلعے سے فائر کیا گیا۔ کوئی بھی گولہ انہیں نقصان نہ پہنچا سکا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ مولوی صاحب نے اپنی برکت سے انگریزوں کی توپیں بیکار بنا دی ہیں، مگر یہ غلط فہمیاں جلد ہی دور ہو گئیں۔ 14 تاریخ کو سکھ پیاروں کا ایک کثیر التعداد گروہ دریاباد جہاں کی جانب روانہ ہوا جہاں میواتی باغی قیام پذیر تھے۔ دریائے جمنا کے راستے سے بھی دخانی جہاز پر گورا فوج کا ایک دستہ اسی مقام کی طرف بھیجا گیا، ان دونوں افواج نے وہاں جا کر خوب قتل عام کیا اور باغیوں کو سبق سکھایا۔ سرکشوں کو شکست فاش ہوئی اور مولوی صاحب اسی شب فرار ہو گئے۔ یوں اس کی چندروزہ حکومت ختم ہوئی۔ اسی شخص کی وجہ سے الہ آباد کے لوگوں نے بُرے دن دیکھے۔

اوپر مذکور مولوی صاحب نے شاہ اودھ الہ آباد اور قرب وجوار کے دیگر مقامات میں دو اشتہار لگائے تھے۔ ایک صاحب کی مہربانی سے وہ دونوں اشتہارات راقم کو دستیاب ہوئے چنانچہ ان کی تفصیل ذیل میں برائے معلومات درج کی جارہی ہے۔“

(آگے مولف نے دونوں اشتہار نقل کر دیئے ہیں مگر یہاں صرف اشتہار اول منظوم کے چند اشعار پر اکتفا کریں گے)

جو مسلمان راہ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضہء خلد بریں ہوگیا واجب اس پر
اے برادر تو حدیث نبویؐ کو سن لے
باغِ فردوس ہے تلواروں کے سائے کے تلے
دل سے اس راہ میں پیسا کوئی دیوے گا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روز محشر
زر بھی گر خرچ کیا اور لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کے عوض سات ہزار
جو کہ مال اپنے سے، غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثل مجاہد کے خدا دے گا ثواب
دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبہ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے
پیشوا لوگ اسی طرح جو کرتے نہ جہاد
ہند پھر کس طرح اسلام سے ہوتا آباد
زور شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کبھی کرتے تو ہوتا گمنام
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹکاؤ گے
اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے
اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو
ملو چل چل کے امام اپنے سے کافر مارو
بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولت بیدار سے مومن بھاگے
تھے مسلمان پریشان بغیر از اسباب
شکر سب تو نے دیا اے میرے ربّ الارباب

آخری شعر میں بدمعاشوں کی طرح الہ آباد کے شریف اور امن پسند شہریوں کے احوال کی غارت گری اور بہادر شاہ ظفر کی طرف بھجوائے جانے والے تیس لاکھ روپے کو نہایت بے دردی سے لوٹ لینے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ "جہاد آزادی" ہے تو ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کس کا نام ہے۔[6]

کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ"

کارل مارکس کے فلسفہ کا شاہکار اسکی کتاب سرمایہ ہے جو عام طور پر جرمن نام - Das Kapital سے مشہور ہے اور اس کے تمام خیالات کا نچوڑ ہے۔ کارل مارکس نے اس کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داروں کا ایک محدود طبقہ معیشت کے تمام وسائل پر قابض ہو جاتا ہے اور سامراجیت کے روپ میں کروڑوں محنت کش طبقے پر حکمرانی کرتا ہے۔ جس سے نجات پانے کے لئے محنت کشوں اور مزدورں کو حکمرانی اور قانون سازی کی طاقت پر قبضہ کرنا ہوگا اور سرمایہ داروں کے ساتھ وہی سیاسی تعلق قائم کرنا ہوگا جو انہوں نے مزدوروں اور محنت کشوں کے ساتھ قائم کر رکھا تھا۔ پہلے سرمایہ دار طبقہ جو سماج میں ایک حقیر اقلیت ہوتا ہے، محنت کار اکثریتی طبقہ پر حکمران تھا۔ سوشلزم کے انقلاب سے مزدوروں کی اکثریت سرمایہ داروں کی اقلیت پر حکمرانی کرے گی جو حقیقی جمہوریت سے زیادہ قریب ہے۔ یہاں تک کہ پوری دنیا میں سرمایہ داریت کا امتیاز مٹ جائے اور سوسائٹی کے تمام افراد معاشی اعتبار سے مساوی ہو جائیں اسی کا نام سوشلزم ہے۔

:ءÍæÇÔ

[1] گئیٹے کی نظم نذر زلیخا (مغرب کا دیوان)۔

[2] "کارل مارکس فریڈرک اینگلس۔ نو آبادیاتی نظام" مضامین اور خطوط کا مجموعہ دارالاشاعت ترقی ماسکو۔

[3] صفحہ 433 ناشر مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی طبع ہفتم اکتوبر 1985ء۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کارل مارکس کے نظریہ "قومی انقلاب" کو بیسویں صدی کے مسلم لٹریچر اور مسلم خطابت کے ذریعہ مقبول بنانے میں جناب ابوالکلام آزاد اور ان کو امام الہند بنانے والے دیوبندی اور کانگریسی احراری علماء نے سب سے زیادہ رول ادا کیا ہے۔

[4] Marx-Engels on Colonialism Masocow, p.35 بحوالہ موسیٰ سے مارکس تک۔

[5] نیویارک ڈیلی ٹریبیون 8 اگست 1955 بحوالہ کارل مارکس فریڈرک اینگلس نو آبادیاتی نظام صفحہ 54-62۔

[6] "تاریخ بغاوت ہند" صفحہ 209 تا 211 طبع دوم 2008ء ناشر بک ڈپو کارپوریشن دہلی نمبر 6 انڈیا۔

چوتھی فصل

اقبال مارکسزم کے علمبردار کی حیثیت سے

سر اقبال نے کارل مارکس کی کتاب کو اسلام کی عملی تشریح سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا۔

نکتۂ شرعِ مبیں ایں است وبس

کس نہ باشد درجہاں محتاج کس

یہی نہیں انہوں نے کارل مارکس کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ ؏

قلب اومومن، دماغش کافر است[1]

سر اقبال نے کارل مارکس کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے ہوئے پہلے تو یہ کہا۔

وہ کلیم بے تجلّی! وہ مسیح بے صلیب

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب![2]

پھر ظلم وستم کی حد یہ ہے کہ چند صفحے بعد انہوں نے اس کے فلسفہ کو ہی اسلام سے موسوم کیا ہے۔ کہتے ہیں:-

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے[3]

سر اقبال کی اصطلاح کے مطابق عہد حاضر کے بانئ اسلام کا نام کارل مارکس ہے جس کا وجود مشرق ومغرب کی قوموں کے لئے چیلنج ہے اور ان کے اس مصرع کا مصداق ہے ؏

توڑدی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

(ارمغان حجاز 218-219)

یہی وہ اقبال کا "مردحق" ہے جس کا ذکر انہوں نے بابی فرقہ کی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کے تذکرہ کے بعد "جاویدنامہ" کے صفحہ 244 پر بایں الفاظ کیا ہے۔

مرد حق از آسماں اُفتد چوبرق | ہیزم اوشہرودشت غرب وشرق

ماہنوز اندر ظلامِ کائنات | اوشریک اہتمام کائنات

او کلیمؑ او مسیحؑ و او خلیلؑ　　او محمدؐ او کتاب او جبرئیل!

آفتابِ کائناتِ اہلِ دل،　　از شعاع اوحیات اہل دل[4]

سر اقبال نے اس "مرد حق" کی نشان دہی اور راہ نمائی کے لئے خبر دار کر دیا ہے کہ اسے مسلم دنیا میں تلاش نہ کرنا کیونکہ مسلمان ذوق وشوق سے عاری، علماء اسلام قرآن سے بے نیاز فرنگی مآب ہیں جو سراب سے چشمہ کوثر تلاش کر رہے ہیں۔[5]

انہوں نے اکتوبر 1936ء کو جبکہ روس کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ انگیزیوں کے ہولناک واقعات منظر عام پر آچکے تھے، خواجہ غلام السیدین ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشنز جموں وکشمیر (سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کو خصوصی مکتوب لکھا۔

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی، جو روحانیت میرے نزدیک معضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"[6]

سر اقبال نے 28 مئی 1937ء کو قائداعظم محمد علی جناح کی خدمت میں بصیغہ راز ایک مکتوب لکھا جس میں لیگ کے پروگرام پر تنقید کی کہ اس نے غریب مسلمانوں کی اصلاح احوال کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ پھر لکھا۔

"جواہر لال کی منکر خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کرسکے گی لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جاسکتی ہے۔ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔"

آخر میں اس کا حل یہ پیش کیا کہ

"اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید وموافقت حاصل ہو۔ حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔"[7]

اقبال نے اشتراکیت اور کارل مارکس کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا۔

اشتراکیت

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہوغوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کوعطا جدّتِ کردار
جوحرف قل العفومیں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہونمودار

کارل مارکس کی آواز

یہ علم حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش!
نہیں ہے دنیا کو اب گوارہ پرانے افکار کی نمائش!
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھاہی کیاہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش! مریزو کجدار کی نمائش!
جہان مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقل عیاّر کی نمائش!

انقلاب

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوزوسازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ،اور وہ ضمیر کی موت!
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت!

اقبال اور سوشلزم کی تائید میں مستقل تصنیف

سر اقبال نے سوشلزم اور کارل مارکس اور لینن کی قصیدہ خوانی کے علاوہ "علم الاقتصاد" کے نام پر ایک مستقل تصنیف بھی شائع کی جو اسلامی معاشیات کی روح کچل کر مارکس اور ہیگلز کے دہریہ نظام کی تعمیر کرنے کی ناپاک سازش تھی جس نے بے شمار مسلمانوں کو اس یاجوجی ماجوجی تحریک کا گرویدہ اور والہ وشیدا بنادیا۔

اس سلسلہ میں پاکستان کے ایک محقق جناب ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا وہ دیباچہ بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے جو انہوں نے "علم الاقتصاد"، کے جدید ایڈیشن (2004ء۔ ناشر سنگ میل پبلیکیشنز لاہور) کے تعارف میں سپرد قلم فرمایاہے۔ آپ تحریر کرتے ہیں:-

"اقبال غیر منصفانہ تقسیم دولت کے تصور سے ناآشنا نہ تھے۔ لگان پر بجٹ کے دوران یوں لکھا:

"جوں جوں آبادی بڑھتی ہے،ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں،جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں،ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں،حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر ان کا کوئی حق نہیں کہ دولت مند ہوتے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی

لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصول انصاف کے خلاف ہے۔“

یہاں اقبال نے واضح الفاظ میں غیر منصفانہ تقسیم دولت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال کے وقت تک مارکس اور اینجلز کی تصانیف نہ صرف عام تھیں بلکہ ان کے نظریات کا چرچا بھی تھا، گو اقبال نے کسی موقع پر بھی ان دونوں کے نام نہیں لئے لیکن مندرجہ بالا بیان کو جس طرح ختم کیا گیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال، مارکس کے تصورات سے آگاہ تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”ان نتائج کو ملحوظ رکھ کر بعض محققین نے بڑے زور و شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جائیداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے، جس کا وجود قومی بہبود کے لئے انتہادرجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکماء کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہیے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ لگان کی یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، سرکار یا قوم کا حق ہے نہ کہ زمینداران کا“

یہاں واضح طور سے اقبال مارکس کے ”زائد قدر“(Surplus Value) کے نظریے کا حوالہ دے رہے ہیں گو انہوں سے اس نظریہ سے وابستہ تمام جزئیات اور امکانات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہ کی۔ اقبال نے ایک اور موقع پر بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے:

”سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کس کا حق ہے ؟ زمیندار کا ہرگز نہیں! کیونکہ اس مصالح میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی جس کو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی تیاری میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار وہی ہے جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کی وجہ سے نسبتاً کم ہوگئی ہے، لہٰذا مصالح مذکورہ کی مانگ میں کوئی تغیر نہ آنے کی وجہ سے ادنیٰ درجہ کی زمینوں کو کاشت میں نہیں لانا پڑتا جس سے لگان یعنی زمیندار کے حصے کی مقدار میں اضافہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ زیادتی ساہوکار کا بھی حق نہیں ہے کیونکہ سرمائے کی مانگ بدستور وہی ہے جو پہلے تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود یعنی ساہوکار کا حصہ نسبتاً بڑھ جائے جبکہ سرمائے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو بلکہ دست کاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا ساہوکار کے حصے کو الٹا کم کرنا ہے۔ کیونکہ کاری گر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی

تیاری کے لئے اس قدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ بھدا کام کرنے والے بے ہنر دستکار کو۔ کاریگر تھوڑے اوزاروں کی مدد سے بھی اپنا کام بخوبی کر سکتا ہے لہٰذا وہ مجموعی طور سے سرمائے کی مانگ کو کم کرتا ہے یا بالفاظ دیگر شرح سود کم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مقدار کو استعمال میں لائے جانے سے بچاتا ہے جو بصورت دیگر اوزاروں کے بنانے میں صرف کرنی پڑتی۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے کیونکہ کارخانہ دار کا حصہ یا منافع صرف اسی صورت میں زیادہ ہو سکتا ہے جبکہ کارخانہ داروں کی مقدار میں زیادتی ہو.... اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ دست کاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا کارخانہ داروں کی زیادتی مقدار کا مستلزم ہو بلکہ دست کاروں کے ہنر اور کاری گری میں ترقی کرنے سے لیاقت انتظامی کا معیار بڑھ جاتا ہے اور وہ دائرہ تجارت سے روز بروز خارج ہوتے جانے کا میلان رکھتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کارخانہ داروں کا منافع کم ہو جاتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے پیدا ہوتی ہے، خود دست کاروں کا حق ہے۔ زمینداروں، ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔"

یہ طویل اقتباس اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں محنت اور منافع کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے کھل کر اس امر پر زور دیا کہ دست کاروں کی محنت کا ثمر ان ہی کے لئے ہونا چاہیے۔ "زمیندار وں، ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔" اقبال نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا، وہ بالکل غیر جذباتی انداز میں علمی معروضیت کے ساتھ لکھا ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ پر اجرت اور منافع کے باہمی تعلق کو اجاگر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا:

"شرح منافع سے یہ ضروری اصول قائم ہوا کہ شرح منافع مصارف پیدائش اور اس مدت کے ساتھ جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو نسبتِ معکوس رکھتی ہے۔"

اسی ذرا سی بات کو نہ سمجھنے کے باعث بعض محققین نے بڑی بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ منافع کی مقدار صرف اسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جبکہ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک کارخانہ داروں اور محنتوں کے

سود وزیاں کے درمیان ایک قسم کا ضروری تناقض ہے یا یوں کہو کہ ایک کا نفع اور دوسرے کا نقصان ہے۔ لیکن.... شرح منافع کی تعیین میں مدت کو بھی بڑا دخل ہے یعنی اگر سرمائے اور منافع کے مقادیر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو تو جس مدت میں منافع کی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اس مدت کے کم ہو جانے یا یوں کہو کہ اشیاء تجارتی کے بہت جلد فروخت ہو جانے سے شرح منافع بڑھ جاتی ہے اور اس مدت کی زیادتی سے شرح منافع کم ہو جاتی ہے۔ خواہ اجرت کی مقدار میں فرق ہو یا نہ ہو....“

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے علامہ اقبال کی سوچ کا رخ عیاں ہے۔ وہ مارکس اور اشتراکیت کا نام نہیں لیتے لیکن یہ طرز استدلال وہی ہے اور ان آراء کے تناظر میں مارکس، لینن اور سرمایہ ومحنت کے موضوع پر لکھی گئی نظمیں ایک نئی جہت اختیار کر لیتی ہیں۔“

سوشلسٹ اقبال کی کہانی

اب اقبالیات کے ماہر جناب عتیق صدیقی کے قلم سے سوشلسٹ اقبال کی کہانی حقائق کی زبانی پیش کی جاتی ہے جس سے ”حکیم الامت“ ”شاعر مشرق“ کے اصل مذہب اور حقیقی پیر و مرشد کی پوری طرح نقاب کشائی ہو جاتی ہے اور اُن کی تضاد بیانیوں کے بنیادی سبب کی بھی نشان دہی ہو جاتی ہے۔8 جناب عتیق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو“

”اقبال کے نام کے ساتھ ”مسلم سوشلسٹ“ کی صفت کا اضافہ آج سے چالیس سال قبل 1938ء میں پروفیسر محمد دین تاثیر نے کیا تھا۔ لیکن اقبال کو اشتراکی اور بالشوک کہنے کی روایت تو نصف صدی سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ خطوط اقبال میں رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کا ایک مراسلہ نقل کیا ہے جو لاہور کے ایک کمیونسٹ اخبار روزنامہ زمیندار کی اشاعت مورخہ 24 جون 1923ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ قصہ ّ بانگ درا کی پہلی اشاعت سے ایک سال پہلے کا تھا۔ اقبال نے اس مراسلے میں اشتراکیت سے اپنی لاتعلقی ہی کا نہیں بلکہ اپنے شدید تنفّر کا بھی اظہار کیا تھا۔ ان کے اس اظہار خیال کا محرک ایک مضمون تھا جو متذکرہ بالا اخبار میں ان کے مراسلے کی اشاعت سے ایک ہی دن پہلے چھپا تھا۔ اس مضمون میں اقبال کو تہمتِ اشتراکیت سے غالباً پہلی بار متہم کیا گیا تھا۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

”اشتراکیت کی حمایت کوئی جرم نہیں ہے.... علامہ اقبال بھی بالشوک خیالات رکھتے ہیں۔ کوئی تھوڑی سیعقل کا مالک بھی سر اقبال کی ’خضر راہ‘ اور ’پیام مشرق‘ کو بغور دیکھے تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ بھی ہیں، پیام مشرق میں قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور، اور نوائے وقت کے عنوان سے اُنھوں نے جو مختصر نظمیں لکھی ہیں.... کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں ہیں؟“

اس مضمون کی شان نزول یہ تھی کہ ان دنوں لاہور میں بالشوک سازش کا ایک مقدمہ چل رہا تھا اور بزرگ پروفیسر غلام حسین بھی اس مقدمے میں ماخوذ تھے۔ ان ہی کے دفاع میں یہ مضمون لکھا گیا تھا اور ان کی وکالت کرتے ہوئے اقبال کو کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ کمیونزم کا مبلغ اعلیٰ بھی کہا گیا تھا۔ اقبال پر اس کا جو ردّ عمل ہوا، وہ حد درجہ شدید اور اسی درجہ دلچسپ بھی تھا۔ جس دن یہ مضمون چھپا اسی دن اقبال کے کسی دوست نے ان سے اس کا تذکرہ کیا تو اقبال کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی اور وہ اس درجہ متوحش اور متردّد ہوئے کہ مضمون بلا دیکھے ہوئے اس کی تردید اُنھوں نے ضروری سمجھی۔ چنانچہ اسی وقت ایک تردیدی مراسلہ اُنھوں نے لکھا جو دوسرے دن کے اخبار میں شائع ہوا۔ اس مراسلے کے ابتدائی اور آخری حصے کے اقتباسات یہ ہیں۔

”میں نے ابھی ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے ابھی اخبار نہیں دیکھا ہے) میری طرف بالشوک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشوک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس لئے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔“

”میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اغراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں ہے کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشوک تجویز کرتے ہیں“....

"مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص، تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائیگی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے.... موجودہ حالات میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین کتنا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولٹیکل اکانمی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کو لازم ہے کہ قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے"....

اس مراسلے کو "خطوط اقبال" میں تمام و کمال نقل کرنے کے بعد رفیع الدین ہاشمی کے ذہن میں قدرتی طور پر سوال تو پیدا ہوا کہ بلا مضمون پڑھے ہوئے اقبال نے اسی روز اور اُسی لمحے ایڈیٹر زمیندار کو خط لکھ کر اس کی تردید (کیوں) ضروری سمجھی۔ اور تردید بھی اتنی مفصل۔ لیکن اس کا جواب ڈھونڈنے کی اُنہوں نے ارادی یا غیر ارادی طور پر کوئی کوشش نہیں کی۔ عبد السلام خورشید نے بھی اپنی ضخیم کتاب "سرگزشت اقبال" میں اس مراسلے کے طویل اقتباسات تو درج کیے لیکن انہوں نے بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ان دونوں حضرات کے گریز کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے جواب سے اقبال کے فکر و عمل کی دورنگی ظاہر ہونے کا امکان تھا۔

اقبال نے اپنی زندگی کے دو خانے بنا رکھے تھے۔ ایک کا تعلق فکر سے تھا اور دوسرے کا عمل سے۔ فکر کی دنیا میں وہ جس درجہ آزاد تھے، عمل کی دنیا میں اُس سے شدید تر بندش بھی اُنہوں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی اور کوئی بھی ایسا اقدام کرنے پر وہ خود کو آمادہ نہیں کر سکتے تھے جس سے حکومت کی چشمِ ابرو پر شکن پڑنے کا بھی احتمال ہو سکتا ہو۔

اپنی زندگی کے مؤخر الذکر خانے کو محفوظ رکھنے کے لئے اقبال نے ارادی طور پر کوشش کی کہ ان کے قارئین کا حلقہ وسیع نہ ہونے پائے۔ اسی کے پیش نظر اُنھوں نے اردو کی جگہ پر فارسی زبان کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ 1932ء میں لندن کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے اردو کی جگہ پر فارسی زبان کو اختیار کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا:

"اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنا شروع کرنے سے متعلق لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں

نے کیوں فارسی زبان میں شعر کہنے شروع کئے۔ بعض اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لئے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا.... ہندوستان میں فارسی جاننے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات باہر پہنچانا چاہتا ہوں، وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں"

اقبال کی زندگی کے اوّل الذکر پہلو نے ان سے ایسی نظمیں کہلائیں جن کی بنا پر ایڈیٹر زمیندار نے ان کو اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا مبلغ اعلیٰ گردانا اور موخر الذکر پہلو نے اس دعوے کی فوری تردید پر اُنہیں مجبور کیا۔ یہ واقعہ جس زمانے میں پیش آیا وہ تھا بھی ہماری تاریخ کا انتہائی نازک دور۔ انقلابِ روس سے قبل برطانوی سامراج کو ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر زارِ روس کے عزائم منڈلاتے نظر آتے تھے۔ انقلاب کے بعد اس کی جگہ بالشوزم کے ہوّے نے لے لی تھی۔ 1923ء میں اقبال کو جب اعلانیہ اشتراکی کہا گیا تھا، اس وقت ہندوستان میں اشتراکی خیالات کے نشوونما کا اور اشتراکی طرز کی مزدور یونینوں کے آغاز کا زمانہ تھا۔ دوسری طرف بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم نے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کا کام برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے سپرد کیا تھا۔ حالات کی اس روش کو حکومت انتہائی پُر تشویش اور غضب ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دارو گیر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ لاہور میں بھی بالشوک سازش کا ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ان حالات میں سراسیمہ ہو کر اقبال کا اشتراکیت سے اپنی بریت ہی کا نہیں بلکہ اس سے شدید اختلاف کا اظہار کرنا ان کی افتاد طبع کے عین مطابق تھا۔ حکومت کو بھی اقبال کے اشتراکی ہونے کا اور اشتراکیت کے مبلّغ ہونے کا اگر یقین ہو جاتا تو ان کی زندگی کے اس پہلو پر سرے سے پانی پھر سکتا تھا جس کی تعمیر میں اُنہوں نے اپنی عوامی مقبولیت کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا اور ان کی وہ نائٹ ہڈ(Knight-hood) بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی جس کے حصول پر ابھی چھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

دوسری طرف اقبال کے دل ودماغ کو روس کے اس انقلاب نے بے طرح متاثر بھی کیا تھا، جو بیسویں صدی ہی کا نہیں، انسانی تاریخ کا بھی اہم ترین واقعہ تھا۔ اس نے روس کی وسیع سلطنت میں جو دنیا کے پانچویں حصے پر پھیلی تھی، زار شاہی کا خاتمہ کر کے پہلی بار محنت کشوں کی حکومت قائم کی تھی۔ اور اس کے اثرات روس ہی تک محدود نہیں رہے تھے بلکہ پہلی جنگ عظیم کی فاتح طاقتیں برطانیہ اور امریکا بھی اس سے لرز اُٹھی تھیں۔ اس انقلاب نے مشرق کے ملکوں خصوصاً ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو نیا حوصلہ بخشا تھا اور اس کی رفتار تیز تر کر دی تھی۔ اقبال کی فکر نے بھی اس انقلاب کو "بطن

گیتی سے آفتابِ تازہ" کے ظہور سے تعبیر کیا تھا اور اسے خوش آمدید کہنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اقبال ہی ہمارے ملک کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے انقلاب روس کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور پرُ جوش انداز میں انقلاب کے نغمے گائے۔ "پیام مشرق" (1923ء) کی اکثر اور بانگ درا (1924ء) کے آخری حصے کی بیشتر نظموں میں اقبال نے، بلا اگر مگر کے جن انقلابی خیالات کا اظہار کیا تھا، ان سے یہ گمان ہونا غلط نہیں تھا کہ "علامہ اقبال بھی بالشوک خیالات رکھتے ہیں.... " اقبال کی طویل اور کامیاب ترین نظم، خضرِ راہ اسی دور کی یادگار ہے جس میں شاعر نے خضر راہ سے ایک یہ سوال بھی کیا تھا:

اور سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اس کے جواب میں خضر نے جن خیالات کا اظہار کیا، انہیں سیدھے سادے الفاظ میں اشتراکی تعلیمات کا نچوڑ کہنا غلط نہ ہو گا، اس کا پہلا بند یہ ہے:

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مُزد یُوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو خیرات
ساحرالموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تُواے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مُسکِرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تُولٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بانگ درا کی اشاعت سے ایک سال قبل،1923ء کے وسط میں اقبال کا فارسی مجموعہ کلام "پیامِ مشرق" کے نام سے شائع ہوا۔اس کے دیباچہ میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ:-

"یورپ کی جنگ عظیم (1914ء تا1918ء)ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذب و تمدن کے خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال نے جس نئے آدم کے ظہور کا مژدہ سنایا تھا، اس نے سوویت یونین میں جنم لیا تھا۔پیام مشرق کی تمام نظموں میں خواہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، جو نیا ولولہ اور نیا آہنگ ملتا ہے، وہ انقلاب روس ہی کی دین تھا۔خضر راہ 1921ء میں کہی گئی تھی۔پیام مشرق کی بیشتر نظمیں بھی اسی زمانے کی ہیں اور ان میں سے اکثر نظموں میں اقبال نے ان خیالات کو واضح تر الفاظ میں بیان کیا ہے جو ہمیں خضر راہ میں ملتے ہیں۔مثال کے لیے یہ شعر لیجیے۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اس کی مکمل تفسیر "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں ملتی ہے۔سرمایہ دار بڑی پُرکاری سے مزدور کو سمجھاتا ہے کہ یہ پُرشور کارخانے، مال و منال اور دنیوی عیش و آرام جو عارضی ہیں اور جن کے حصول میں بڑی دردسری کرنی پڑتی ہے، وہ میں لیے لیتا ہوں اور دوسری دنیا کا ابدی عیش و آرام تمہارے لیے چھوڑتا ہوں۔زمین کے اندر جو کچھ ہے، وہ میرا ہے اور زمین سے لے کر عرش معلّٰی تک جو کچھ ہے، اس کے مالک تم ہو:

غوغائے کارخانۂ آہنگری زمن
گلبانگ ارغنونِ کلیسا ازانِ تو
نخلے کہ شہ خراج برومی نہد زمن
باغِ بہشت وسدرہ وطوبا ازانِ تو

تلخابہء کہ دردِ سر آرد ازانِ من

صہبائے پاکِ آدم وحوّا ازانِ تو

مرغابی وتَذرو و کبوتر ازان من

ظلِ ہما وشہپر عنقا ازانِ تو

ایں خاک وآنچہ درشکمِ اُو ازانِ من

وزخاک تابہ عرشِ معلاّ ازانِ تو

پیام مشرق ہی کے مندرجہ ذیل اشعار میں اقبال نے انقلاب روس کی پوری داستان بیان کی ہے۔زار شاہی کے خاتمے کے ساتھ ہی شہنشاہیت کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔دنیا کے مختلف محنت کش اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے میدان کارزار میں اُتر آئے ہیں۔ روس میں لینن کو جلا وطنی سے آزاد کرا کے سربراہِ مملکت بنا دیا گیا ہے۔ جو باتیں پردہ راز میں تھیں، معلوم عوام ہو چکی ہیں۔ اب باتیں بنانے سے کام نہیں چل سکتا۔ اس کے بعد اپنے ہم وطنوں کو اقبال متنبہ کرتے ہیں کہ زندگی ایک نئ دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ اگر تم نے بصیرت سے کام نہ لیا تو دوڑ میں تم پیچھے رہ جاؤ گے۔

افسر پاد شہی رفت وبہ یغمائی رفت

نے اسکندری ونغمہ دارائی رفت

کوہ کن تیشہ بدست آمد پرویزی خواست

عشرت خواجگی ومحنت لالائی رفت

یوسفی راز اسیری بہ عزیزی بردند

ہمہ افسانہ وافسونِ زلیخائی رفت

راز ہائے کہ نہاں بود، ببازار افتاد

آں سخن سازی وآں انجمن آرائی رفت

چشم بکشائی اگر چشم تو صاحب نظر است

زندگی درپے تعمیر جہانِ دگراست

اسی مجموعے کی ایک نظم نوائے مزدور ہے جس میں مزدور کا یہ احساس پوری شدت سے کارفرما نظر آتا ہے کہ موٹا جھوٹا پہننے والے اور نیم فاقہ زدہ مزدوروں ہی کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے حرام خور کارخانہ داروں کو ریشمی کپڑے اور زروجواہر نصیب ہوتے ہیں۔ اہل کلیسا بھی ہمارے ہی خون سے جونک کی طرح پلتے ہیں اور کاروبار سلطنت بھی ہمارے زورِ بازو سے چلتا ہے اور اس خرابۂ عالم کی ساری رونق ہماری بدولت ہے:

زِمُزدِ بندۂ کر پاس پوش ومحنت کش

نصیب خواجۂ ناکردہ کار، رختِ حریر

زخویٔ فشانی من لعلِ خاتمِ والی

زاشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر

زخونِ من چوزِ لُوفربہی کلیسا را

بزورِ بازوے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستان زگریہء سحرم

شبابِ لالہ وگل از طراوتِ جگرم

اسی نظم کے دوسرے بند میں قدیم نظام کو درہم برہم کرنے اور غارتگرانِ عالم سے انتقام لینے کی محنت کشوں کو دعوت دی گئی ہے:

بیا کہ تازہ نوامی تراودازرگِ ساز

مے کہ شیشہ گدازد بساغرا اندز یم

مغان ودیرِمغاں رانظامِ تازہ دہیم

بنائے میکدہ ہای کہن بر انداز یم

زرہزناں چمنِ انتقامِ لالہ کشیم

بہ بزمِ غنچہ وگل طرحِ دیگر انداز یم

بطوفِ شمع چوپروانہ زیستن تاکے

زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

اس دور میں اقبال کے ذہن پر انقلاب کا تصور جس طرح چھایا ہوا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ غلام رسول مہر اور عبد المجید سالک نے جب محنت و سرمایہ کی آویزش ہی کی بنا پر ظفر علی خاں کے اخبار "زمیندار" سے علیحدگی اختیار کی اور ایک نئے اخبار کی طرح ڈالی تو اقبال نے اس نئے اخبار کا نام "انقلاب" تجویز کیا اور اس کے پہلے شمارے کے لیے خواجہ و مزدور کے عنوان سے ایک نظم بھی کہہ کر دی۔ جس میں سرمایہ داری اور جاگیر داری ہی کے خلاف نہیں بلکہ مذہب کے ٹھیکیداروں کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا تھا۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور ساز لعلِ ناب
از جفائے وہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب! اے انقلاب

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ سادہ دل را برہمن زنّار تاب

انقلاب

انقلاب! اے انقلاب

یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ انقلاب روس سے پندرہ سال قبل اقبال نے اپنی اوّلین تصنیف علم الاقتصاد میں ملکیت کے باب میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان میں بھی کارل مارکس کے افکار کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ مثلاً ایک جگہ اُنہوں نے لکھا ہے:

"تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں ملکیت یا جائیداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا۔ محنت کی پیداوار میں حسب ضرورت سب کا حصّہ تھا۔ ہر شے ہر شخص کی ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی نہیں۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی، نہ چوری کا کھٹکا تھا۔ قبائل انسانی مل کر گزارا کرتے تھے اور امن و صلح کاری (کذا) کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسانی کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر

دیہاتوں میں اس وقت بھی کسی نہ کسی شکل میں مروّج ہے۔زمانہ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔

"جائدادِ شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔لہٰذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بیجا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی و قدرتی اصول مشارکت فی الاشیا کو مروّج کیا جائے اور کچھ نہیں تو ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے۔کیونکہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس میں قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے۔حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز رہی ہے۔ لیکن اس کا مفصل ذکر ہم اس ابتدائی کتاب میں نہیں دینا چاہتے۔

علم الاقتصاد میں جو بات اقبال نے کہی تھی، وہی اُنھوں نے تیس سال بعد بال جبریل کے اس شعر میں بھی دہرائی:

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ 1903ء میں جب اقبال نے علم الاقتصاد لکھی تھی تو اس وقت ان کا ذہن سوشلزم کے اس تصور کو قبول کر چکا تھا جو انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے ایک مکمل فلسفے کی شکل میں پیش کیا تھا۔روس میں مارکس کے فلسفہ کی کامیابی نے اقبال کے سوشلسٹ رجحان کو پختہ کر دیا۔لیکن مارکسیت میں خدا کے وجود سے انکار کا اور مذہب سے تنفر کا پہلو بھی مضمر تھا جو اقبال کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔مگر اس جزوی اختلاف کے باوجود سوشلسٹ خیالات کی ترویج واشاعت بھی وہ کرتے رہے۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سوشلزم کے داعیوں کی طرح اقبال کو بھی سرمایہ داری اور سامراج سے شدید نفرت تھی۔وہ ان دونوں کو انسانیت کے لیے لعنت اور اسلام کی تعلیمات کے منافی سمجھتے تھے۔یہی جذبہ اُنھیں سوشلزم سے قریب لاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ سوویٹ نظام میں اگر خدا کے وجود کا اقرار بھی داخل ہو جائے تو وہ عین اسلام ہو گا۔خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں اقبال یہ سمجھتے تھے کہ "زاویہ نگاہ کی ذرا سی تبدیلی سے اشتراکیت اسلام بن سکتی ہے یا اسلام اشتراکیت ہو سکتا ہے۔"

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کارل مارکس کی مذہب دشمنی کے باوجود اقبال نے کارل مارکس اور اس کی تصنیف، سرمایہ (Capital) کا ہر جگہ محبت وعقیدت سے نام لیا ہے۔ان کے نزدیک مارکس پیغمبر نہ ہونے کے باوجود صاحبِ کتاب تھا:

"نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب"

یہی بات اقبال نے جاویدنامہ میں واضح تر الفاظ میں کہی تھی اور سرمایہ کے مصنف پیغمبر بے جبرئیل کا رشتہ ابراہیم خلیل اللہ سے جوڑا تھا۔ان کے نزدیک کارل مارکس کا انداز فکر تو کافرانہ تھا لیکن اس کا قلب مومن تھا۔اس کے باطل خیالات بھی حق پر مبنی ہیں۔اس میں خرابی بس یہ ہے کہ اس کا فلسفہ زندگی روحانیت سے تہی ہے اور اس کا سارازور اس پر ہے کہ روٹی سب کو برابر ملے:

صاحبِ سرمایہ، ازنسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل اومضمر است
قلب اومومن دماغش کافراست
رنگ وبوازتن نگیرد جانِ پاک
جزبہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبر حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس

اس برصغیر ہند میں سوشلزم کی ترویج واشاعت سے متعلق جو تاریخیں اب تک لکھی گئی ہیں، وہ اگرچہ اقبال کے ذکر سے خالی ہیں، تاہم یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سوشلزم کے تصور کے پرچار کی خدمت اقبال نے بالواسطہ اور براہ راست بھی اس وقت انجام دی تھی جب نہ تو ہمارے ملک کے رہنماؤں میں سے کسی کو باستثنائے حسرت موہانی، اپنے کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ کہنے کی ہمت ہوئی تھی اور نہ کسی پارٹی کے نصب العین میں سوشلزم کو جگہ ملی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا لیکن وہ غیر قانونی تھی اور اس کے بیشتر کارِ کرتا قید وبند کی زندگی گزار رہے تھے۔اقبال نے 1931ء میں اسلام اور بالشوزم کے باہمی ربط سے متعلق ایک خط میں دوٹوک انداز میں لکھا تھا کہ:

"بالشوزم میں خدا کا تصور اگر داخل کر دیا جائے تو وہ بڑی حد تک اسلام کے مماثل ہو جائے گا۔ مجھے حیرت نہ ہو گی اگر آگے چل کر اسلام روس پر یا روس اسلام پر چھا جائے۔"

لاہور کے انگریزی اخبار روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی 30 جولائی 1931ء کی اشاعت میں یہ خط شائع ہو گیا تھا۔ اس کے چھ مہینے بعد ایک اخبار نویس نے اقبال سے ان کے اس خیال کی وضاحت چاہی تو انہوں نے کہا:

"اسلام سوشلسٹ طرز کا مذہب ہے۔ مطلق سوشلزم اور نجی ملکیت کے باب میں قرآن نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے.... میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ آپ جسے بالشوزم اور سامراج کہتے ہیں، عصر حاضر ان دونوں میں بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ علاقائی سلطنتوں کے دن لد چکے ہیں۔ بالشوزم میں بھی مطلق سوشلزم کے معنوں میں ترمیمیں کی جانے لگی ہیں۔ ممکن ہے کہ معاشی نقطہ نگاہ کے اختلاف کی بنا پر روس اور برطانیہ برسرِپیکار ہو جائیں۔ اس حالت میں صحیح فکر رکھنے والوں کی ہمدردیاں حق و صداقت کے ساتھ ہوں گی۔"

1929ء میں اقبال نے روزنامہ زمیندار میں شائع ہونے والے تردیدی مراسلے میں بالشوک خیالات رکھنے والوں کو قطعیت کے ساتھ خارج از اسلام قرار دیا تھا۔ لیکن مندرجہ بالا بیان میں اُنہوں نے اسلام کو سوشلسٹ طرز کا مذہب کہا۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر انہوں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ معاشی نقطہ نگاہ کے اختلاف کی بناء پر روس اور برطانیہ برسرپیکار ہوئے تو ان کی ہمدردی روس کے ساتھ ہو گی۔

یہ دوٹوک بیان دینے کی ہمت اقبال کو اس وجہ سے ہوئی تھی کہ اُس وقت برطانوی سامراج کی گرفت ہندوستان پر ڈھیلی پڑ چکی تھی اور روز بروز کمزور تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اسی صورت حال کا کرشمہ تھا کہ 1934ء میں اقبال کی یہ علانیہ خواہش تھی کہ ملک میں سوشلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان میں پہلی سوشلسٹ کانفرنس 17 مئی 1934ء کو اچاریہ نرندر دیو کی صدارت میں پٹنہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ پارٹی کی ہیئت کا تھا۔ یعنی اس کی شکل باضابطہ جداگانہ پارٹی کی ہو کانگریس کے اندر یا اس کے بازو کی طرح کام کرے۔ کانفرنس میں اس سوال پر ووٹ لیے گئے تو جداگانہ پارٹی کے قیام کے حق میں 22

ووٹ آئے اور اس کے مخالفت میں 58 ووٹ آئے۔ اقبال اس کانفرنس میں شریک تو نہیں ہوئے تھے لیکن ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ سوشلسٹ پارٹی کا ایک جداگانہ وجود ہو اور کانگریس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لیے اس فیصلے سے انہیں دُکھ ہوا لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے انہوں نے اس سلسلے میں ایک طویل بیان جاری کیا جس میں اور باتوں کے علاوہ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ:

"سوشلسٹ پارٹی کو اگرچہ شکست ہوئی ہے لیکن اس کے سامنے مستقبل ہے۔ گو اس کا انحصار زیادہ تر کانگریس سے علیحدگی پر ہے۔"

اسی بیان کے ابتدائی حصے میں اقبال نے ملک کی سیاسی صورت حال کا جو تجزیہ کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکی سیاست کی رفتار کا وہ گہرا مطالعہ کر رہے تھے اور ترقی پسند قومی سیاست کے دھاروں کے ساتھ زیر و زبر ہونے کے لیے وہ تیار تھے۔

"امیروں کے خلاف ملک میں ایک عام جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ نازک مرحلوں پر امیر طبقہ ہمیشہ اُن سے غداری کرتا ہے۔ جو حکومتیں کبھی سرمایہ داری کی پوجا کرتی تھیں، آج مزدوروں اور کسانوں کے رحم و کرم پر جی رہی ہیں۔ سب طرف بے چینی کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیں گی کہ ایک زبردست آگ بن کر دنیا کے موجودہ نظام کو بھسم کر دیں۔"

"جب ساری دنیا میں مساوات کی لہر چل رہی ہے تو ہندوستان کب اس کے اثر سے خالی رہ سکتا ہے۔ یہاں کے غریبوں میں اب بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس وقت تک حکومت اور ہمارے لیڈر اُن کی طرف سے بے پروا رہے ہیں لیکن یہ حالت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ سوسائٹی ایک خطرناک دور سے گزر رہی ہے اور سوشلسٹ خیالات محض روسی پروپیگنڈے ہی کی وجہ سے نہیں پھیل رہے ہیں بلکہ اور بہت سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ملک کی اقتصادی حالت میں تبدیلی کا ہونا لازمی ہے۔"

ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی کے قیام سے اقبال کو اتنی شدید دلچسپی کیوں تھی اور یہ بیان جاری کرنے کی ضرورت اُنہوں نے کیوں محسوس کی؟ ان سوالوں کا اگرچہ کوئی واضح جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن ان کے بیان کے لب و لہجے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا یقیناً غلط نہ ہو گا کہ ملک میں باضابطہ سوشلسٹ پارٹی کا قیام اگر عمل میں آ جاتا اور کانگریس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تو اقبال اس پارٹی میں

اگر شامل نہ بھی ہوتے تو بھی ان کی تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ ضرور ہوتیں۔

سوشلزم کے تصور کو اقبال نے جس حد تک قبول کر لیا تھا اس کا اندازہ بال جبریل سے بھی ہوتا ہے جو 1935ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مجموعے کی تین نظمیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لینن (خدا کے حضور میں) فرشتوں کا گیت اور فرمان خدا (فرشتوں کو)۔ پہلی نظم میں لینن کو بھی مرنے کے بعد خدا کی ذات کے زندہ و پائندہ ہونے پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

اس کے بعد لینن خدا سے سوال کرتا ہے اور یہی سوال پوری نظم کی جان ہے:

اک بات، اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکی رہی یہ بات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اس کے بعد فرشتے جو گیت گاتے ہیں۔ اس سے بھی لینن کی فریاد کی تائید ہوتی ہے:

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گر ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیر و میر و پیر

تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر مال مست

بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

لینن کی فریاد اور گیت سننے کے بعد فرشتوں کو حکم دیتا ہے:

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ امرا کے درو دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے

کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ!

جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کی اس نظم پر خلیفہ عبد الحکیم نے بڑے پُرجوش انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نظم:-

"ایسی ہیجان انگیز اور درد انگیز ہے کہ اس کے جذبے کو بر قرار رکھتے ہوئے اگر روسی زبان میں اس کا موثر ترجمہ ہو سکتا اور وہ لینن کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ بنا دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ سوائے اِس کے کہ ملحد لینن کو اس میں خلل نظر آتا کہ اس میں خدا یہ پیغام اپنے فرشتوں کو دے رہا ہے اور اس کے نزدیک وجود نہ خدا کا ہے نہ فرشتوں کا.... یہ نظم کمیونسٹ مینی فیسٹو (اشتراکی لائحہ عمل) کا لب لباب ہے اور محنت کشوں کے لیے انقلاب بلکہ بغاوت کی تحریک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے تمام معاشی پہلوؤں سے

اتفاق رائے رکھتے تھے۔ سوا اس کے کہ اس تمام تقسیم جدید نے انسانوں کے دل ودماغ پر یہ غلط عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ تمام زندگی مادی اسباب کی عادلانہ یا مساوی تقسیم سے فروغ اور ترقی حاصل کر سکتی ہے۔ . . . "

اقبال کو کمیونسٹ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا لیکن ان کے سوشلسٹ ہونے سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ اقبال کا سوشلزم کا تصور اُسی قسم کا تھا جو آج ہمارا ہے۔ جس میں پبلک سکٹر کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سکٹر کا وجود بھی گوارا کیا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ:-

"اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا. . . . بلکہ اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی بھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔"

اقبال نے اس عقیدے کا اظہار اُس مضمون کے جواب میں کیا تھا جس میں اُن پر بالشوک یا کمیونسٹ ہونے کی تہمت رکھی گئی تھی، اس کے دس سال بعد اُنھوں نے اپنے اسی عقیدے کا اعادہ ایک نجی خط میں بھی کیا جو 9 مئی 1932ء کو لکھا گیا تھا۔

"اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ بڑی مقدار میں سرمایہ میں اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے. . . . بالشوزم نے سرمایہ داری کا کلیتاً خاتمہ کر کے انتہائی اقدام کیا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔"

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اقبال کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس ملک کی بیشتر آبادی جو مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے اس کے مسائل کی نوعیت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس کی تھی۔ اسی احساس کے پیش نظر اُنھوں نے سوویٹ روس کے معاشی تجربے کا دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا اور اس سے وہ متاثر بھی ہوئے تھے۔ محمد دین تاثیر کے بیان کے مطابق اقبال نے یہ بات متعدد بار واضح الفاظ میں کہی تھی کہ اگر مجھے کسی مسلم ملک کا سربراہ بنا دیا جائے تو وہ سب سے پہلے اسے سوشلسٹ ریاست بنائیں گے۔

اقبال کی وفات سے دوڈھائی مہینے پہلے جواہر لال نہروان سے ملے۔ ان کا بیان ہے کہ اقبال:

"زندگی کے آخری برسوں میں سوشلزم سے بہت قریب آگئے تھے۔ سوویٹ یونین نے جو عظیم ترقی کی تھی، اس نے انھیں گرویدہ بنا لیا تھا۔"

یہی بات کانٹول اسمتھ نے دوسرے انداز میں لکھی ہے:

”خدا کی منکر اور روحانیت سے تہی ہونے کے باوجود سوشلسٹ تحریک اور سوویٹ یونین سے اقبال کو ہمدردی تھی۔ اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے دوستوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ سوشلزم کو سمجھنے میں اُنھوں نے غلطی کی ہے۔ وہ اس کی تلافی کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔“[9]

روس میں پہلی سوشلسٹ حکومت کا قیام

16مارچ1917ء کو دنیا کے عظیم ترین صاحب جلال اور پرُ ہیبت بادشاہ نکولس زار روس کو نہایت ذلّت ور سوائی کے ساتھ تخت شاہی سے دستبردار ہونا پڑا۔ 15اگست کو اسے اسکی بیوی الیگزنڈرا اور بچوں کو پیٹروگراڈ کے شاہی محل سے نکال دیا گیا اور سوا سال تک سائبیریا میں قیدی رہنے کے بعد زار اور اسکی فیملی کو نہایت بے دردی اور بے شرمی سے گولیوں سے اڑا دیا گیا اور خدا کے مسیحؑ کی یہ جلالی پیشگوئی پوری ہو گئی کہ۔

ع زار بھی ہو گا تو ہو گا اُس گھڑی باحالِ زار[10]

اس طرح1894ء سے 1917ء تک حکمرانی کرنے والا بادشاہ اپنی زبردست طاقت و سطوت اور بے شمار وسائل کے باوجود ہمیشہ کے لیے صداقت مسیح موعودؑ کا قہری نشان بن گیا۔

زار کی معزولی کے ایک ماہ بعد مشہور سوشلسٹ لیڈر، جو فن لینڈ میں گیارہ سال جلا وطن رہا، پیٹروگراڈ پہنچ گیا اور اکتوبر1917ء میں بالشویکوں نے زار کے جانشین الیگزنڈر کرنسکی سے عنان حکومت چھین لی۔ اس طرح لینن کی قیادت میں پہلی سوشلسٹ حکومت معرض وجود میں آئی۔

حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے اپنے منظوم کلام میں زار کی حالتِ زار سے قبل یہ بھی فرمایا ؏

”اک نشان ہے آنے والا آج سے کچھ دن کے بعد“

اس مصرعہ کے نیچے حضرت اقدسؑ نے تحریر فرمایا ”تاریخ امروزہ15اپریل1905ء“ نیز اگلے شعر کے پہلے مصرعہ میں فرمایا۔

ع آئے گا قہر خدا سے خلق پر اک انقلاب

عجیب بات یہ ہے کہ سوشلسٹ حلقے اکتوبر1917ء کے سانحہ کو ”October Revolution“ کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔ بالشویکوں نے اپنی حکومت کے قیام پر اس یقین کا اظہار کیا کہ اکتوبر کا

انقلاب ایک ایسی چنگاری ہے جو ہر طرف بھڑک اٹھے گا۔ لینن کے مطابق یہ ایسا انقلاب تھا جس کا اثر مستقبل میں چاروں اطراف ہو گا۔[11] انگریز مورخ ایچ جی ویلز H.G Wales کے نزدیک روسی انقلاب ظہور اسلام کے بعد تاریخ عالم کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔[12]

بالشویکی حکومت کی روسی مسلمانوں کے خلاف تباہ کن پالیسی

"روسی انقلاب کا اعلان" ایک بنیادی دستاویز تھی جس پر بالشویکی روس کے پہلے حکمران لینن نے دستخط کئے اور تسلیم کیا کہ روسی مسلمانوں کو ملک کے دوسرے باشندوں کی طرح مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔[13] سٹالن نے اس حقِ خود اختیاری کی تشریح درجِ ذیل الفاظ میں کی۔

> "تمام ملکوں کی سوشل جمہوریت، عوام کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی قوم کی درس گاہوں اور قوانین کو تباہ کرنے اور اس کے رسم ورواج اور عادات وروایات کو مٹانے کے لیے اسکی زندگی میں مداخلت کرے۔"[14]

لیکن اس کے برعکس بالشویکی حکومت نے مسلم آبادی سے اسلام کو ناپید کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مسلمانوں کے مدارس بند اور اوقاف ضبط کر لئے گئے۔ اسلامی شعائر پر پابندی لگا دی گئی اور سمرقند کی جامع مسجد کا وہ مینار جہاں کھڑے ہو کر موذنِ اذان دیتا تھا، گرا دیا گیا اور اس کی جگہ لینن کا ایک بہت بڑا اسٹیچو (Statue) رکھ دیا گیا اور نیچے جو عبارت درج کی گئی اس کا مفہوم یہ تھا کہ آج سے اس مینار سے اذان کی آواز بلند نہیں ہو گی بلکہ مارکس اور لینن کی آواز سنائی دے گی۔[15]

لینن نے 21 جنوری 1921ء کو وفات پائی جس کے بعد سٹالن (Stalin) جیسا جابر وسفاک آمر برسر اقتدار آ گیا۔ سٹالین کا تیس سالہ دور حکومت روز اول سے آخر تک اسلام دشمنی کے خونی واقعات سے رنگین ہے۔

دسمبر 1924ء کا واقعہ ہے کہ اس شخص کی استبدادی حکومت نے جماعت احمدیہ کے ایک صوفی منش عالم دین حضرت مولوی ظہور حسین صاحب کو جو بخارا جیسے قدیم عظیم الشان اسلامی مرکز میں قرآن مجید کا نور پھیلانے کے لئے جا رہے تھے۔ ارتھک اسٹیشن پر گرفتار کر لیا اور پہلے ارتھک اور پھر عشق آباد، تاشقند اور ماسکو کے قید خانوں کی تاریک کوٹھریوں میں ایسی ایسی اذیتیں پہنچائیں کہ جن کا تصور کر کے کلیجہ پھٹ جاتا اور دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا ظہور حسین صاحب نے قید و بند میں بھی قیامت خیز مشکلات کے باوجود پیغام حق پہنچانے کا فریضہ جاری رکھا اور چالیس کے قریب قیدیوں کو احمدی کر کے روس میں حقیقی اسلام کا پودا لگا دیا۔

روسی حکام نے پونے دو سال کے بعد آپ کو ایران کی بندرگاہ بنزلی پر چھوڑ دیا جہاں سے آپ تہران، بغداد، بصرہ اور کراچی سے ہوتے ہوئے 25 اکتوبر 1926ء کی صبح قادیان پہنچ گئے۔ لاہور کے مشہور "اخبار کشمیری" نے 21 اکتوبر 1926ء کو ایک احمدی کا قابل تقلید نمونہ کے زیر عنوان لکھا۔

> "دسمبر کے مہینہ میں جبکہ راستہ برف سے سفید ہو رہا تھا، راستے میں روسیوں کے ہاتھ پڑ گئے۔ جہاں آپ پر مختلف مظالم توڑے گئے۔ تاریک کمروں میں رکھا گیا۔ کئی کئی دن سُور کا گوشت کھانے کے لیے اُن کے سامنے رکھا گیا لیکن وہ سر فروش عقیدت جادۂ استقلال پر برابر قائم رہا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص قید خانہ میں انہیں دیکھنے آیا، ان کی تعلیمات کی بدولت احمدی ہوئے بغیر باہر نہ نکلا۔ اس طرح تقریباً چالیس اشخاص احمدی ہو گئے۔ جو باتیں آج مولوی ظہور حسین سے جیل کے اندر اور جیل سے باہر ظہور میں آئی ہیں، قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں اشاعت مذہب کے لیے ایسی ہی تڑپ ہوا کرتی تھی۔[16]

دین اشتراکیت کا بین الاقوامی تفریحی کلب

بابیت و بہائیت، اشتراکیت کا صرف ہراول دستہ ہی نہیں بلکہ اسکا عالمی تفریحی کلب بھی ہے جس کا ماٹو ہے "**عاشروا مع الادیان کلھا بالروح والریحان**"[17]

اس عربی ماٹو کا اردو ترجمہ ایک بہائی اہل قلم ابوالعباس رضوی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "سب اہل مذاہب کے ساتھ مل جل کر ہنسی خوشی سے زندگی بسر کرو"

اس نصب العین کی روشنی میں اس کلب کی حسب ذیل 9 بنیادی خصوصیات ہیں۔

اوّل۔ ہر مذہب وملّت کے لوگوں سے شادی بیاہ کے تعلقات کی کھلی چھٹی ہے۔ بہائی رسم ورواج کے قائل نہیں۔ ان کا نکاح پادری بھی پڑھ سکتا ہے۔

دوم۔ جنسی تعلقات کے بعد غسل واجب نہیں۔

سوم۔ اگر کوئی بہائی 9 ماہ تک سفر میں رہے تو اس کی بیوی نیا شوہر کر سکتی ہے۔

چہارم۔ تین طلاقوں کے بعد بھی رجوع جائز ہے۔

پنجم۔ماں کے سوا سب عورتوں سے نکاح مباح ہے۔
ششم۔شراب کے استعمال پر کوئی قدغن نہیں نہ سور کے گوشت پر۔
ہفتم۔راگ ورنگ عبادت کا حصہ ہے۔
ہشتم۔لواطت (Homosexuality) ممنوع نہیں۔
نہم۔عورتوں کے لئے مردوں سے پردہ عذاب اور حرام ہے۔[18]

حواشی:

[1] کلیات مکاتیب اقبال جلد اول صفحہ 1026 مرتبہ سید مظفر حسین برنی ناشر اردو اکادمی دہلی اشاعت چہارم 1993ء۔
[2] ارمغان حجاز صفحہ 218۔
[3] ایضاً صفحہ 224۔
[4] جاوید نامہ صفحہ 244۔
[5] ایضاً صفحہ 243۔
[6] اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال حصہ اول صفحہ 318-319 مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار۔
[7] "اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال" صفحہ 13 تا 17 (حصہ دوم)۔
[8] دیکھئے۔"تصوف کی حقیقت" از جناب غلام احمد پرویز شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام گلبرگ روڈ لاہور طبع اول ستمبر 1981ء۔
[9] اقبال جادوگر ہندی نژاد صفحہ 101 تا 121 مصنف عتیق صدیقی۔ناشر مکتبہ جامعہ دہلی طبع اول اگست 1980ء۔
[10] براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ 120۔تصنیف 1905ء۔
[11] بیسویں صدی کا انسائیکلوپیڈیا صفحہ 107 (اعظم شیخ) ناشر علم وعرفان پبلشرز مال روڈ لاہور۔اشاعت جولائی 2002ء۔
[12] کارل مارکس صفحہ 7 از ڈاکٹر احمد حسین کمال ناشر ادارہ ندائے انقلاب 5 بیگم روڈ لاہور اشاعت یکم مئی 1996ء۔
[13] The Formation of The Soviet Union, p.155, Richerd Pipes بحوالہ "روس میں مسلمان قومیں" صفحہ 98 از آباد شاہ پوری ناشر اسلامک پبلیکیشنز شاہ عالم مارکیٹ لاہور طبع ششم اگست 1989ء۔
[14] Modernization of Soviet Asia, p.27, By Agha Shaukat Ali بحوالہ "روس میں مسلمان قومیں" صفحہ 98-99 (آباد شاہ پوری)۔
[15] تاریخ انقلابات عالم حصہ اول صفحہ 604 از ابو سعید بزمی ایم اے۔کتاب منزل لاہور طبع اول 1949ء۔
[16] بحوالہ الفضل 30 نومبر 1926ء صفحہ 3-4۔
[17] یہ ماٹو بہاء اللہ کے جانشین عبد البہاء نے اگست 1911ء میں مغربی دنیا کے سفر کے دوران دیا۔(دیباچہ رسالہ "صلح کل" ناشر بہائی ہال کراچی نمبر 5)۔
[18] الاقدس۔بدائع الآثار جلد 1 صفحہ 23، 158، 380 اشراقات اشراق نہم صفحہ 43۔ناسخ التواریخ جلد 3 طبع ایران (ذکر قرۃ العین) "باب وبہاء را بشناسید" صفحہ 195۔حاجی فتح اللہ مفتون استاد فارسی حیدر آباد دکن۔ملاحظہ ہو کتاب "بہائی مذہب کی حقیقت" (مولف حضرت مولانا فضل الدین صاحب پلیڈر قادیان اشاعت قادیان۔دسمبر 1925ء)

پانچویں فصل

بالشویکی روس کے گہرے اثرات اقبال پر

اقبال بالشویکی روس کے عمر بھر والا وشیدا بنے رہے چنانچہ روس کو الہامی **عظمت** کا مہبط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

بلشویک روس

روش قضائے الٰہی کی ہے عجیب و غریب
خبر نہیں کہ ضمیرِ جہاں میں ہے کیا بات!
ہوئے ہیں کسرِ چلیپا کے واسطے مامور
وہی کہ حفظِ چلیپا جو جانتے تھے نجات!
یہ وحی دھریت روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات!

جناب عتیق صدیقی صاحب اپنی تحقیق و تفحص میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ:-

"برطانوی ہند میں اقبال جس مسلم ہند کا قیام چاہتے تھے، وہ پاکستان کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ زندگی کے آخری چند برسوں میں اقبال کے سیاسی افکار میں ایک اہم انقلاب رونما ہوا۔ **سوشلزم اور سوویٹ یونین سے انہیں اس حد تک دلچسپی ہو گئی تھی** کہ لوگوں نے ان کے لئے اسلامی سوشلٹ کی اصطلاح وضع کر ڈالی۔ اقبال کی شاعری نیز دوسرے مآخذ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عصر حاضر کے انسان کے **معاشی مسائل صرف سوشلزم ہی سے حل ہو سکتے ہیں اور سوشلزم کو وہ عین اسلام سمجھتے تھے**۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی کا قیام ایک مستقل سیاسی پارٹی کی حیثیت سے عمل میں آئے اور جب ایسا نہیں ہو سکا تو اس کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کیا"[1]

سر اقبال اپنے دل میں اشتراکی روس اور سٹالین سے جو بے پناہ محبت پوشیدہ رکھے ہوئے تھے انہوں نے اس کا راز خود ہی افشاء کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے 28 ستمبر 1922ء کو اپنے احمدی برادرِ اکبر،

شیخ عطا محمد صاحب کی خدمت میں بذریعہ مکتوب یہ دلچسپ خبر دی۔

”**روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد ستالین نام ہے۔** لے فن جو پہلا صدر تھا بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا وزیر خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے جس کا نام قرۃ خان ہے.... یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت ان سے بھی زیادہ ہے“[2]

اقبال کے اشتراکی افکار کے خوفناک نتائج

برصغیر کے ادیب سوشلزم کی آغوش میں

1۔ اقبال اپنی ایک فارسی نظم میں ”موسیو لینن“ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

شرار آتش جمہور کہنہ ساماں سوخت

ردائے پیر کلیسا، قبائے سلطاں سوخت

اقبال کی اشتراکی شاعری نے برصغیر کے طول و عرض میں سوشلزم کو فروغ دیا اور بلند پایہ ادیب اور شعراء اس کی آغوش میں چلے گئے۔ اس عبرتناک صورت حال کے لئے جناب انور احسن صدیقی کی کتاب ”نوائے لینن“ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب لینن (ولادت 22 اپریل 1870ء۔ وفات 21 جنوری 1924ء) کی صد سالہ جوبلی پر ٹیکسلا پبلشرز کراچی نے شائع کی۔ اس کتاب میں سر اقبال کے سوشلسٹ خیالات سے متاثر چالیس اردو شعراء کے نمونے دیئے گئے ہیں۔

خدا کا انکار

2۔ خدا کے انکار کے باب میں پنڈت نہرو اور سر اقبال دونوں ہم مذہب تھے۔ لیکن خوش عقیدگی کی حد یہ ہے کہ کئی ہندو نہرو کو دیوتا یقین کرتے ہیں اور ان کو پر میشور کا روپ سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف پرستاران اقبال انہیں خودی کے پیغمبر اور مذہب عشق کا خدا بنا بیٹھے ہیں۔ پاکستان کے ایک شاعر نے قیام پاکستان کے بعد منعقدہ یوم اقبال میں عظمت اقبال پر ایک نظم پیش کی جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

تو ہے دین خودی کا پیغمبر — مذہبِ عشق کا خدا تو ہے

کعبہ عشق کا تو ہے معمار — عقل کے سومنات کا محمود[3]

پنڈت نہرواور اقبال دونوں ہی اپنی روح کے اعتبار سے سوشلسٹ اور پکے دہریہ ہیں۔ پنڈت نہرونے اپنی دہریت کا اعتراف "میری کہانی" میں کیا ہے اور سر اقبال کی ذاتی ڈائری (Stray Reflection) میں صاف لکھا ہے۔

"میرے دوست اکثر مجھ سے سوال کرتے ہیں کیا تم خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہو؟ اگر میرے دوست اپنے سوال کا جواب چاہتے ہیں تو ان کو مجھے پہلے سمجھانا چاہیے کہ یقین، وجود اور خدا بالخصوص آخرالذکر دو لفظوں سے اُن کی کیا مراد ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ان اصطلاحات کو نہیں سمجھتا ہوں۔"[4]

تصوف سے بغاوت

3۔ اقبال فرماتے ہیں۔

"اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سر زمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔"[5]

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کرکے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"[6]

ختم نبوت کی اشتراکی تفسیر اور اسلام سے بغاوت

4۔ بیسویں صدی کا یہ المناک سانحہ ہے کہ سر اقبال نطشے، گوئٹے اور ہیگل کے تو بہترین ترجمان تھے مگر اُن کا مطہر وں کے اس روحانی گروہ سے کوئی تعلق نہ تھا جن پر ربِّ کریم کی طرف سے علوم قرآنی کھولے جاتے ہیں، اُن کا اپنا اقرار ہے:-

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ میری عمر زیادہ تر **مغربی فلسفہ** کے مطالعہ میں گزری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یانادانستہ **میں اسی نقطہ خیال سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔**"[7]

نیز اعتراف کرتے ہیں۔

"میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ پڑھنے میں گنوائی۔"[8]

اور فلاسفروں کی نسبت ان کے مرشد مولانا روم کا پُر معرفت ارشاد ہے کہ۔

فلسفی کو منکر حنّانہ است   از حواس اولیاء بیگانہ است

جو فلسفی (آنحضرتؐ کے فراق میں) گریہ وزاری کرنے والے ستون کا منکر ہے، اولیاء کی باطنی حِسّوں سے بھی بے خبر ہے۔ لہٰذا جسے ولایت کا ادراک نہیں جو نبوت کا پہلا زینہ ہے، وہ مقام نبوت ہی سے بیگانہ ہے اور ایسے بدنصیب کو شان خاتم النبین کا عرفان کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔

مولانا روم نے ختم نبوت کی ایسی ایمان افروز تشریح فرمائی ہے کہ ایک عاشقِ رسولِ عربیؐ کی روح وجد کر اُٹھتی ہے اور دل کی گہرائیوں سے حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درود جاری ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بہر ایں خاتم شد است کہ بجود
مثل اونے بودونے خواہند بود
چونکہ درصنعت برد استاد دست
نے توگوئی ختم صنعت بر تواست

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے خاتم بنے کیونکہ سخاوت میں نہ آپ جیسا کوئی ہوا اور نہ کبھی ہو گا۔ جب کوئی استاد فن کاریگری میں دوسروں سے سبقت لے جاتا ہے تو کیا تم نہیں کہتے کہ یہ صنعت اس پر ختم ہے۔

پھر فرمایا:

در کشادِ ختمہا تو خاتمی   در جہاں روح بخشاں حاتمی9

آپ مُہروں کے کھولنے میں خاتَم ہیں اور روح بخشنے والوں کے جہان میں حاتم ہیں۔

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کیا خوب فرماتے ہیں:

صد ہزاراں یوسفے بینم دریں چاہِ ذقن
واں مسیح ناصری شد از دمِ اُوبے شمار

اب فلسفہ مغرب واشتراکیت کی ٹکسال میں ڈھلی ہوئی جناب اقبال کی خود تراشیدہ تفسیر خاتم النبیین پر نظر ڈالتے ہیں جس کا قرآن وسنت اور بزگان امت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں،

صرف ان کے مغربی اور اشتراکی تخیلات کا خود ساختہ ملغوبہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

A Prophet may be defined as a type of mystic consciousness in which, "unitary experience", tends to overflow its boundaries and seeks opportunities of redirecting or refashioning the forces of collective life. In his personality the finite centre of life sinks into his own infinite depth only to spring up again, with fresh vigour to destroy the old, and to disclose the new directions of life. This contact with the root of his own being is by no means peculiar to man. Indeed the way in which the word Wahy (inspiration) is used in the Quran shows that the Quran regards it as a universal property of Life; though its nature and character are different stages of the evolution of life. The plant growing freely in space, the animal developing a new organ to suit a new environment, and a human being receiving light from the inner depth of life, are all cases of inspiration varying in character according to the needs of the recipient, or the needs of the species to which the recipient belongs. Now during the minority of mankind psychic energy develops what I call prophetic consciousness--a mode of economizing individual thought and choice by providing ready-made judgments, choices, and ways of action. With the birth of reason and critical faculty, however, life in its own interest, inhibits the formation and growth of non-rational modes of consciousness through which psychic energy flowed at an earlier stage of human evolution. Man is primarily governed by passion and instinct. Inductive reason, which alone makes man master of his environment, is an

achievement; and when once born it must be reinforced by inhibiting the growth of other modes of knowledge.

There is no doubt that the ancient world produced some great systems of philosophy at a time when man was comparatively primitive and governed more or less by suggestion. But we must not forget that this system-building in the ancient world was the work of abstract thought which cannot go beyond the systematization of vague religious beliefs and traditions, and gives us no hold on the concrete situations of life. Looking at the matter from this point of view, then the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, as the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot forever be kept in leading strings; that in order to achieve full self-consciousness man must finally be thrown back on his own resources. The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality.[10]

اقبال کے پرستار ملک محمد جعفر خاں (سابق وزیر مملکت برائے مذہبی امور پاکستان 1974ء) نے اس فلسفیانہ تحریر کا حسب ذیل الفاظ میں ترجمہ کیا ہے۔

"نبوت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک طرح کا تصوفانہ شعور ہے جس میں وجدانی تجربہ اپنی حدود سے باہر جانا چاہتا ہے اور اجتماعی زندگی کی قوتوں کی از سرِ نو تشکیل یا اُن کی جدید رہنمائی کے مواقع کا متلاشی ہوتا ہے۔ نبی کی شخصیت میں زندگی کا مرکز اپنی ہی ذات کی لامحدود گہرائیوں میں ڈوب کر تازہ قوت حاصل کر کے اُبھرتا ہے تاکہ قدیم نظام کو ختم کر کے زندگی کی نئی راہیں آشکار کرے۔ کسی ذات کا اپنے اصل کے ساتھ اس طرح کا الحاق انسان کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح قرآن نے لفظ وحی استعمال کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن اس کو زندگی کا ایک عمومی خاصہ قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی نوعیت اور خاصیت زندگی کے مختلف ارتقائی مدارج پر مختلف ہوتی ہے۔ ایک پودے کا آزادی کے ساتھ فضا میں پھیلنا، یا ایک حیوان کا اپنے نئے ماحول کی مناسبت کے لئے ایک نیا عضوبدن پیدا کرنا یا ایک انسانی وجود کا زندگی کی اندرونی گہرائیوں سے روشنی حاصل کرنا.... یہ سب وحی (Inspiration) کی مثالیں ہیں، جن کا اپنی خاصیت باہم اختلاف وحی پانے والے وجود یا اس کی نوع کی ضروریات کے اختلافات کی وجہ سے ہے۔ نوع انسانی کی کم سنی کے دور میں ذہنی قوت وہ شے پیدا کرتی ہے، جسے میں پیغمبرانہ شعور کا نام دیتا ہوں۔ یہ دراصل ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے فیصلہ، ردّ و اختیار اور راہِ عمل کے چند اصول مقرر کر لئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح انفرادی فکر واختیار میں کمی عمل میں لائی جاتی ہے۔ لیکن عقل اور جوہر استنباط کی پیدائش کے ساتھ زندگی اپنے مفاد کے لئے اُن غیر عقلی ذرائع شعور کی نمود اور افزائش کو بند کر دیتی ہے جن میں کہ اس کی ذہنی قوت انسانی ارتقا کے نسبتاً ابتدائی دور میں جاری رہی تھی۔ ابتداً انسان جذبات اور فطری حسیات کے تابع تھا۔ قیاس کرنے والی عقل جو انسان کو اپنے ماحول پر قادر بناتی ہے، ایک حاصل کی ہوئی استعداد ہے۔ اس استعداد کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اس کی مزید تقویت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ علم کے دیگر ذرائع کی مناہی کر دی جائے۔ اس میں شکست نہیں کہ قدیم دنیا نے انسان کے ابتدائی دور میں جب کہ وہ کم وبیش القاء (Suggestion) کے تابع تھا۔ فلسفہ کے بعض اہم سسٹم

پیدا کئے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ قدیم دنیا کا یہ طریق کار نظری خیالات کے عمل کا نتیجہ تھا۔ یہ طریقہ مبہم مذہبی اعتقادات اور روایات کو منظم شکل دینے سے آگے نہیں جاسکتا اور اس سے ہم زندگی کے ٹھوس احوال پر قابو نہیں پاسکتے۔

معاملہ کو اس پہلو سے دیکھتے ہوئے پیغمبر اسلام قدیم اور جدید دنیا کے درمیان کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے پیغام کے ماخذ کے لحاظ سے وہ قدیم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس پیغام کی روح (Spirit) انہیں جدید دنیا سے وابستہ کرتی ہے۔ اُن کی ذات میں زندگی نے اپنی جدید رہنمائی کے لئے مناسب اور پہلے سے مختلف ذرائع علم دریافت کئے ہیں۔ اسلام کی ابتدا قیاسی عقل کی پیدائش ہے۔ میں امید کرتا ہوں اس امر کی نسبت (اس لیکچر) میں آپ کو کافی دلائل سے قائل کرسکوں گا۔

اسلام کے ذریعہ نبوت اپنے خاتمے کی ضرورت کے احساس کے ساتھ اپنے کمال تک پہنچتی ہے۔ اس سے مراد اس امر کا شدید احساس ہے کہ زندگی ہمیشہ کے لئے خارجی سہارے کی محتاج نہیں رہ سکتی اور یہ کہ خود شعوری کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ بالاخر انسان محض اپنی استعداد پر انحصار کرنے لگے۔ اسلام میں مذہبی پیشوائیت اور خاندانی بادشاہت کا خاتمہ اور قرآن میں بار بار عقل اور تجربہ سے خطاب اور اسی طرح اس کتاب کا نیچر اور تاریخ پر بطور ذرائع علم زور دینا۔ یہ سب امور اُسی ایک تصورِ خاتمیت کے مختلف پہلو ہیں۔" [11]

ملک محمد جعفر خاں صاحب کے نزدیک اس پورے فلسفیانہ تخیل کا خلاصہ یہ ہے۔

اوّل۔ "سلطانی جمہور اور ختم نبوت ایک ہی ارتقائی عمل کے دو پہلو ہیں۔" [12]

دوم۔ "ختم نبوت کی تکمیل پر انسان مکمل طور پر آزاد ہے جس طرح راستے پر چلنا اس کے اختیار میں ہے اسی طرح Sign Post قائم کرنا بھی اس کا اپنا کام ہے۔ جو خیال اس صورتحال کے خلاف ہے۔ وہ لازماً اس حد تک نظریہ ختم نبوت کے خلاف ہے۔" [13]

سوم۔ "دنیا عقلیت کے دور میں داخل ہو چکی ہے اور ایسا کرنے میں انسان نے خدا سے کوئی بغاوت نہیں کی بلکہ وہ عین اس راہ پر چل رہا ہے جو خدا نے شروع سے ہی مقدر کر رکھا تھا۔" [14]

اقبال کی اس فلسفیانہ تحریر نے یہ عقدہ حل کر دیا کہ کارل مارکس کے نظریہ سلطانی جمہوریہ اور اس کے Sign Post پر اُن کا ایمان سیاسی یا معاشی زاویہ نگاہ سے نہیں تھا بلکہ آیت خاتم النبیین نے

انہیں یہ راہ دکھائی۔ **لہٰذا سوشلزم کے سامنے سر جھکانا تصور ختم نبوت کا لازمی تقاضا ہے** اور ایسا کرنے میں انہوں نے ختم نبوت سے بغاوت نہیں کی بلکہ "وہ عین اس راستے پر چل رہے ہیں جو خدا نے شروع ہی مقدر کر رکھا تھا اور یہی نظام کائنات کی ارتقائی شکل ہے۔" اب اگر باریک نظر سے مطالعہ کیا جائے تو قرۃ العین کی تقریر بدشت کانفرنس اور سر اقبال کی مذکورہ تحریر دونوں ہی سلطانی جمہور کے چشمہ سے نکلے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ **قرۃ العین نے سوشلزم کی تائید سے پہلے قرآن مجید کی منسوخی کا اعلان ضروری سمجھا** مگر فلسفی اقبال نے کارل مارکس اور اس کی معاشی تھیوری سے محبت وعقیدت کی بنیاد ختم نبوت کے اپنے فلسفیانہ تصور پر رکھی جس سے بڑھ کر قرآن واسلام سے بغاوت کیا ہوگی؟

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را مے شناسم

حواشی:

1 "اقبال" صفحہ 15-16 از عتیق صدیقی مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ اگست 1980ء۔
2 کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ 392۔ از سید مظفر حسین برنی اردو اکادمی دہلی اشاعت 1993ء۔
3 مقالات یوم اقبال صفحہ 157 قومی کتب خانہ لاہور۔ جنوری 1948ء۔
4 اردو ترجمہ صفحہ 53 از ڈاکٹر عبد الحق شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ناشر بزم احباب دہلی مارچ 1975ء۔ جمال پریس جامع مسجد دہلی۔
5 کلیات مکاتیب اقبال جلد اول صفحہ 673 مرتب سید مظفر حسین برنی۔ ناشر اردو اکادمی دہلی اشاعت چہارم 1993ء۔
6 کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ 94 مرتب سید مظفر حسین برنی۔ ناشر اردو اکادمی دہلی اشاعت دوم 1993ء۔
7 اقبال نامہ حصہ اول صفحہ 46-47 ناشر محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔
8 کلیات مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ 157 ناشر اردو اکادمی دہلی اشاعت دوم 1993ء۔
9 دفتر ششم مثنوی مولانا روم (ناشر ادارہ الفیصل) اردو بازار لاہور۔ جلد ششم صفحہ 30 اشاعت 1976ء۔
10 "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" صفحہ 125-126۔ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور 1999ء۔
11 "احمدیہ تحریک" صفحہ 348 تا 350۔ ناشر سندھ ساگر اکادمی۔ چوک مینار انار کلی لاہور۔
12 ایضاً صفحہ 375۔
13 ایضاً صفحہ 378۔
14 ایضاً صفحہ 387۔

چھٹی فصل

ابوالکلام آزاد، عالمی سوشلسٹوں سے روابط اور پارٹی میں شرکت

یہ سنسنی خیز انکشاف برصغیر بلکہ پوری دنیا کو ورطہء حیرت میں ڈال دے گا کہ 1905ء میں سر اقبال کی ابوالکلام آزاد سے پہلی ملاقات ہوئی۔[1] اور اسی سال جناب آزاد (ولادت 22 اگست 1888ء۔ وفات 22 فروری 1958ء) بنگال کے ہندوؤں کی دہشت گرد اور باغیانہ تحریک میں شامل ہوئے اور ہندو کانگرس کے ممبر[2] کی حیثیت سے فلسفہ کارل مارکس پر عمل پیرا ہونے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ سوشلسٹ اصطلاح کے مطابق یہ ”انقلابی“ تھے اور ان کی تنظیم کا نام انڈین ایسوسی ایشن تھا جسے جلد ہی غدر پارٹی کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ چنانچہ حکومت ہند کی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جامع اردو انسائیکلوپیڈیا جلد دوم صفحہ 285-286 میں لکھا ہے:

”بیسویں صدی کے شروع میں کینیڈا اور امریکہ کے مغربی حصوں میں آباد کاری ہو رہی تھی اور وہاں کام کرنے والوں اور مزدوروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم سے ذرا پہلے پنجاب کے بہت سے لوگوں نے کینیڈا کا رخ کیا اور بہت سارے کیلئے فورنیا جابسے۔ جب یہاں اُن سے سخت برتاؤ ہونے لگا تو اُن کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ان ہندوستانیوں نے ہندی ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ بعد میں اس کا نام بدل کر غدر پارٹی کر دیا گیا۔

غدر پارٹی کے پہلے صدر بابا سوہن سنگھ بھکنا اور سیکرٹری لالہ ہردیال چُنے گئے۔ اس پارٹی نے نہ صرف کینیڈا اور امریکہ کے ہندوستانیوں کو منظم کیا بلکہ پیسے اور ہتھیاروں سے ہندوستان کی جنگ آزادی کی خاص طور پر انقلابی تحریکوں کی مدد بھی شروع کی۔ اس کا صدر مقام سان فرانسسکو میں قائم کیا گیا اور ایک رسالہ غدر بھی شروع کیا گیا۔ 1913ء میں اس کا پہلا شمارہ اردو میں نکلا اور 1914ء میں اس کا پنجابی ایڈیشن بھی نکلنے لگا۔[3] فروری 1914ء میں غدر پارٹی کی پہلی کانفرنس اسٹاکٹن میں ہوئی اور س کی شاخیں امریکہ کے علاوہ کینیڈا، پناما اور چین میں بھی قائم کی گئیں جہاں ہندوستانیوں کی آبادی موجود تھی۔[4] جناب ابوالکلام آزاد[5] جدید علماء میں سے ایک ذہین و فطین انسان تھے جنہیں حق تعالیٰ نے تقریری اور تحریری صلاحیتوں سے حصہ وافر بخشا تھا۔ اور وہ بچپن ہی سے غیر معمولی دماغ اور بلا کا حافظہ لے کر آئے تھے۔ مگر جیسا کہ حضرت مصلح موعود کو الہاماً بتایا گیا؎ ”وائے بر علمے کہ برباد کند عالم را“۔

اُن کا علمی مقام ہی انہیں لے ڈوبا اور ان کا وجود ہندی مسلمانوں کو سوشلزم اور آل انڈیا نیشنل کانگرس کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی کا موجب بن گیا۔ حتّٰی کہ کانگرسی علماء کی طرف سے انہیں "امام الہند" کا خطاب دے دیا گیا۔

1905ء میں عالمی مسلح بغاوتیں

1905ء کا سال سوشلزم اور اس کے عالمی ایجنٹوں بالخصوص ہندوستان کے مسلح انقلابیوں یعنی سوشلسٹوں کے لئے نہایت درجہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اسی سال 12 اپریل 1905ء کو لندن میں سوشلسٹوں کی پہلی حقیقی بالشویک پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس کے ایجنڈا میں مسلح بغاوت اوّل نمبر پر شامل تھی۔[6] سوشلسٹ چونکہ سمجھتے تھے کہ تشدد اور خانہ جنگی اور بغاوت کے ہتھکنڈوں کی کامیابی کا سارا مدار عوام کی حمایت پر ہوتا ہے لہٰذا اُسکے انقلابی لیڈروں نے پہلے روس میں عوامی حمایت کی کی ایک مہم چلائی جو پہلے عام سیاسی ہڑتال ہوئی۔ پھر خونی فسادات کے ذریعہ بغاوت کا آغاز کیا گیا جو اگرچہ ناکام ہوئی مگر اس سے سوشلسٹوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ روس پر اقتدار کی منزل کو قریب تر کرنے میں سرگرم ہوگئے۔ چنانچہ سوشلسٹ مفکر و مورخ ایلن وڈز نے بالشوازم راہ انقلاب میں اس بغاوت کی تفصیلات پر تیز روشنی ڈالی ہے۔ اور لکھا ہے بغاوت انقلاب کا ایک اہم حصہ ہے۔[7] نیز اعتراف کیا ہے کہ وہ نظری، سیاسی اور تنظیمی آلہ کار جن کی بدولت بالشویک پارٹی نے اکتوبر 1917ء میں محنت کشوں کو فتح سے ہمکنار کیا تھا وہ 1905ء کے انقلاب کی بھٹی کی حِدّت میں تیار ہوئے تھے۔[8]

1905ء کی فل ڈریس ریہرسل کے بغیر اکتوبر 1917 کے انقلاب کی فتح ناممکن تھی۔[9]

12 اپریل 1905ء کو لندن بالشویک پارٹی نے مسلح بغاوت کی تجویز پاس کر کے ہڑتالوں، مظاہروں، فسادات اور سب سے بڑھ کر بغاوت کا سگنل دے دیا تھا۔ اس لئے اُس کا ردعمل صرف روس میں ہی نہیں بلکہ اس کے اثرات یورپ کے علاوہ ایشیا کے ممالک پر بھی ہوئے۔ چنانچہ روسی مفکر ایلن وڈز لکھتے ہیں۔

> "1905ء کے انقلاب کے گہرے بین الاقوامی اثرات بھی مرتب ہوئے....
> روس کے انقلاب کے اثرات محض یورپ تک ہی محدود نہ رہے تھے بلکہ **اس نے نوآبادیاتی اقوام کی انقلابی تحریکوں کو آگے بڑھانے میں بھی اپنا کردار ادا کیا تھا۔**
> دسمبر 1905ء میں بورژوا انقلاب کا تجربہ شروع ہوا جو 1911ء میں اپنے نقطۂ عروج تک پہنچا۔

1905ء میں چین بھی بورژوا ڈیموکریٹ سین یات سین کے نام سے منسوب عوامی تحریک کے کرب سے گزر رہا تھا۔ وقت آنے پر اس نے 1911-1913ء کے چین کے بورژوا انقلاب کی راہ ہموار کی تھی۔ ترکی میں بھی ایک انقلابی تحریک کو ابھار ملا۔ ایک پُرسکون تالاب میں پھینکی گئی ایک بھاری چٹان کی طرح روس کے انقلاب نے بھی ایسی بڑی بڑی لہروں کو جنم دیا جن میں انتہائی دور دراز کے ساحلوں تک پہنچنے کی صلاحیت تھی۔"[10]

ہندوستان میں بنگالی ہندوؤں کی بغاوت

لندن بالشویک کانگرس کے نئے باغیانہ پروگرام پر روس کے بعد جن ممالک نے سب سے نمایاں مفسدانہ کردار ادا کیا وہ ہندوستان تھا۔ جس کے شورش پسند ہندوؤں نے 1905ء میں بیک وقت برٹش گورنمنٹ اور بنگال کے مفلوک الحال مسلمانوں کے خلاف ایجی ٹیشن جاری کر دی۔ بنیاد اس غنڈہ گردی کی یہ تھی کہ لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا فیصلہ کر کے ہندوؤں کے مفاد پر ضرب کاری لگائی ہے اور مسلمانوں کے لئے ایک نیا صوبہ بنا کر ہمارے رام راج کے لئے شدید خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک ہندو تاریخ دان ودیا دھر مہاجن ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی سابق پروفیسر تاریخ پولیٹیکل سائنس پنجاب یونیورسٹی کالج دہلی تحریر کرتے ہیں۔

"Unmindful of the reactions of the people, Lord Curzon partitioned Bengal into two parts in 1905. Most probably, his object was to create a Muslim-majority province. The people of Bengal considered the partition to be a subtle attack on the growing solidarity of Bengal nationalism. According to A.C. Mazumdar, the object of Lord Curzon in partitioning Bengal was not only to relieve the Bengali administration but to create a Mohammedan Province where Islam could be predominant and its followers in ascendancy. The people of Bengal felt that they had been humiliated, insulted and tricked. There was a

vigorous agitation for the repeal of the partition of Bengal and the result was that the same was cancelled in 1911."[11]

آل انڈیا نیشنل کانگرس کی بنیاد 1885ء میں ایک انگریز مسٹر ہیوم اور ایک ہندو سر نیدرانا تھ بنیر جی نے رکھی۔[12]

تقسیم بنگال پر ہندوؤں کا غیظ و غضب

مسٹر وی ڈی مہاجن نے تقسیم بنگال پر ہندوؤں کے اس غیظ و غضب اور اشتعال کا دوبارہ ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کے اکثریتی صوبہ کے وجود میں آنے پر رد عمل کے طور پر ہوا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"Partition of Bengal and Its Effects

As regards the partition of Bengal, Lord Curzon was of the view that its boundaries were unscientific and required re-adjustment. According to Fraser, no other Provincial administrator in India has so large a charge and it was completed by the obstacles to rapid travel. A dispatch written at the time stated that if the Lieutenant-Governor of Bengal spent the whole of the available season of the year in touring he could only succeed during his term of office, in visiting a portion of his vast Province. According to the Calcutta Review, Partition of the unwieldy Province of Bengal was long a crying administrative necessity admitted by all those who knew anything about the difficulty of officials However, the real object of the partition of Bengal was the desire of the foreign rulers to strike a nail in Bengal nationalism by dividing its forces. According to G.N.Singh, It was to drive a wedge between the two communities (Hindus and Muslims) and to create a new Mohammedan Province in which the Government was to be conducted on the basis of creedal differences. By setting up a separate

Muslim Province of Eastern Bengal, the Government of India wanted to reward the Muslims for their defiance of British authority. The people of Bengal took up the challenge of Lord Curzon and started an agitation for cancellation of the Partition, and the same was ultimately done in 1911."[13]

مسٹر ودیادھر مہاجن مسلمانان ہند کی دردناک صورت اور لرزہ خیز بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"The English were the successors of the Muslim rulers in India, and no wonder, on the eve of British expansion in this country, the Muslims occupied all places of profit, prestige and influence. When that power was snatched away by the British, there was no love lost between the Muslims and the British. The latter also followed a policy of crushing completely the Muslims. According to Mohammad Norman, "The British people had decided that for the expansion of the new power and its continuance, the only source was to crush the Mussalmans and had deliberately adopted policies which had for their aim the economic ruin of Muslims and their intellectual stagnation and general degeneration." (Muslim India)

Condition of Muslims before 1871

It is pointed out that the Permanent Settlement of Bengal "elevated the Hindu collectors who up to that time had held but unimportant posts, to the position of land-holders, gave them proprietary right in the soil and allowed them to accumulate wealth which would have gone to the

Mussalmans under their own rule." The Muslims were not welcomed into the service of the English East India Company. It is stated that between 1852 and 1862, out of 240 natives admitted as Pleaders of the High Court, there was only one Muslim. In certain cases, the British Government clearly stated that the jobs were only to be given to the Hindus and not to the Muslims. The education policy of British Government was" responsible for the increase of unemployment and the closing of other avenues for the Muslims. The economic policy impoverished the Indian Muslims. In the Army, their recruitment was limited; in arts and crafts they were crippled and rendered helpless. The result of these policies was the catastrophe of 1857, which no human policy could have averted".

Even before the Mutiny of 1857, the Muslims had revolted against the British government under the Wahabi leaders. It is true that the Wahabi Movement in India was primarily a religious movement, but it was also a proletarian and revolutionary movement. The Wahabi leaders stirred the Muslims of India and a wave of enthusiasm swept over the whole country. The Movement was ruthlessly suppressed by the British Government but it manifested itself in the form of the Mutiny. The prime movers in the Mutiny of 1857 were the Muslims and those Muslim were undoubtedly Wahabis. As the British considered the Muslims to be responsible for the Mutiny, they were treated very severely after 1858. In 1871, out of total of 2,141 persons employed

by the Bengal Government, there were only 92 Muslims, 711 Hindus and 1,338 Europeans. This state of affairs continued up to the 1870's. It was then that a change took place in the attitude of the British Government towards the Muslims. Sir William Hunter's book entitled " The Indian Mussalmans" which was published in 1871, marks the beginning of the change. It was contended that the Muslims were too weak for rebellion. "It was expedient now to take them into alliance rather than continue to antagonise them".[14]

مورخ پاکستان جناب پروفیسر احمد سعید صاحب نے اپنی مشہور و معروف تالیف ”حصول پاکستان“ (صفحہ 66 تا 70) میں تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی ایجی ٹیشن اور مسلمانوں کے ردِّ عمل کا بڑی شرح وبسط سے تجزیہ کیا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

”لارڈ کرزن کے دورِ حکومت میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جس کی بناء پر اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ اگرچہ بنگال کی تقسیم 1905ء میں عمل میں آئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقسیم کا سوال کرزن کے زمانے کی پیداوار نہیں بلکہ یہ مسئلہ 1853ء سے چلا آتا تھا۔ اس سال سر چارلس گرانٹ نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ 1854ء میں لارڈ ڈلہوزی نے بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر پر بے حد انتظامی بوجھ کی شکایت کی۔ 1866ء میں اڑیسہ میں رونما ہونے والے قحط کے اسباب معلوم کرنے والی کمیٹی نے بھی اس بے حد وسیع و عریض صوبے کی حدود کا از سر نو تعین کرنے کی سفارش کی۔ 1872ء میں لیفٹیننٹ گورنر بنگال سر جارج کیمپبل نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ایک شخص صوبہ بنگال کے انتظامات کو احسن طریقے سے سرانجام نہیں دے سکتا۔[15]

تقسیم کی وجوہات

1903 میں ہندوستان کے اس سب سے وسیع و عریض صوبہ جس کی آبادی سات کروڑ اسی لاکھ اور رقبہ 189000 مربع میل تھا، کا انتظام صرف ایک لیفٹیننٹ گورنر چلاتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے انتظامات کا احسن طریق پر چلانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی مصروفیتوں کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی پانچ سالہ مدت ملازمت میں ڈھاکہ اور چٹاکانگ جیسے اہم علاقوں کا دورہ صرف ایک ہی مرتبہ

کر سکتا تھا۔ اور مشرقی بنگال کے دیگر علاقے حکومت کی توجہ سے یکسر محروم رہتے۔ ان مسائل کے حل کی خاطر بنگال کی تقسیم عمل میں آئی۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کا فیصلہ کسی اور وجہ سے کیا۔ ہوا یوں کہ حکومت ہند نے اُڑیا زبان (Uria) بولنے والوں کو جو کہ مختلف صوبوں میں آباد تھے، ایک انتظامیہ کے تحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر انیڈر یو فریزر نے 1901ء میں یہ مشورہ دیا کہ سنبھل پور کو اڑیسہ کے ساتھ ملا کر اسے بنگال کی انتظامیہ کے ماتحت کر دیا جائے یا پھر تمام اڑیسہ کو سی پی کے حوالے کر دیا جائے۔ 1901ء میں سی پی کے چیف کمشنر نے اسے ڈسٹرکٹ سنبھل پور کی ذمہ داری سے فارغ کرنے کی درخواست کی۔ اسی دوران حکومت مدراس نے بھی اپنے انتظامی معاملات کے بارے میں شکایت کی کیونکہ اس کے زیر انتظام نظم و نسق میں مختلف زبانیں تامل، اڑیا اور ملیالم زیر استعمال تھیں۔ چونکہ اس مسئلہ کے حل کی خاطر یہ تجویز کیا گیا کہ تمام اُڑیا بولنے والوں کو بنگال کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ لہٰذا بنگال کے انتظامی معاملات میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ چنانچہ ڈھاکہ، میمن سنگھ اور چٹا گانگ کو آسام کے ساتھ ملانے کا فیصلہ کیا گیا۔

1903ء کے آخر میں جب بنگالیوں کو اس تنظیم نو کا علم ہوا تو انہوں نے ان علاقوں کو آسام جیسے پسماندہ علاقے کے ساتھ ملحق کرنے پر زبردست احتجاج کیا کیونکہ ان کے خیال میں ایسی صورت میں اس علاقے کے لوگ ان تمام سہولتوں سے محروم ہو جائیں گے جو ایک لیفٹیننٹ گورنر کے صوبے کو حاصل ہوتی تھیں۔

فروری 1904ء میں لارڈ کرزن نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا جہاں اس نے ڈھاکہ، چٹا گانگ اور میمن سنگھ میں لوگوں کو یقین دلایا کہ حکومت اس نئے مجوزہ صوبے کو بڑا کر کے وہاں ایک قانون ساز اسمبلی اور بورڈ آف ریونیو قائم کرے گی۔ نیز ڈھاکہ کو نئے صوبے کا دارالحکومت بنا کر وہاں ایک لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا جائے گا۔ چنانچہ انتظامی مسائل کے حل کی خاطر اس وسیع و عریض صوبے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان 20 جولائی 1905ء کیا گیا اور 16 اکتوبر 1905ء کو نیا صوبہ معرضِ وجود میں آ گیا۔ اس نئے صوبے کا رقبہ 106500 مربع میل اور کل آبادی 31 ملین تھی جن میں دو تہائی مسلمان تھے۔ صوبے میں آسام، مشرقی اور جنوبی بنگال، چٹا گانگ، ڈھاکہ، راجشاہی اور مالدہ ڈسٹرکٹ شامل کئے گئے۔ ڈھاکہ نئے صوبے کا دارالحکومت قرار پایا۔ صوبے کے لئے ایک قانون ساز اسمبلی اور بورڈ آف ریونیو قائم کئے گئے۔۔۔۔

ہندوؤں کی مخالفت

1903ء میں جب ہندوؤں کو صوبے کی تقسیم کی تجویز کا علم ہوا تو انہوں نے احتجاج کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس احتجاج کا مرکز کلکتہ تھا۔ اس نئے مسلم اکثریتی صوبے میں ہندوؤں کو اپنی اجارہ داری کا خاتمہ نظر آیا۔ کلکتہ کے ہندو وکلاء کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ ڈھاکہ میں ہائیکورٹ کے قیام کے بعد نہ صرف ان کی وکالت متاثر ہو گی بلکہ ان کے سیاسی مفادات کو بھی نقصان پہنچے گا۔ کلکتہ کے بنگالی اخبارات جن کے مالک تمام تر ہندو تھے، اس مخالفت میں پیش پیش تھے کیونکہ ان کو یہ تشویش لاحق ہو گئی کہ ڈھاکہ سے مسلم اخبارات کے اجراء سے ان کی اپنی اشاعت متاثر ہو گی۔ اخبار دی بنگالی (ایڈیٹر سریندر ناتھ بیز جی) اور امرت بازار پتریکا (ایڈیٹر ایس کے گھوش) اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔

ہندو زمیندار اور جاگیر دار جن کی زمینیں تو مشرقی بنگال میں تھیں لیکن وہ خود کلکتے میں رہائش پذیر تھے، کو تقسیم کی صورت میں اپنی سیاسی اور جاگیر دارانہ برتری کا خاتمہ نظر آیا۔ غرض ہندوؤں کا ہر طبقہ جس کا مفاد جس قدر زیادہ خطرہ میں پڑتا نظر آتا تھا وہ اتنا ہی تقسیم کی مخالفت میں سرگرم تھا۔ اصل میں تقسیم بنگال سے تمام ہندو قوم کا مفاد خطرے میں پڑ گیا تھا جو تقسیم سے بدیں وجہ خائف تھے کہ اب اس صوبہ کے مسلمان برسوں سے غصب شدہ حقوق کی بازیابی کے لیے جد وجہد کریں گے۔ اسی خطرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاسم بازار کے ایک ہندو لیڈر مہندرا چندر نے تقسیم کے خلاف تقریر کرتے ہوئے کہا کہ **"اس نئے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی اور بنگالی ہندو اقلیت میں ہو جائیں گے۔ ہم اپنے ہی شہر میں اجنبی بن جائیں گے۔ میں اپنی قوم کے بارے میں تشویش محسوس کرتا ہوں۔"**

ہندوؤں نے 16 اِکتوبر کا دن یوم سیاہ کے طور پر منایا۔ کلکتہ میں ہندوؤں نے سیاہ کپڑے پہنے۔ اپنے ہاتھوں میں خاک ملی، کاروبار بند کر دیا گیا، مرن برت رکھے گئے، سریندر ناتھ بیز جی نے تقسیم کو "بم کا گولہ پھٹنے" سے تشبیہ دی۔ تقسیم بنگال کے خلاف تحریک کو موئثر بنانے اور مذہبی جذبات کو اُبھارنے کے لیے کہا گیا کہ تقسیم سے "کالی ماتا" کی توہین ہوئی ہے اور تقسیم نے "بنگالی نیشنلزم" پر کاری ضرب لگائی ہے۔ کانگریس جو کہ تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ ہونے کی دعویدار تھی، تقسیم کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔

سودیشی تحریک

ہندوؤں نے اپنی تحریک کو موثر بنانے کی خاطر 17 اگست 1905 کو سودیشی تحریک کا آغاز کیا

جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کیا جائے۔ تا کہ ایک تو ہندو صنعت کی سرپرستی ہو اور دوسرے برطانوی کارخانہ دار بائیکاٹ کی صورت میں اپنی حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر سکیں۔

اس تحریک کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں کہیں بھی ولائتی کپڑا ہاتھ آجاتا، اس کو آگ لگا دی جاتی۔ طلبا اپنے ان دوستوں پر جو ولائتی کپڑا استعمال کرتے، حملہ کر دیا کرتے۔ طلبا نے ولائتی کاغذ پر امتحان دینے سے انکار کر دیا۔ مانچسٹر چیمبرز آف کامرس کو تار دیا گیا کہ اگر وہ برطانوی کپڑا بیچنا چاہتے ہیں تو انہیں تقسیم بنگال ختم کرانے میں مدد دینی چاہیے۔[16]

تقسیم کے خلاف تمام بنگالی ہندوؤں نے حصہ لیا۔ چنانچہ ایک لطیفہ مشہور ہو گیا کہ تقسیم کے خلاف تحریک میں حصہ لینے کے سبب ہر بنگالی مقرر بن گیا اور جو باقی رہ گئے وہ پروفیشنل صحافی بن گئے۔ آہستہ آہستہ تحریک کا رخ مسلمانوں کی جانب موڑ دیا گیا۔ ہندو اخبارات نے کھلم کھلا مسلمانوں کو دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا جاتا۔ روزانہ یہ الزام لگایا جاتا کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو ہندوؤں پر حملہ کرنے کے لئے اکسا رہی ہے لہٰذا مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لینے چاہئیں۔ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ جب تک تمام غنڈوں (مسلمانوں) اور سرکاری افسر جو ان کی مدد کر رہے ہیں، کو زندہ نہیں جلا دیا جائے گا، اس وقت تک مسلمانوں کے خلاف بدلہ لینے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو گی۔[17]

مسلمانوں کے خلاف نفرت کو ادب اور ڈراموں کے ذریعہ پھیلایا گیا۔ بنکم چندر چیڑجی اس دور کا مقبول ترین مصنّف تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے میں وہ اپنا کوئی حریف نہیں رکھتا تھا۔ اس دور کی ''ہندو ذہنیت'' کی بہترین عکاسی تقسیم بنگال کے خلاف ہندو تحریکوں کے عینی شاہد نراد چودھری نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ اس نے لکھا کہ ہم ابھی پڑھنا لکھنا بھی نہیں جانتے تھے کہ ہمیں یہ بتلایا جاتا تھا کہ ہم پر مسلمانوں نے حکومت کی تھی او بے حد مظالم ڈھائے تھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر مذہب کو پھیلایا ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے ہماری عورتوں کو اغوا کیا۔ ہمارے مندروں کو منہدم کیا اور ہماری مذہبی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی۔

1906ء کے آخر میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی ایک نئی شکل دیکھنے میں آئی۔ ہم اپنے بزرگوں سے سننے لگے کہ مسلمان علانیہ طور پر تقسیم بنگال کی حمایت کر رہے ہیں اور برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ نواب سلیم اللہ خاں ہمارے استہزا و تمسخر کا خاص طور پر نشانہ بنا۔ جس کو ہم حقارت سے ''کانا''

کہتے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت ہمارے دلوں میں گھر کر چکی تھی جس نے ہمارے اور ان کے درمیان تعلقات کو یکسر ختم کر دیا تھا۔ اس کی واضح مثال کشور گنج میں پیش آئی جہاں سکول کے ہندو طلبا نے مسلمانوں کے ساتھ یہ کہہ کر بیٹھنے سے انکار کر دیا کہ "ان کے مُنہ سے پیاز کی بو آتی ہے"۔ تقسیم بنگال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی ایک مستقل خلیج پیدا کر دی۔ مسلمانوں کے لیے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی تھی جس کا مظاہرہ سکولوں اور بازاوں میں ہوتا تھا۔[18]

تقسیم کے خلاف ہندوؤں کی مخالفت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 05-1904ء کے دوران مخالفت کرنے والے اخبارات کی اشاعت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا مثلاً دی بنگالی کی اشاعت تین ہزار سے بڑھ کر گیارہ ہزار ہو گئی۔ اسی طرح امرت بازار پتریکا کی اشاعت دو ہزار سے سات ہزار پانچ سو تک پہنچ گئی۔

مسلمانوں کا ردِّ عمل

تقسیم بنگال مسلمانوں کے لیے خدا کی رحمت ثابت ہوئی۔ انہیں اس بات کا موقع میسر آیا کہ اپنے غصب شدہ حقوق واپس لے سکیں۔ قدرتی طور پر انہوں نے تقسیم بنگال کا خیر مقدم کیا۔ نواب سلیم اللہ خان نے تقسیم بنگال کی زبردست حمایت کی۔ منشی گنج میں ایک تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ "تقسیم بنگال نے ہمیں خواب غفلت سے جگایا ہے اور ہمیں جدوجہد کی طرف متوجہ کیا ہے۔" ایک اور موقعہ پر لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم سے نہ تو بنگالی بولنے والوں میں کوئی جدائی ہوئی ہے نہ ہی ان میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تقسیم کے سبب دونوں صوبوں کو ترقی کے مواقع ملے ہیں۔ دونوں صوبوں میں بہتر گورنمنٹ، بہتر نظم و نسق، بہتر تعلیم اور بہتر ذرائع آمد و رفت قائم ہوئے ہیں۔"

نواب علی چودھری نے بھی تقسیم کو مسلمانوں کے حق میں مفید قرار دیتے ہوئے کہا کہ "اس سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں جان پڑ گئی ہے۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے حقوق اب بہت جلد تسلیم کئے جاتے ہیں اور پہلے کی نسبت ہماری اہمیت بڑھ گئی ہے۔" ایک اور مسلمان لیڈر سردار علی نے تقسیم بنگال کے خلاف ہندو ایجی ٹیشن کے بارے میں کہا کہ "یہ تمام شور و غل جو مچایا جارہا ہے اور یہ تمام تحریکیں جو شروع کی گئی ہیں ان کا اس کے سوا کوئی اور مقصد نہیں کہ اس صوبے میں جہاں ہندو اقلیت میں ہیں، وہاں ان کی طبقاتی برتری کو بحیثیت ایک جماعت کے برقرار رکھا جائے۔" **تقسیم کے اس فیصلے سے نہ صرف مشرقی بنگال بلکہ کلکتہ کے مسلمان بھی خوش تھے** جن کو تقسیم سے کوئی فائدہ

نہیں تھا۔ محمڈن لیٹریری سوسائٹی کلکتہ نے مسلمانوں کے اہم لیڈروں کی طرف سے ایک عرضداشت شائع کی جس میں بنگال کو مسلمانوں کے لیے "نعمت غیر مترقبہ" قرار دیا گیا اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ تقسیم بنگال کے خلاف کسی جلسہ جلوس میں شامل نہ ہوں۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں چند مسلمان ایسے تھے جنہوں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کی وہاں کچھ ایسے ہندو بھی تھے جو تقسیم بنگال کی حمایت کر رہے تھے۔

مسلمانوں کو تقسیم سے فوائد

تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ اس صوبہ میں جہاں ان کی اکثریت تھی انہیں اپنی مرضی کے مطابق حکومت چلانے کا موقع میّسر آیا۔ تعلیمی میدان میں مسلمانوں نے خاطر خواہ ترقی کی۔ 1911ء تک صوبے کے پانچوں ڈویژنوں میں اعلیٰ درجے کے کالج قائم ہو چکے تھے۔ 1906ء میں کالجوں میں 1698 طلباء زیر تعلیم تھے۔ 1912ء میں یہ تعداد 2560 تک جا پہنچی۔ ہائی سکول میں بھی مسلمان طلبہ کی تعداد 8869 سے 20729 تک جا پہنچی۔ 1912ء تک مختلف قسم کے سکولوں میں مسلمان اساتذہ کی تعداد 9654 سے بڑھ کر 14656 ہو گئی۔

مشرقی بنگال میں نظم و نسق کی ابتری کے سبب دریائی راستوں پر جرائم بے حد ہوتے تھے۔ اب ان جرائم کی روک تھام کی طرف توجہ کی گئی۔ دریائی پولیس کا قیام عمل میں آیا۔ ذرائع آمد و رفت کو بہتر بنایا گیا۔ 1911ء میں سڑکوں کی مرمت کے لیے تین لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کرنے کا موقع میّسر آیا۔

تنسیخ تقسیم بنگال

تقسیم بنگال کے خلاف تحریک آہستہ آہستہ مدہم پڑنے لگی۔ سریندر ناتھ بیز جی نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ "ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تقسیم اب قائم ہو چکی ہے۔" لیکن حکومت نے 12 دسمبر 1911ء کو اس "طے شدہ فیصلے" کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے بنگالی ہندوؤں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ کلکتہ میں ایک زبردست جلوس نکالا گیا اور یہ قرار پایا کہ 12 دسمبر کو "قومی تہوار" کی فہرست میں داخل کیا جائے۔ حکومت کے اس فیصلہ پر بے پناہ اظہار مسرت کرتے ہوئے امبکاچرن مورندار نے کہا کہ "آج میں خوشی کے ساتھ مرنے کو تیار ہوں۔" بنگالی ہندو اس فیصلے سے اس قدر خوش ہوئے کہ جب شاہ برطانیہ جارج پنجم کلکتہ گیا تو بہت سے اخبار نویسوں

نے یہاں تک لکھ دیا کہ بادشاہ اور رانی کو ہندو Pantheon میں شامل کر لیا جائے۔

دوسری طرف حکومت کے اس فیصلے نے مسلمانوں میں غم وغصے کی ایک لہر دوڑا دی۔ نواب وقارالملک نے ایک مضمون میں لکھا کہ "مسلمانوں کے حق میں علیحدگی خدا کی طرف سے ایک رحمت ثابت ہوئی اور 66 فیصد آبادی کے جو حقوق اس سے پہلے گورنمنٹ اور عام نگاہوں سے اوجھل تھے، روز روشن کی طرح سامنے آگئے اور روز بروز مسلمانوں کی حالت اس صوبے میں ترقی کرنے لگی۔ ایسی حالت میں دونوں صوبوں کا الحاق بغیر کسی ایسے اطمینان دلانے کے کہ آئندہ مسلمانوں کی حفاظت کس طرح ہو گی۔[19]

جناب پروفیسر احمد سعید صاحب ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> "محمڈن ایجوکیشن کانفرنس ڈھاکہ کے اجلاس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔30 دسمبر 1906ء کو نواب صاحب نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ نواب صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا' 'آج ہم جس غرض کے لئے جمع ہو رہے ہیں وہ کوئی نئی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں جس وقت سے کانگرس کی بنیاد پڑی ہے اسی وقت سے یہ ضرورت پیدا ہو گئی تھی۔ مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوم سے ایک خمس کے قریب ہیں اور یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت برٹش حکومت ہندوستان میں قائم نہ رہے تو اس وقت وہی قوم ہم پر حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار حصہ زیادہ ہے اور اب صاحبو ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب خطرے میں ہو گا۔ آج جبکہ برٹش کی زبردست حکومت اپنی رعایا کی محافظ ہے، جس قسم کی مشکلات ہم کو بسا اوقات اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی رہتی ہیں، اس کے نظائر کم وبیش ہر صوبہ میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جبکہ ہم کو ان لوگوں کا غلام ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں۔
>
> جلسہ کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نواب صاحب کو اس نئی جماعت کا جوائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔"[20]

دہشت گردی کے المناک مناظر

برصغیر کے مشہور تاریخ دان جناب محمد عبداللہ ملک ایم اے صدر شعبہ تاریخ، اسلامیہ کالج لاہور نے ہندوؤں کی سودیشی تحریک اور دہشت گردی کا نقشہ درج ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"تقسیم بنگال کو منسوخ کرانے کے لئے انتہا پسند ہندوؤں نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے 7اگست1908ء کو سودیشی تحریک کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ملکی اشیاء اور غیر ملکی مصنوعات کے استعمال کا پرپیگنڈا کیا جائے اور غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ بالفاظ دیگر برطانوی مال کا بائیکاٹ کر کے برطانوی تجارت کو نقصان پہنچایا جائے تا کہ حکومت اُن کے مطالبہ کو تسلیم کرے۔ نتیجۃً غیر ملکی مصنوعات بند ہو گئیں اور جہاں کہیں غیر ملکی چیز نظر آئی اسے بر سر عام نذر آتش کر دیا جاتا۔ سودیشی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے دکانوں کی ناکہ بندی کی جاتی۔ گاہکوں کو مال خریدنے سے جبراً روکا جاتا۔ ابتدا میں یہ تحریک محض انگریزوں کے خلاف شروع کی گئی تھی لیکن بتدریج **مسلمانوں کو اس کی لپیٹ میں لیا جانے لگا۔** چنانچہ مسلم تاجروں کو دھمکیاں دی جانے لگیں کہ وہ انگریزی مال کی خرید و فروخت سے باز رہیں۔ سودیشی تحریک کی تائید میں کانگرس نے کھدر کے کپڑے کا استعمال حب الوطنی کی علامت قرار دی۔ نتیجہ یہ ہوا کی ہندو تاجروں نے خوب نفع کمایا جبکہ برطانوی تاجروں اور صنعت کاروں کو بھاری نقصان پہنچا۔ کانگرس نے مانچسٹر چیمبر آف کامرس پر دباؤ ڈالا کہ وہ برصغیر میں تجارتی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ تقسیم بنگال منسوخ کر دے۔

1908ء میں ہندوؤں کی اسی مخالفانہ تحریک نے باقاعدہ دہشت گردی کی صورت اختیار کر لی جس کے نتیجہ میں ہر طرف بدامنی، لاقانونیت اور قتل وغارت کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔ گورنر کی گاڑی کئی دفعہ پٹڑی سے اتارنے اور تباہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ وائسرائے ہند لارڈ منٹو پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ بنگال میں ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر بم پھینکا گیا جس سے دو انگریز عورتیں ہلاک ہو گئیں۔ الغرض **بم پھینک کر اور پستول سے قتل کے متعدد واقعات ہونے لگے۔ پلوں کو اڑانے،**

سرکاری املاک کو تباہ کرنے اور بد امنی پھیلانے کی خفیہ تربیت گاہیں بھی قائم کی گئیں۔ اگر کوئی دہشت پسند پکڑا جاتا تو بڑے بڑے ہندو وکلاء اس کا کیس لڑنے اور اسے قانونی گرفت سے بچانے کے لئے فوراً تیار ہو جاتے۔ اگر وہ بری کر دیا جاتا تو اسے قومی ہیرو تصور کیا جاتا اور اسے پھانسی دے دی جاتی تو اس کا کریا کرم بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے کیا جاتا۔"[21]

حواشی:

1 اقبال کے ممدوح علماء صفحہ 103 از قاضی افضل حق قریشی کریم پارک لاہور اشاعت 1977ء۔

2 چونکہ اقبال اور ابوالکلام آزاد 1905ء سے گہرے دوست اور سوشلزم پر ایمان لا چکے تھے اس لئے جناب آزاد نے ان کی وفات پر لکھا "یہ تصور کس قدر المناک ہے، اقبال اب ہم میں نہیں۔ یہ تنہا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پرانے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔" (اقبال کے ممدوح علماء صفحہ 103)

3 اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے زیر انتظام اگست 1987ء میں "پنجابی ادب دی کہانی" شائع ہوئی جس کے مصنف عبدالغفور قریشی نے "غدر پارٹی" کے زیر عنوان بتایا کہ اس پارٹی نے 1914ء میں سان فرانسسکو سے اخبار "غدر گونج" جاری کیا۔ یہ 52 صفحے کا اخبار تھا جس کی اشاعت دس ہزار تھی۔

4 ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ صاحب ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ ویسٹ بلاک 1۔ آر کے پورم نئی دہلی طبع اول۔ سن اشاعت 2000ء۔

5 جناب سید ہاشمی فرید آبادی کی تحقیق کے مطابق ابوالکلام آزاد اصلاً وسط پنجاب کے ایک نو مسلم خاندان کے فرد تھے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں "ممتاز حسن صاحب سیکرٹری محکمہ فنانس پاکستان کی جستجو نے قصبہ قصور کے قریب موضع کیم کرن میں جناب آزاد کی کھتری برادری کا سراغ نکالا۔ کوئی دو سال ہوئے ممتاز صاحب کا مقالہ حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گیا اور کئی جرائد میں چھپا تھا نیز دیکھو موج کوثر صفحہ 309" (تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ 530 مع حاشیہ ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی طبع دوم 1988ء)

6 "بالشوازم راہ انقلاب" ایلن وڈز مترجم ایس این شوریدہ ناشر طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز لکشمی چوک لاہور۔ پہلا ایڈیشن مارچ 2001ء۔

7 صفحہ 848 مترجم ایس ان شوریدہ طبع اول مارچ 2001ء ناشر طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز لکشمی چوک لاہور۔

8 ایضاً صفحہ 344۔

9 ایضاً صفحہ 343۔

10 ایضاً صفحہ 343۔

11 Constitutional History of India وی۔ ڈی۔ مہاجن۔ ناشر ایس چاند اینڈ کمپنی نیو دہلی 1962ء۔

12 ایضاً صفحہ 565۔

13 ایضاً صفحہ 533۔

14 ایضاً صفحہ 530-531۔

15 History of The Freedom Movement, vol.3, part 1, 1961 ناشر ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور اشاعت 1983ء۔

16 Abdul Hamid: Muslim Separatism in India (Lahore 1967)

17 Sardar Ali Khan: India of Today (Bombay-1908)

[18] Nirad C. Chaudhuri: The Autobiography of An Unkown Indian

[19] اکرام اللہ ندوی وقار حیات (علی گڑھ 1925ء) صفحہ 93-689۔

[20] "حصول پاکستان" صفحہ 9-288۔

[21] تاریخ پاکستان (1708ء تا 1977ء) صفحہ 169-171۔ مولف جناب پروفیسر محمد عبداللہ ملک ایم اے۔ ناشر قریشی برادرز چوک اردو بازار لاہور اشاعت 91-1992ء۔

ساتویں فصل

سودیشی تحریک، اقبال، جماعت احمدیہ

جناب عتیق صدیقی (جامعہ نگر دہلی) کی تحقیق کے مطابق غدر پارٹی کے بانی لالہ ہردیال کے اقبال سے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ یورپ میں دوسرے ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ برطانوی اقتدار کی مخالفت میں سرگرم رہے۔1913ء میں امریکہ میں غدر پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اقبال ستمبر1905ء سے جولائی1908ء تک یورپ میں رہے۔ وہ مذہبی مسائل کے لئے ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی سے رابطہ کرتے تھے۔ اقبال کے سفر انگلستان کے دوماہ بعد بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہوا اور ہندوؤں نے سودیشی تحریک کے نام سے شورش برپا کردی توانہوں نے کیمبرج میں اس کی تائید میں ایک پُر جوش مضمون لکھا جو رسالہ "زمانہ" کانپور (مئی1906ء) میں چھپا۔[1]

سودیشی تحریک کے متعلق اقبال کی یہ رائے تھی کہ

"میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے....
مسلمان خواہ بیچنے والے ہوں خواہ خریدنے والے ہر طرح فائدہ میں ہیں۔ ہاں اگر وہ
بیچنے والے ہیں تو ان کو زیادہ فائدہ ہے اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ بائع نہ بنیں۔"[2]

لینن اور سودیشی تحریک

لینن نے سودیشی ہندو تحریک کو انڈین ورکنگ کلاس کی پہلی سیاسی تحریک کا نام دے کر خراج تحسین ادا کیا چنانچہ بھارت کے ایک مستند تاریخ دان جناب کے۔ آر۔ بمبوال ایم اے[3] (K. R. Bombwall, M.A) تحریر فرماتے ہیں:

"Militant Nationalism and the Congress

Militant nationalism arose as an integral part of the Congress movement but the extremists constituted a minority in the organisation. Nevertheless, they succeeded in widening the scope of the national movement .They brought the middle classes into the mainstream of the national struggle and helped in the spread of national consciousness

among the common people. Tilak, Pal and Lajpat Rai were popular leaders in a new sense. Their sacrifices in the cause of freedom made them national heroes. They wanted the Congress to appeal directly to the people instead of looking to the White Hall or the Government House. The arrest and conviction of Tilak in 1908 led to widespread rioting. The textile workers of Bombay went on a general strike as a protest against the government action. Lenin aptly described this strike as the first political action of the Indian working class. Within the Congress, the extremists tried to impart a militant tone to the organisation and to induce it to adopt an attitude of self-reliance and a technique of active opposition to the government". They failed to work a revolution inside the Congress, but they did succeed in persuading it to endorse their programme of Boycott and Swadeshi, at the 21st session (Banaras, 1905). Even Gokhale spoke enthusiastically of Swadeshi. He said: "The devotion to the Motherland which is enshrined in the highest Swadeshism is an influence so profound and so passionate that its very thought thrills and its actual touch lifts one out of oneself". The 22nd Congress Calcutta, 1906) reiterated its approval of Boycott and Swadeshi and the president, Dadabhai Naroji Proclaimed Self-government or Swaraj like that of the U.K. or the colonies ' as the ideal of the Congress."[4]

بغاوت اور جماعت احمدیہ

اس فتنہ وفساد اور کھلی بغاوت نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو 12 مئی 1907ء کو حضرت مسیح موعود کی ہدایت وارشاد پر مدرسہ تعلیم الاسلام قادیان کے صحن میں ایک جلسہ عام ہوا

جس سے خطاب کرتے ہوئے حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب ایڈیٹر تشحیذ الاذہان نے بتایا کہ:-

"اس موجودہ شورش کی ابتداء بنگالیوں سے سے ہوئی اور پھر یہ تحریک بد آناً فاناً بجلی کی طرح پنجاب میں پھیل گئی ہے اور اب بعض بڑے بڑے شہروں میں خطرناک رنگ اختیار کرنے کو تھی کہ یہ گورنمنٹ انگریزی نے (جو اپنی طاقت، شوکت اور اپنی تدبیر سلطنت کے لئے ایک مشہور گورنمنٹ ہے) نہایت قابلیت کے ساتھ قرینِ انصاف پہلوؤں کی بناء پر اس کے تدارک اور انسداد کی طرف توجہ فرمائی ہے جس سے یقین ہوگیا ہے کہ یہ متعدی مرض رُک جائیگا اور خدا کرے کہ یہ فوراً رک جاوے تا کہ اہل ملک کو آنیوالے خطرہ کا سامنا نہ ہو۔ اس فساد کی ابتدا جہاں تک واقعات سے پتہ لگتا ہے اور معلوم ہو سکتا ہے، ہندوؤں سے ہوئی ہے اور ان کے گھروں میں ہی اس نے پرورش پائی۔ ان کے اثر سے متاثر ہو کر کم فہم مسلمانوں نے بھی انکی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر عام طور پر مسلمانوں نے اس کو اپنے لئے خطرناک اور مضر یقین کیا اور وہ اس سے الگ رہے۔ اگر بعض غیر ذمہ دار اور ضمیر فروش اشخاص ساتھ ہوئے تو وہ کسی گنتی میں نہیں۔

آجکل راولپنڈی۔ لاہور۔ امرتسر میں یہ فساد بہت بُری طرح پھیلا تھا جو بہت جلد دبا دیا گیا۔ راولپنڈی میں ان شورہ پشت لوگوں نے انگریزوں پر حملے کئے اور لیڈیوں کی توہین کی۔ گرجا گھر کو آگ لگا کر اسباب جلا دیا۔ گورنمنٹ سکول کو آگ لگائی۔ اس قسم کی حماقت کی کارروائیاں کرکے انہوں نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ ملک اور سلطنت کے بدخواہ اور دشمن ہیں۔

اس قسم کی شرارتوں اور خباثتوں سے مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچتے رہیں۔ اگر وہ خدا پر، قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر ایمان رکھتے ہیں تو ان کا مذہبی فرض ہے کہ بغاوت اور فساد کے طریقوں سے بچتے رہیں۔"

حضرت صاحبزادہ صاحب کی تقریر کے بعد حضرت حکیم الامت مولانا نور الدین صاحب نے ایک جامع تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

”اس ملک کے ہندوؤں نے خدا تعالیٰ کے اس فضل واحسان کا شکریہ ادا نہیں کیا جو کہ آیت کریمہ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔(النحل:15) جہازوں کی آمد ورفت کا جو نتیجہ ہے وہ خدا کا ایک فضل ہے جس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ اور اس سے کیا تجارت میں اور کیا ساہوکارہ میں اور کیا زراعت میں اور کیا ملازمت میں سب سے زیادہ فائدہ ہندوؤں نے ہی حاصل کیا ہے لیکن انہوں نے ہی سب سے زیادہ ناشکری کی اور ان سے اس سے زیادہ کچھ امید بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ جو مشرک اپنے حقیقی محسن خالق مالک ربّ کو چھوڑ کر ایک پتھر کے آگے سر جھکاتا ہے، اس سے کیا اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ کسی انسان کے احسان کو شکریہ کے ساتھ دیکھے گا کیونکہ خدا تعالیٰ کے احسانات کے مقابلہ میں انسان کے احسان ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ وہ جس نے خدا کے ساتھ ہی بغاوت کی ہو وہ اپنے ہم جنس انسان کے ساتھ کب نیک سلوک کریگا۔ خدا تعالیٰ کے حضور اس ناشکر گزاری میں ہندو لوگ جو حصہ لے رہے ہیں وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن آریہ لوگ دراصل ان سے بڑھ گئے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہو کر وہ کہتے ہیں کہ نہ ہماری روح کا وہ خالق ہے اور نہ ہی ہمارے جسم کے مادہ کا وہ خالق ہے۔ پھر زمانہ کو بھی خدا کا مخلوق نہیں مانتے یہ کس قدر ناشکری ہے جو ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ کے ذریعہ سے آریوں کو جو آرام اور فائدہ حاصل ہوا ہے زراعت میں، اس سے ظاہر ہے کہ مدت کی بات ہے ایک دفعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پانچ کروڑ روپیہ کی جائیداد ہر سال مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوؤں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ سرکاری ملازمت میں دیکھو تو تمام بڑے بڑے عہدے علی العموم ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں اور کیا مجال ہے کہ کسی مسلمان کو معمولی دفتر کی کلرکی میں ہی حتی الوسع رہنے دیں۔ ہاں دفاتر کے چپڑاسی اور فراش مسلمان رکھ لئے جاتے ہیں۔ پھر مقدمات میں مسلمانوں اور بالخصوص احمدیوں کے ساتھ ہندو مجسٹریٹوں کا جو سلوک ہے وہ چندو لعل اور آتمارام کے مقدمات کرنے سے ظاہر ہے کہ وہ مقدمہ جس کو ایک انگریز نے بغیر اس کے کہ ہمارے امام بلکہ اس کے خدام کو بھی کوئی تکلیف ہو، ایک ہی روز میں فیصلہ کر دیا، اس پر

ان لوگوں نے دو سال تک گورداسپور کی آمد و رفت کی جو تکلیف حضرت امام اور آپ کے خدام کو دی وہ تاریخ زمانہ میں ایک یادگار رہے گی۔"[5]

حضرت مسیح موعود اور ہندوؤں کی باغیانہ پالیٹکس

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سودیشی تحریک کی نسبت اظہار خیال کرتے ہوئے یہ رائے دی۔

"اس تحریک کی ابتدا ملکی اشیاء کی ہمدردی سے نہیں بلکہ تقسیم بنگالہ پر بنگالیوں کی ناراضگی اس کی جڑ ہے۔ **اس واسطے یہ امر منحوس معلوم ہوتا ہے۔**"[6]

حضرت اقدسؑ نے بنگالی ہندوؤں کی شورش سے جماعت احمدیہ کو بالکل الگ رہنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"ہماری جماعت کو بالکل ان سے الگ رہنا چاہیے۔ تعجب کی بات ہے کہ جو قوم حیوان کو انسان پر ترجیح دیتی ہو اور ایک گائے کے ذبح سے انسان کا خون کر دینا کچھ بات نہ سمجھتی ہو وہ حاکم ہو کر کیا انصاف کرے گی۔"[7]

اس تاکیدی فرمان کے بعد اپنے عہد مبارک کے آخری جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے انتباہ فرمایا:-

"ہندوؤں سے بالکل جوڑ نہ رکھیں۔ اگر انگریز آج یہاں سے نکل جاویں تو یہ ہندو مسلمانوں کی بوٹی بوٹی کر دیں۔"[8]

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی آخری تصنیف "پیغام صلح" میں دو قومی نظریہ کی زبردست تائید کرتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا:

"یہ بات ہر ایک شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمان اس بات سے کیوں ڈرتے ہیں کہ اپنے جائز حقوق کے مطالبات میں ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جائیں اور کیوں آج تک اُن کی کانگریس کی شمولیت سے انکار کرتے رہے ہیں اور کیوں آخر کار ہندوؤں کی درستی رائے محسوس کر کے اُن کے قدم پر قدم رکھا مگر الگ ہو کر اور ان کے مقابل پر ایک مسلم انجمن قائم کر دی مگر ان کی شراکت کو قبول نہ کیا۔ صاحبو اس کا باعث دراصل مذہب ہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔"[9]

حواشی:

[1] اقبال صفحہ 38 مکتبہ جامعہ نئی دہلی اگست 1980ء۔

[2] منشی دیانرائن ایڈیٹر "زمانہ" کانپور کے نام مکتوب از ٹرینٹی کالج کیمبرج انگلینڈ۔ شائع شدہ "زمانہ" اپریل 1960ء (کلیات مکاتیب اقبال) جلد اول صفحہ 123-124 مرتبہ سید مظفر حسین برنی اردو اکادمی دہلی طبع چہارم 1993ء۔

[3] Head of the Department Of Political Science, Government Raza Degree College, Rampur: Formely vice Principal, Taj College, Rohtak, Author of "Principles of Civics" and “Indian Administration” etc, etc.

[4] Indian Politics and Government, pp.20-21, 1951, Atma Ram & Sons Booksellers, Publishers and Stationers Kashmere Gate Delhi.

[5] اخبار الحکم قادیان 30 مئی 1907 صفحہ 5 تا 8۔

[6] اخبار بدر 24 نومبر 1905ء صفحہ 7 کالم 3۔

[7] اخبار بدر 9 مئی 1907ء صفحہ 5 کالم 3۔

[8] اخبار الحکم 10 جنوری 1908ء۔

[9] "پیغام صلح" صفحہ 28-29 طبع اول روحانی خزائن جلد 23 صفحہ 457۔

آٹھویں فصل

آزاد دہریت کی آغوش میں

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جناب آزاد نے حیرت انگیز طور پر اعتراف کیا ہے کہ وہ اس وقت پکے دہریہ ہو چکے تھے اور اسلامی اقدار و تعلیمات کو پس پشت ڈال کر ہندو سوشلسٹوں کی تحریک بغاوت کا ہر اول دستہ بن گئے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"زیادہ سے زیادہ میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ میرا دل اچانک اپنی موجودہ حالت اور ارد گرد کے منظر سے اُچاٹ ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کسی اچھی حالت میں مبتلا نہیں ہوں۔ یہ بے اطمینانی بڑھتی گئی حتیٰ کہ مجھے اُن ساری باتوں سے جو لوگوں کی نظروں میں انتہا درجہ عزت واحترام کی باتیں تھیں، ایک طرح کی نفرت ہو گئی۔

چند دنوں کے بعد یہ جذبہ ایک دوسرے رخ پر بہنے لگا۔ اپنی حالت کے احتساب نے اپنے عقائد وافکار کے احتساب پر توجہ دلائی اور اب جو میں نے اپنے مذہبی عقائد کا جائزہ لیا تو اس میں بجز آبائی تقلید، دیرینہ رسم پرستی اور موروثی اعتقاد کے اور کچھ نہ تھا۔" ("ذکر آزاد"۔ ص256)

دیرینہ رسمی عقائد و آبائی تقلید، خدا کی حقیقت اور مختلف مذاہب کے باہمی اختلافات۔ یہ تین سوالات تھے جن کے حل میں مولانا سرگرداں و پریشان تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"یہ تین سوال تھے جو 14 برس کی عمر میں مجھ پر اس طرح چھا گئے تھے کہ خون اور گوشت کی جگہ میرے اندر صرف انہی کی گونج بھری ہوئی تھی۔ گرہ کو جس قدر کھینچا جائے اتنا ہی اور زیادہ اُلجھ جاتی ہے۔ اس طرح میں جس قدر حل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اتنا ہی زیادہ اُلجھاؤ بڑھتا جاتا تھا۔ میں نے ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مختلف مذہبوں کی کتابیں بار بار دیکھ ڈالیں۔ میں اس وقت بمبئی میں تھا۔ وہاں مجھے متعدد عیسائی، یہودی، پارسی، بہائی، ناسک اور ہندو عالموں سے ملنے اور بحث ومباحثہ کا موقعہ ملا لیکن ان کی باتیں میری الجھن کو اور زیادہ کرتی تھیں۔ اُن کے جوابات اور مباحث سُن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری پریشانی اُس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے

جس قدر میں سمجھے ہوا تھا۔ بالآخر یہ اندرونی تکلیف یہاں تک بڑھی کہ میں بیمار ہوگیا۔ غذا بند ہوگئی۔ نیند اُچاٹ ہوگئی۔

اسی اثنا میں میں نے ماڈرن فلاسفی اور سائنس کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کیا۔ جس قدر مطالعہ مشرقی زبانوں کے تراجم سے کر سکتا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کی طرف سے میری بے اطمینانی اور زیادہ گہری ہوگئی۔

اب مجھ پر وہ دروازہ کھلا جو اس راہ میں ہمیشہ کھلا کرتا ہے۔ یعنی مذہب اور عقل کی تطبیق واتحاد کا طریقہ۔ اس کے بھی متعدد اسکول ہیں۔ میں نے سب کا مطالعہ کیا، اور اس سے اتنا ضرور ہوا کہ عارضی سکون مجھے ہوگیا۔ اسی زمانہ میں، مَیں نے سر سیّد احمد خان مرحوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا جن کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے موجودہ زمانہ میں مذہب اور ماڈرن سائنس کو ملانے کے لئے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ مجھ پر ان کی تصنیفات کا بہت اثر ہوا۔ حتیٰ کہ کچھ دنوں تک میرا یہ حال رہا کہ میں بالکل اُن کا مقلد اور پیرو ہوگیا تھا۔ مگر یہ وقفہ عارضی تھا۔ بہت جلد مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ منزل مذہب کی طرف لے جانے والی نہیں ہے۔ بلکہ مذہب سے انکار کی ایک نرم اور ملائم صورت ہے۔ آخری نتیجہ میرے دل ودماغ پر حاوی ہوگیا تھا، یعنی گو میں زبان سے صاف اقرار نہیں کرتا تھا لیکن میرے اندر قطعی انکار والحاد کی آواز گونج رہی تھی۔

میں اب ایک پکا دہریہ ہوگیا تھا۔ میٹریلزم (Materialism) اور ریشنلزم (Rationalism) کے اعتقاد پر میرے اندر فخر وغرور تھا۔ اور مذہب کے نام میں جہل وتوہم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم وہ چیز کہاں تھی جس کی ڈھونڈھ میں نکلا تھا؟ دل کا اطمینان؟ وہ تو اب اور زیادہ دور ہوگئی۔ میرے اضطراب کی اندھیاری میں تسلّی کی ایک ہلکی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

14 برس سے لے کر 22 برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا۔ میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل وعلم کے ساتھ ساتھ چلانا چاہتا ہے۔ لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق۔ یہی منزل آخری مایوسی کی منزل تھی۔" ("ذکر آزاد"۔ ص 257۔260)[1]

ہندوؤں کی سوشلسٹ سودیشی ایجی ٹیشن میں شرکت

پکے دہریہ ہونے کے بعد آزاد نے ہندوستان کے ہندوؤں کے نام کارل مارکس کے پیغام پر پُرجوش لبیک کہا اور آل انڈیا نیشنل کانگرس اور بنگال کے دہشت گرد ہندوؤں کی انقلابی پارٹی میں شامل ہوگئے اور راجہ موہن رائے اور کیثیب چندر سین جیسے فرقہ پرستوں کو اولوالعزم مصلح قرار دینے لگے۔[2]

یہی نہیں غدر پارٹی کے سرگرم ممبر کی حیثیت سے ہندوؤں سے بڑھ کر مشرقی بنگال کے ستم رسیدہ اور مظلوم اور بے کس غریب مسلمانوں کی مخالفت شروع کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ملیّ جسم میں نہایت بے دردی سے خنجر گھونپ دیا۔ اُن کا اپنا بیان ہے کہ:-

> ”لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کے آگے بنگال نے سر جھکانے سے انکار کر دیا اور وہاں اس قدر زبردست مخالفانہ شورش برپا ہوئی کہ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آربندو گھوش نے کلکتہ سے کرم یوگن کے نام سے ایک اخبار جاری کر کے غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کی تخم ریزی شروع کردی۔
>
> یہ انقلابی تحریک و تنظیم جس نے پورے بنگال اور بنگال سے باہر دور دراز تک اپنے اثرات پھیلا دئے تھے، مسلمانوں پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں تھی“۔ ”تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو گئیں گویا انگریز حکومت کا یہ منشا پورا ہونے لگا کہ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور برطانوی حکومت انقلابیوں کی زد سے محفوظ رہے۔ انگریز کی اس خطرناک چال کو ناکام بنانے کے لئے ضروری تھا کہ انقلابیوں کے ساتھ میرا ربط وضبط پیدا ہو۔ اور میں انہیں یہ باور کرا سکوں کہ مسلمان بحیثیت ایک جماعت کے ہرگز ان کے دشمن نہیں ہیں اور چند مسلمان سرکاری ملازمین کا فعل پوری مسلمان امت کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اس مقصد کے لئے میں نے انقلابی رہنما شیام سندر چکرورتی سے کسی طرح رابطہ کیا۔ انقلابیوں میں ان کا بڑا احترام تھا ان کے ذریعہ دوسرے انقلابی کارکنوں سے ملا۔ آربندو گھوش سے بھی کئی بار ملاقات کی **حتّٰی کہ میں نے انقلابی تحریک کو اپنی خدمات باقاعدہ پیش کردیں**۔ اور نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت میں نے تیار کرلی۔“
>
> یہی وہ سال ہے جس میں اقبال اور آزاد کے خُفیہ مراسم وروابط قائم ہوئے۔[3]

"انقلابی تحریک میں شامل ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ انقلابیوں کی کارروائیاں نہایت محدود ہیں۔ میں نے انہیں متوجہ کیا کہ ان کا دائرہ وسیع کرنا چاہیئے اور نہ صرف ہندوستان کے تمام صوبوں میں اپنی شاخیں کھول دینا چاہیئے بلکہ بیرون ملک کی انقلابی تحریک سے بھی ربط وضبط بڑھا کر برطانوی سامراج کے خلاف وسیع تر محاذ بنانا چاہیئے۔

اس زمانہ میں مجھے عراق، شام، مصر اور ترکی وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں ان خطوط پر پہلے ہی کام شروع کر چکا تھا۔ میں نے اس سفر میں ہندوستان کی انقلابی تحریکوں کے درمیان رابطہ کی کڑیاں قائم کیں اور وہاں سے واپسی پر ہندوستان کے مسلمانوں میں حصول آزادی کا ولولہ پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ ایک اخبار جاری کیا جائے۔ ہفت روزہ الہلال کا اجراء اسی مقصد کے لئے ہوا۔ جون 1912ء میں الہلال کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ میری ان کوششوں سے ایک طرف بنگال کی انقلابی تحریک ہندوانقلاب تحریک کے بجائے ہندوستانی انقلاب کی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ اس میں مسلمانوں کی شمولیت کا دروازہ بھی کھل گیا۔ مسلمان نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار ہوگیا۔ ہندوستان کی انقلابی تحریکوں کا ربط ضبط ایشیاء اور انقلابی تحریکوں کے ساتھ قائم ہوگیا"۔[4]

عالمی سوشلزم اور ابوالکلام آزاد

اس بیان کا اگر سوشل ازم کی مستند عالمی تاریخ کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے کہ ابوالکلام آزاد کی انقلابی سرگرمیاں حیران کن حد تک دوسرے انقلابیوں کے قدم بقدم، شانہ بشانہ اور متوازی طور پر چل رہی تھیں جس سے واضح نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جناب آزاد جن خطوط پر ہندوستان میں ایجی ٹیشن اور بغاوت پھیلانے کے لئے جو بھی عملی اقدامات کررہے تھے، وہ فقط عالمی سوشلزم کی ہائی کمان ہی کا عکس تھا۔ مثلاً 1905ء میں وہ غدر پارٹی میں شامل ہوئے۔ ٹھیک اسی سال ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مزدوروں کی تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔[5]

پھر بالشویکی کا قانونی روزنامہ پٹرس برگ سے 1912ء کو نکلا بالکل یہی سال "الہلال" کے اجرا کا ہے۔[6]

جناب آزاد کی تشدد پسند انقلابیوں کی رفاقت اور مسلح بغاوت میں شرکت کی مزید تفصیل آپ کے قریبی اور گہرے ساتھی جناب مولوی عبدالرّزاق ملیح آبادی کے قلم سے درجِ ذیل ہے۔

"یہ واقعہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں مولانا تشدّد پسند انقلابیوں کے ساتھ تھے اور ہندوستان میں مسلح بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف بنگال کے انقلابیوں سے تعلقات استوار تھے۔ دوسری طرف سرحد کے قبائل میں اُن کے آدمی کام کر رہے تھے۔ جب اُن کی رفاقت میں (1920ء) آیا تو اس وقت تک مولانا مسلح بغاوت ہی کے قائل تھے۔ ایک دفعہ خود مجھے ایک جگہ بھیجا تھا اور میں دو درجن پستول لے آیا جو انہوں نے کسی اور کے ہاتھ کہیں بھیج دئے تھے"۔[7]

آزاد کی اسلامی تعلیم سے بغاوت

یہ سب مسلح کوششیں سراسر، اگرچہ انقلاب سوشلزم کے لئے تو از بس ضروری تھیں مگر اسلامی تعلیم سے سراسر بغاوت کے مترادف تھیں جیسا کہ حسین احمد صاحب دیوبندی نے خود اسی کتاب میں برصغیر کے مستند عالم دین اور حضرت سید ولی اللہ شاہ دہلویؒ کے فرزند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ فتویٰ ریکارڈ کیا ہے کہ۔

"اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہر حال اُس اقتدار میں شریک ہوں اور اُن کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ **ملک شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا۔** اور ازروئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔"[8]

اسی طرح انہوں حضرت سید احمد شہید بالاکوٹ (مجدّد تیرہویں صدی) کے مستند سوانح نگار مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی کتاب ("سوانح احمدی" صفحہ 70) کے حوالے سے لکھا ہے:-

"ایک مرتبہ ایک سوال کے جواب میں سید صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ کسی ملک کو چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ مذہبی فرائض

ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات
مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔"[9]

جناب سید ہاشمی فرید آبادی، حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"شاہ صاحب نے سکھ شاہی پنجاب کا خفیہ دورہ لگایا۔ وہاں کے مسلمان جس مصیبت میں پھنس گئے تھے، اُس کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ مظلوموں کی زبانوں سے سنی۔ بہت سی غیر آباد مساجد، مقابر، خانقاہیں، جنگلی حاکموں کے طویلے بن گئی تھیں۔ جہاں آبادی باقی رہی، وہاں اذان دینی مخدوش بلکہ کہیں کہیں بالکل ممنوع تھی۔"[10]

سید ہاشم فریدی تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت سیّد احمد بریلوی نے بار بار اعلان کیا کہ انگریزوں سے ہماری کوئی لڑائی نہیں۔ ان کے مقبوضات میں شورش وفساد مچانا ہم جائز نہیں سمجھتے (سوانح احمدی کے واقعات اور مکاتیب میں کوئی بیس جگہ سید صاحب نے انگریزوں کی مخالفت کو غیر ضروری اور ناجائز بتایا ہے) سکھوں سے نامہ وپیام کی ضمن میں بھی وہ یہی جتاتے تھے کہ **جہاد کا مقصد حکومت وبادشاہی حاصل کرنا نہیں، ہم صرف مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے لئے لڑتے ہیں۔**"[11]

یہی نہیں خلیفۃ المسلمین ترکی نے غدر 1857ء میں ہندوستانی مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ہندوؤں کی ناپاک مسلح سازش سے بالکل الگ رہیں اور حکومت وقت کی اطاعت کریں۔ چنانچہ حسین احمد مدنی صاحب نے "نقش حیات" جلد دوم صفحہ 631 میں اعتراف کیا ہے:-

"1857ء میں سلطان عبدالمجید مرحوم سے فرمان، مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے لڑنے اور اُن کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندوستان میں پراپیگنڈا کیا کہ خلیفہ کے حکم پر چلنا مسلمانوں کے لئے مذہبی حیثیت سے فرض ہے۔"

جناب شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا، سیکرٹری خلافت کمیٹی سیالکوٹ کا یہ بیان ماضی کے دبیز پردوں میں پوشیدہ حقائق کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"1857ء میں ہندوستان میں غدر مچا۔ اس غدر کو فرو کرنے کے لئے انگریزوں

کی افواج کو مصر سے گزر کر ہندوستان پہنچنے کی اجازت حضور خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم نے ہی دی تھی۔ جنوبی افریقہ میں جنگ بوئر ہوئی۔ تقریباً تمام یورپ انگلستان کے برخلاف تلا ہوا تھا۔ فرانسیسی اخبارات کیا کچھ زہر اگل رہے تھے۔ اور دنیا بھر کو انگلستان سے بدظن کر رہے تھے لیکن ترکی نے انگلستان کا ساتھ دیا۔ ہزارہا ترکوں نے انگریزی جھنڈے کے نیچے لڑنے مرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مساجد میں انگریزوں کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ عبید اللہ آمندی رکن مجلس وضع قوانین اور دیگر اکابر حکومت عثمانیہ نے سفارتخانہ انگلشیہ واقعہ پیرا میں جاکر انگریزوں کی بقاء و ظفر کے لئے دعا مانگی۔"[12]

ان مذہبی فتاویٰ کے علاوہ ہندوستان کی ہمسایہ مسلمان مملکت افغانستان کے بادشاہ "ضیاء الملّۃ والدّین امیر عبد الرحمن غازی" نے اپنی کتاب "دبدبہ امیری" کے باب ہشتم میں انگلستان، روس، افغانستان کے زیرِ عنوان صاف لفظوں میں لکھا کہ:-

"گورنمنٹ روس کی پالیسی امیر بخارا اور دیگر میران وسط ایشاء اور ترکی، ایران اورافغانستان کی نسبت یہی رہی ہے کہ وہ قوی نہ ہونے پائیں جو اُس کی دائمی پیش قدمی میں مخل ہوں۔ ایشیائی سلطنتوں کی دقتوں اور کمزوریوں سے روس برابر فائدہ اٹھاتا ہے۔ بعض اسلامی ریاستوں پر وہ بالکل قابض ہو گیا ہے۔ بخلاف اس کے انگلش پالیسی عموماً اسلام اور کُل اسلامی سلطنت ہائے ایشیا کے ساتھ دوستانہ ہے اور انگلستان کی دلی خواہش ہے کہ یہ سلطنتیں قائم رہیں، خود مختار ہوں۔ بخلاف اس کے روس کی پالیسی اس کے برعکس ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ اس کے ملک کے حدود ہندوستان کی سرحد سے مل جائیں بلکہ اُسے ہمیشہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر ترکی یا ایران یا افغانستان یا ہندوستان کے ساتھ جنگ ہوئی تو اس کی مسلمان رعایا میں عام غدر ہو جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام دنیا کے مسلمان سلطنت برطانیہ کی دوستی کو روس کی دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔"

نیز لکھا۔

"اگر روس اور برطانیہ اعظم میں جنگ ہوئی تو ہر حالت میں مسلمان سلاطین اور عام مسلمان انگلستان کا ساتھ دیں گے۔ اول تو انہیں مکہ معظمہ کی عملداری میں اپنے

مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی ہے۔ دوسرا وہ یہ جانتے ہیں کہ روس کے ظلم وجور سے اُسی وقت تک نجات حاصل ہے جب تک انگلستان سی عظیم الشّان سلطنت مشرق میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ **اگر مشرق میں انگلستان کو زوال آیا تو کل اسلامی سلطنتیں روس کی نوالہ ہونگی۔**"[13]

امیر عبدالرحمن کا شمار نہایت ذہین، مدّبر اور سخت گیر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ وہ قیام جماعت احمدیہ سے نو سال قبل 1880ء میں بر سر اقتدار آئے اور یکم مئی 1901ء کو وفات پائی۔

یہی نہیں خود مسلمانانِ ہند نے طوائف الملوکی اور سکھا شاہی سے نجات پر برطانوی حکومت کا جس شان وشوکت سے خیر مقدم کیا، وہ تاریخ کا سنہری ورق ہے جس کے بغیر برصغیر پاک وہند کی کوئی تاریخ مکمل نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح بعض روایات کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایران کے مشرک مگر عادل بادشاہ نوشیروان کسریٰ کے زمانہ حکومت میں اپنی ولادت پر فخر کرتے تھے، اسی طرح مسلمانان ہند نے اسوہ نبویؐ کے عین مطابق محسنہ ملکہ وکٹوریہ کو اپنے دل میں جگہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب 16 فروری 1887ء کو ہندوستان بھر میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی منائی گئی تو مسلمانانِ ہند نے اظہار تشکر کا عدیم المثال اور پر جوش مظاہرہ کیا۔ چنانچہ شمس العلماء جج سید محمد لطیف صاحب فیلو پنجاب یونیورسٹی وممبر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (1902-1845ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "تاریخ لاہور" میں بادشاہی مسجد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

> "مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مسجد کو اسلحہ خانہ اور فوجی گوداموں کے لئے استعمال کیا۔ لیکن برطانوی حکومت نے 1856ء میں اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا"۔[14]

پھر "تاریخ پنجاب" میں ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جوبلی میں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی دھوم دھام سے ملک گیر شرکت کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا کہ "**دنیا نے کبھی اتنا خوشحال دور یا انتہائی محبوب ملکہ نہیں دیکھی تھی۔ پنجاب (جہاں پچاس سال پہلے رنجیت سنگھ کی حکومت تھی ہر میجسٹی کے مبارک دور کا پچاسواں برس انتہائی جوش وخروش سے منایا۔**"

> "تمام اضلاع کے صدر مقامات پر امراء کے استقبال کے لئے دربار منعقد کئے گئے۔ سپاس نامے پیش کئے گئے۔ ہر میجسٹی کی ذات اور حکومت کے لئے پُرجوش وفا داری کے جذبے کا اظہار کیا گیا۔"

> "سلطنت کے طول وعرض میں عوام نے جس مسرت اور خوشی کا مظاہرہ کیا وہ

قابل ذکر ہے۔ دہلی میں جامع مسجد میں ہر میجسٹی کی خیریت کے لئے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔"

"امر تسر میں ہندو سکھ اور مسلمان بہت بڑی تعداد میں اپنی عبادت گاہوں میں جمع ہوئے اور ملکہ عالیہ کے لئے دعائیں کیں۔ بنوں میں مسلمان ملک، خان، ارباب اور افسران جامع مسجد میں جمع ہوئے اور ملکہ عالیہ کی درازی عمر کے لئے خصوصی دعائیں مانگیں۔"

"ڈیرہ غازی خان میں سرداروں، تومانداروں اور شہریوں کا عوامی اجلاس منعقد ہوا۔ وزیر آباد میں مسلمانوں نے مسجدوں میں چراغاں کیا اور ملکہ کے لئے خصوصی دعائیں مانگیں۔"

"بہاولپور کے نواب نے اپنے نور محل میں جسے پُر تکلف انداز میں روشن کیا گیا تھا، ایک سرکاری استقبالیہ کا اہتمام کیا.... یہ سب برطانوی حکومت اور ملکہ عالیہ کے تختِ شاہی کے ساتھ لوگوں کی گہری وابستگی کا ثبوت تھا۔ دانشمندی، انصاف، پاکیزگی اور فرض جس کے سرپرست رہے ہیں اور جو ان کی (ملکہ عالیہ) روز مرّہ زندگی کے رفیق رہے ہیں۔ ہر آنے والے سال کے ساتھ ان کی طاقتور حکومت کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہوتی گئیں جبکہ اُن کی رعایا کی وفاداری و جانثاری زیادہ نرمی و سرگرمی سے بڑھتی رہی۔"15

جناب محمد طفیل صاحب نے اپنے رسالہ "نقوش" لاہور نمبر صفحہ 117 پر لکھا ہے:

"سید احمد شہید کو جب سکھوں کے مظالم کا علم ہوا کہ اُن کی مملکت میں صلوٰۃ واذان تک کی اجازت نہیں، مسجدوں میں گھوڑے بندھتے تھے اور مسلمانوں کی بیٹیاں جبراً چکلوں میں بٹھائی جاتی ہیں تو انہوں نے رنجیت سنگھ کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔"

پھر صفحہ 124 پر لکھا:-

"یکم جنوری 1877ء کو ملکہ وکٹوریہ نے قیصرہ ہند کا لقب اختیار کیا۔ ملکہ کو بحیثیت حکمران جو ہر دلعزیزی پنجاب میں حاصل ہوئی، وہ شاید ہی کسی حکمران کو حاصل ہوئی ہو۔ لوگ سکھا شاہی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ملکہ کے دور میں ہر طرف امن و سلامتی کا دور شروع ہوا۔ لوگ آزادی سے اپنے مذہب پر عمل کرنے

لگے۔ ضروریات زندگی سستی تھیں اور لوگ نیک اور متوکل تھے۔''

سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں حضرت اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی شاہی مسجد لاہور کی بے حُرمتی کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھار کھی چنانچہ جناب محمد عبد اللہ قریشی نے رسالہ نقوش لاہور نمبر صفحہ 567 میں لکھا ہے:-

"سکھوں کے آخری دور میں مسجد کے صحن سے اصطبل کا کام لیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر اُس کے دروازے بند تھے۔ انگریزوں کے آنے تک مسجد کی حالت نہایت خراب وخستہ ہو چکی تھی۔ 1856ء میں سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کی سفارش پر حکومت ہند نے مسجد مسلمانوں کو واگزار کی اور اس میں ایک بار پھر خدا کا نام گونجنے لگا۔"

الغرض برطانوی حکومت کی آمد سے مسلمانوں کی ترقی اور خوشحالی کا نیا دور شروع ہوا اور مدتوں کے بعد انہیں پہلی بار پورے ملک میں اپنے مذہبی فرائض بجالانے کی آزادی ملی۔ اور یہ ایسی نعمت ہے جس کا عملی شکریہ مسلمانانِ ہند نے اسلامی روایات کے عین مطابق اپنی بے لوث خدمات اور سچی وفاداریوں سے دیا۔ جس میں ہندوستان کی مسلم ریاستوں (رام پور، بھوپال، حیدر آباد اور بہاولپور) میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو تاریخ کا حصہ ہے۔

مسلمانانِ ہند کے مقابل ابوالکلام صاحب آزاد 1905ء میں ہندو کانگریس اور غدر پارٹی سے وابستگی کے بعد کس طرح بغاوت کے شعلے بھڑکانے میں سرگرم ہو گئے؟ علاّمہ الطاف حسین پانی پتی نے محمڈن اینگلو اورنیٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سالانہ (27 تا 30 دسمبر 1898ء) کے نام پیغام میں فرمایا:

"اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو ان کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا۔ وہ اپنی سلامتی بلکہ اپنا وجود ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتی ہے۔"[16]

حواشی:

1 بحوالہ "حواشی ابوالکلام آزاد۔ زیر مطالعہ کتابوں پر" صفحہ 32-34۔ مرتب سید مسیح الحسن۔ ناشر مکتبہ قدوسیہ غزنی اسٹریٹ لاہور۔ جنوری 1992ء۔

2 الہلال کلکتہ 10 مارچ 1913ء صفحہ 10 کالم 1۔

3 اقبال کے ممدوح علماء صفحہ 103۔ مولف قاضی افضل حق قریشی ناشر مکتبہ محمودیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور اشاعت دوم اگست 1978ء۔

4 "مونالا ابوالکلام آزاد نے پاکستان کے بارے میں کیا کہا" صفحہ 48 تا 51 از احمد حسین کمال ناشر مکتبہ جمال اردو مارکیٹ لاہور۔

5 لینن منتخب تصانیف حصہ چہارم صفحہ 232 ناشر دارالاشاعت ترقی ماسکو 1971ء۔

6 ایضاً حصہ دوم صفحہ 317 دارالاشاعت ترقی ماسکو 1969ء و حصہ چہارم صفحہ 341 دارالاشاعت ترقی ماسکو 1971ء۔

7 "ابوالکلام آزاد اور قوم پرست" مسلمانوں کی سیاست صفحہ 58 از محمد فاروق قریشی۔ ناشر مکتبہ فکر و دانش اشاعت مئی 1991ء۔

8 ایضاً صفحہ 417-418 حصہ دوم۔

9 ایضاً صفحہ 418۔

10 تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم تالیف سید ہاشمی فرید آبادی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ کراچی طبع دوم 1985ء۔

11 تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت صفحہ 311-312۔ جلد دوم۔

12 "ترکوں کے ارمنوں پر فرضی مظالم" صفحہ 23 شائع کردہ مجلس خلافت پنجاب۔ اشاعت 1920ء سیالکوٹ۔

13 دبدبۂ امیری صفحہ 217-221 مترجم سید محمد حسن بلگرامی حیدرآباد دکن اشاعت جولائی 1901ء مطبع شمسی آگرہ۔

14 ترجمہ صفحہ 183-184 ناشر تخلیقات ٹمپل روڈ لاہور اشاعت 1997ء۔

15 اردو ترجمہ صفحہ 1105-1107۔ ناشر تخلیقات ٹمپل روڈ لاہور اشاعت 1997ء۔

16 "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشن کا بارھواں سالانہ اجلاس" صفحہ 232 مرتب نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں۔ مطبع مفید عام آگرہ 1899ء۔

نویں فصل

دیوبند۔ سوشلزم اور غدر پارٹی کا مرکز

جناب آزاد نے نہ صرف خود غدر پارٹی کی حیثیت ہی سے انقلابی کارنامے انجام دیئے بلکہ اُن کی کوشش سے دارالعلوم دیوبند بھی غدر پارٹی، سوشلزم اور کانگرس کی سرگرمیوں اور مخفی منصوبوں کا مضبوط مرکز بن گیا اور ہندو کانگرس کو اپنے ایجنٹوں کی فوج ہاتھ آ گئی اور اندورن ملک فساد برپا کرنے کی شرعی اور مذہبی سند بھی فراہم ہو گئی۔ چنانچہ سوشلسٹ انقلابی مولانا حسین احمد دیوبندی اپنے سیاسی استاد مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) کے اصل چہرے سے نقاب اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "حضرت شیخ الہند نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کرایہ پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے۔ اس میں حضرت کے غیر مسلم دوست اور رفقاء انقلاب ٹھہرا کرتے تھے۔ ان کو نہایت راز داری کے ساتھ خدام خاص ٹھہرا دیتے تھے اور اُن کے کھانے پینے کے انتظامات کرتے رہتے تھے۔ اکثر تنہائی کے اوقات میں یارات کو اُن سے حضرت شیخ الہند کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال) پارٹیشن والے ہوتے تھے۔ چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا، اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہیں ہو سکے.... علاوہ مذکورہ بالا حضرت کے، غیر مشہور حضرات اس تحریک کے **ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر بے شمار تھے جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے۔**"[1]

یاغستان میں بغاوت اور اس کی ناکامی

اوپر جناب ملیح آبادی کا حقیقت افروز بیان درج ہو چکا ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ آزاد صاحب بنگال کے علاوہ سرحد یعنی یاغستان میں بھی شورش بپا کرنے کی کمان کر رہے تھے۔ یاغستان میں اُن کے انقلابی دوست محمود الحسن اُن کے نائب تھے علاوہ ازیں انہوں نے کئی بار براہ راست مولوی عبید اللہ سندھی کو بھیجا تا انگریزی حکومت کے خلاف غدر پارٹی کی بغاوت کے شعلے تیز سے تیز کر دیں۔[2] سندھی صاحب نے اپنی ذاتی ڈائری میں کھلا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے دو سال تک دہلی میں آزاد صاحب کی ہدایت پر انقلابیوں سے گہرے مراسم پیدا کر لئے اور "اعلیٰ سیاسی طاقت" (یعنی بین الاقوامی سوشلزم) سے متعارف ہوئے۔

اگست 1914ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ چونکہ بنگال کی طرح یاغستان بھی بغاوت کا مرکز بن گیا اس لئے انگریزی فوج نے نام نہاد مجاہدین اور درپردہ غدر پارٹی کے ایجنٹوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا جس پر انہوں نے فریاد کی کہ:-

"جب تک کسی منظم حکومت کی پشت پناہی نہ ہو ہماری شجاعت اور جانبازی بیکار ہے۔"[3]

یاغستان میں غدر پارٹی اور کانگرس کے انقلابیوں کی شرمناک شکست کا دوسرا اور سب سے بڑا سبب افغانستان حکومت کی زبردست مخالفت اور ان کے خلافِ اسلام ہتھکنڈوں کے خلاف جارحانہ کارروائی تھی جس کی تفصیل "دیوبندی انقلابی" حسین احمد مدنی کے قلم سے درج ذیل کی جاتی ہے:-

"پیش بندی کے طور پر انگریزی فوجیں قدیمی سرحدوں سے آگے یاغستان میں میلوں داخل ہو گئیں اور متعدد مقامات پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدین کب تک صبر کر سکتے تھے۔ انہوں نے نہایت جوش اور جوانمردی سے یکے بعد دیگرے ایسے زوردار متواتر حملے کئے کہ پلٹنوں کی پلٹنیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالیں اور پھر فوجیں آگے بڑھ گئی تھیں۔ ان کی امداد اور رسد بندی کر دی اس طرح ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کا وارا نیارا ہو گیا اور سامان تو کروڑوں کا تلف ہو گیا۔... امیر حبیب اللہ خاں کو درمیان میں ڈالا گیا اور سرداران قبائل اور مجاہدین کو توڑا اور زرپاشی کی سبیل اختیار کر کے بچی کھچی سپاہ کو واپس لانا پڑا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اشرفیوں اور روپیوں کی بھرمار کر کے یاغستان کے سرداروں کو توڑ لیا اور یہ پروپیگنڈا کرایا کہ جہاد بغیر بادشاہ کے شریعت اسلامی میں درست نہیں۔ مسلمانوں کے بادشاہ ان اطراف میں امیر کابل حبیب اللہ خاں ہیں۔ تم ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر کے منظم ہو جاؤ۔ جب امیر صاحب اٹھیں اور علم جہاد بلند کریں، سب ان کے ساتھ ہو کر جہاد کرنا۔ سردار نائب السلطنت امیر نصر اللہ خاں اس کے ناظم بنائے گئے اور تمام بیعت نامہ کے کاغذات ان کے پاس جمع ہونے لگے۔ اس پروپیگنڈے پر پانی کی طرح روپے بہائے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ "مجاہدین" کی قوت کمزور ہو گئی۔ چند لڑائیوں کے بعد جن میں "مجاہدین" کو کامیابی اور انگریزوں کو ناکامی ہوئی تھی۔ پانسہ پلٹ گیا اور ادھر تو "مجاہدین رسد اور کارتوس کے خرچ ہو جانے کی وجہ پورے اجتماع کو سنبھال نہ سکے تھے۔ ادھر دیہاتوں

کے مکھیا اور سرداران قبائل لوٹ گئے، ادھر عوام امیر کابل کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اپنے جوش وخروش کو قائم نہ رکھ سکے۔ بالآخر جماعت کو چند مہینوں کے بعد شکست اٹھانی پڑی اور انتشار ہو گیا۔"[4]

امان اللہ خاں والئی افغانستان (حکومت 1919ء تا 1929ء) کے دور میں کابل ہندوستان کے انقلابیوں اور روس کے کمیونسٹوں کا پُراسرار مرکز بن گیا۔ چنانچہ جناب آباد شاہپوری اپنی کتاب "روس میں مسلمان قومیں" کے حاشیہ صفحہ 134 پر تحریر فرماتے ہیں:

"(امان اللہ خاں والئی افغانستان) کے زمانے میں کابل کمیونسٹ ایجنٹوں کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ان کا سرغنہ میخائیل براؤن تھا جو زار کا ڈپلومیٹ رہ چکا تھا اور اب کمیونسٹوں کے چڑھتے سورج کی پوجا کرنے لگا تھا۔ ان ایجنٹوں کا ہندوستان کے آزادی پسندوں سے جو کابل میں مقیم تھے، گہرا ربط تھا۔ میخائیل کا ایک خط برطانوی انٹیلی جنس کے ہاتھ لگا جس میں اُس نے بالشویک حکومت کے پراپیگنڈا محکمہ برائے مشرقی کو لکھا تھا کہ کابل میں مقیم ہندوستانی انقلابیوں کے ساتھ گہرے روابط استوار کرنے میں خاصی کامیابی ہو رہی ہے۔ (آرنلڈ فلیچر صفحہ 195)۔ بالکل ابتدائی دنوں میں برطانوی انٹیلی جنس کے ہاتھ دو خطوط لگے۔ ایک امان اللہ خاں[5] کا خط جو اُس نے لینن کے نام لکھا تھا اور دوسرا محمود طرازی کا جو اس نے بالشویک وزیر خارجہ کو تحریر کیا تھا۔ دونوں خطوط سے آرنلڈ فلیچر کے بقول بالشویک حکومت کے ساتھ اخلاص اور تپاک کا اظہار ہوتا تھا۔" (ص 195)

حواشی:

1 نقش حیات جلد دوم صفحہ 627۔

2 نقش حیات جلد دوم صفحہ 557۔

3 ایضاً صفحہ 562۔

4 ایضاً جلد دوم صفحہ 604-605۔

5 ولادت 1892ء۔ حکومت سے برطرفی جنوری 1929ء۔ وفات 1960ء۔

دسویں فصل

بین الاقوامی سوشلسٹ پارٹیوں سے استمداد

اب غدر پارٹی اور ہندو کانگرس کو یہ منصوبہ بنانا پڑا کہ نہ صرف مسلمان حکومتوں بلکہ بین الاقوامی سوشلسٹ قوتوں سے براہ راست رابطے کر کے اُن سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے لئے (جو مسلم مفاد کے صریح مخالف ہونے کے باعث تحریک بربادی تھی) امداد حاصل کی جائے اور19 فروری1915ء کو فیروز پور کی ایک رجمنٹ کے اسلحہ خانہ اور میگزین (Magazine) پر قبضہ کر کے غدر پارٹی کی حکومت کا اعلان کر دیا جائے۔ اس پر حکومت کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا گیا اور اس کے سالارِ اعلیٰ دیوبندی مولوی محمود الحسن اور مولوی عبید اللہ سندھی مقرر کئے گئے۔[1] تا مسلم ممالک سے آزادی کے نام پر امداد لی جاسکے۔ غدر پارٹی نے اس بغاوت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے مولوی محمود الحسن کو حجاز بھیجا تا ترکی سلطنت سے جس کا مدینہ منورہ پر قبضہ تھا، ہندوستانیوں کے انقلابِ آزادی سے متعلق پارٹی کی جدوجہد کا ذکر کریں اور باضابطہ طور پر امداد کے طالب ہوں۔ ان دونوں انقلابیوں کو غدر پارٹی نے اپنی خفیہ مگر فرضی حکومت کے سالار اعلیٰ کا عہدہ عطا فرما دیا تھا۔ چنانچہ محمود الحسن نے مدینہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ انور پاشا اور سویز' سینا اور حجاز کے محاذ پر متعین ڈویژن کے کمانڈر جمال پاشا سے ملاقات کی۔ انہوں نے یقین دلایا کہ ہم اہلِ ہند کی آزادی کے لئے پوری جدوجہد عمل میں لائیں گے اور ہندوستانیوں کی ہر ممکن امداد واعانت کریں گے۔ دو تین دن کے بعد ان ترکی لیڈروں کی دستخطی تحریرات بھی پہنچ گئیں۔ جن میں ہندوستانیوں کے مطالبہ آزادی کے استحسان اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بارہ میں ہر ممکن معاونت کا وعدہ تھا۔[2] لیکن یہ سارا راز فاش ہو گیا اور محمود الحسن صاحب انگریزی مالٹا میں قید کر لئے گئے۔ رہائی کے بعد بمبئی پہنچے جہاں گاندھی کی تحریکِ خلافت کے کارکنوں، دیوبند کے علماء اور غدر پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے مقامی باشندوں نے اُن کا پُرجوش استقبال کیا۔ بمبئی میں قیام کے دوران مہاتما گاندھی سے بھی مولوی عبد الباری فرنگی محل کے مکان پر خفیہ ملاقات ہوئی جس کے بعد وہ بذریعہ ریل دیوبند کے لئے روانہ ہوئے تو رستہ میں دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، مظفر نگر اور دیوبند کے عوام جن میں (مسلم و غیر مسلم) عوام نے ان کا پُرجوش سواگت کیا۔[3]

غدر پارٹی کی طرف سے محمود الحسن کے علاوہ مولوی عبید اللہ سندھی کو کابل اور ٹرکی بھجوا دیا[4]

جو بعد ازاں پارٹی کی ہدایات کے مطابق سالہاسال تک روسی سوشلسٹوں کے مہمان رہے اور مسلمانوں کو سوشلسٹ بنانے کی مذہبی تجاویز پر غور و فکر میں منہمک رہے اور اشتراکیت کے پُرجوش مبلّغ بن کر وطن لوٹے۔

جناب سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری کے بہت سے خفیہ اوراق مولوی حسین احمد مدنی نے اپنی کتاب "نقشِ حیات" میں شائع کر دیئے ہیں جن سے غدر پارٹی کی شورش کے اصل حقائق سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔

جناب سندھی صاحب کی ذاتی ڈائری سے قطعی طور پر شہادت ملتی ہے کہ انہیں ابوالکلام آزاد صاحب کے ذریعہ غدر پارٹی کی سیاسیات کے نشیب و فراز کا علم ہوا اوران کے ذریعہ انہیں اس پارٹی کے اغراض و مقاصد اور طریق کار سے پوری طرح شناسائی حاصل ہوئی (صفحہ 367) ازاں بعد وہ یاغستان کی شورش میں شریک ہوگئے۔ بعد ازاں پہلے افغانستان گئے اور پھر جرمنی پہنچے جس میں سوشلزم کا چرچا تھا اور جہاں برلن میں ہندوستانیوں نے کانگرس کی ایک شاخ انڈین نیشنل پارٹی کے نام سے قائم کر رکھی تھی جس میں راجہ مہندر پرتاپ، ہردیال اور مولوی برکت اللہ وغیرہ شامل تھے۔ (صفحہ 570) سندھی صاحب نے ہندو ممبروں سے خاص طور پر تبادلہ خیالات کیا۔ اورانہوں نے ہندوستانی مشن کو بتایا کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام نے اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کر رکھا ہے (صفحہ 577) سندھی صاحب کا بیان ہے راجہ مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ نے مل کر ہندوستان کے لئے ایک عارضی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ **ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے ساتھ دو سکھ بھی تھے جو غدر پارٹی کے ممبر تھے۔**" (صفحہ 594)

سندھی صاحب لکھتے ہیں۔ "ہم نے کابل کانگرس کمیٹی بنائی جس کا روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھا۔ اس کا الحاق کانگرس میں منظور ہوگیا۔ ڈاکٹر نور محمد ہماری کانگرس کمیٹی کا افسر تھا۔ مہاتما گاندھی اور کانگرس کے نوجوان ممبر اسے جانتے تھے.... ہماری کانگریس کمیٹی سب سے پہلی وہ کمیٹی ہے جو برٹش امپائر سے باہر قائم ہوئی تھی۔" (صفحہ 595)

جناب سندھی صاحب نے اپنی ڈائری کے آخر میں یہ راز سربستہ بھی طشت از بام کر دیا کہ وہ ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی پارٹی کے ہاں مہمان ہوگئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"سوویٹ ایشیا سے تعلقات کی ابتداء اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ کی اجازت اور مصلحت سے بروئے کار آئی جس میں راجہ مہندر پرتاپ نے کافی حصہ لیا۔ انہیں کی

تجویز پر ہمارے نوجوان آتے جاتے رہے۔ جب ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی حکومت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا تو اس کے لیڈر جو بندرناتھ رائے مقرر ہوئے جو اسے کئی سال تک چلاتے رہے۔ اس لئے ہمارے دوست بن گئے اب ہم.... دریائے جیحوں ترمذ میں **سوویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے اور دنیا کی انٹر نیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کر دیا۔**"[5]

مولوی عبید اللہ سندھی اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"1923ء میں ترکی جاتا ہوا سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ اس لئے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا۔ کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے، اس زمانے کے لادینی حملے سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔ میں اس کامیابی پر اوّل انڈین نیشنل کانگریس، دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقاء جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی، **سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکر گزار رہوں گا۔** اگر ان طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔"[6]

یہاں مناسب ہو گا کہ غدر پارٹی کی مجوزہ انڈر گراؤنڈ حکومت کے صدر مہندر پرتاپ کی کہانی برٹش گورنمنٹ کی مستند رواٹ رپورٹ سے معلوم کر لی جائے۔ رپورٹ میں لکھا ہے:

"یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے۔ 1914ء کے اخیر میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں سے بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا عبید اللہ کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا ورما کا دوست اور **امریکن غدر**

پارٹی کا ممبر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فرنیٹرنٹی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس اخبار کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر برادری سے جا ملا۔ 1916ء کی ابتدا میں مشن کے جرمن ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے۔ اور حکومت موقتہ (پرووبژنل گورنمنٹ) نے رُوسی ترکستان کے گورنر اور زارِ روس کو خطوط بھیجے جن میں اُن سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاپ کے دستخط تھے اور یہ خطوط بعد میں **برطانیہ کے ہاتھ میں آ گئے۔ زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔**"[7]

مولوی عبید اللہ سندھی کے بھجوانے اور قیام کے سبھی انتظامات آل انڈیا نیشنل کانگریس کے رہین منت تھے۔ سندھی صاحب اپنی مراجعت وطن کی نسبت لکھتے ہیں۔

"1936ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی۔ مجھے یکم نومبر 1937ء کو اجازت واپسی وطن کی اطلاع ملی۔"[8]

جناب سندھی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی اس یقین سے لبریز تھے کہ **احمدیوں کا مقابلہ مولویوں سے نہیں صرف سوشل ازم کے انقلاب سے ممکن ہے۔** چنانچہ پروفیسر محمد سرور سابق استاد جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی مولوی عبید اللہ سندھی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"غلطی یہ ہوئی کہ ہمارے علمائے کرام نے احمدیت کو ایک اعتقادی مسئلہ بنا دیا اور اعتقادیات کی جنگ کبھی فیصلہ کن نہیں ہوتی کیونکہ اس میں تاویلوں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے اور مرزا صاحب سے لے کر ایک عام مبلغ اور مناظر تک فن تاویل میں احمدیوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا.... احمدیت ایک سماجی مظہر (Phenomenon) ہے۔ تحریک ختم نبوت جیسی تحریکیں نہ پہلے اُن کا کچھ بگاڑ سکی ہیں اور نہ آئندہ بگاڑ سکیں گی۔ بلکہ ان سے اتحاد، ربط وصلابت پیدا ہوگی۔ جیسا کہ اب تک ہوا ہے۔

احمدیت اور اس قسم کی دوسری علیحدگی پسند اور رجعت پسند اور استعمار دوست مذہبی تحریکوں سے ایک ترقی پسند سماج اور سیکولر اور **سوشلسٹ سیاسی نظام ہی کامیابی سے عہدہ برآہو سکے گا۔** اعتقادی ہتھیاروں سے یہ لڑائی نہیں لڑی جاسکتی۔"[9]

مسلمانان ہند کی بغاوت سے بیزاری

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ احمدی مسلمانوں کی طرح اکثر دوسرے مسلمانان ہند نے بھی ہندوؤں کی شورشوں کو سخت تنفر سے دیکھا اور وہ بحیثیت قوم ان سے الگ رہے جس کا ثبوت حسب ذیل سپاسنامہ سے ملتا ہے جو پراونشل مسلم لیگ کے اڑتالیس اصحاب کے ایک وفد نے یکم اپریل 1911ء کی شام کو یونیورسٹی ہال لاہور میں ہز ایکسی لینسی دی رائٹ آنریبل چارلس بیرن ہارڈنگ وائسرائے و گورنر جنرل ہندوستان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وفد کے علامہ اقبال بھی ممبر تھے۔

"ہم اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں کہ یورایکسی لینسی کو جو ہندوستان میں ہمارے نہایت مہربان فرمانروا کے نائب ہیں، اسلامی جماعت کی تاج برطانیہ کے ساتھ غیر متبدل وفاداری وجان نثاری کا یقین دلائیں۔ ہم درحقیقت ایسی شاندار سلطنت کی شہریت پر متفخر ہیں.... پنجاب کے اہل اسلام نے ہمیشہ اس کو اپنا مقدس فرض سمجھا ہے کہ حکام کو امن وانتظام برقرار رکھنے میں پوری مدد دیں اور انہوں نے بار بار نہ صرف الفاظ بلکہ افعال واعمال کے ذریعہ سے برٹش مقصد کے ساتھ اپنی تمام تر دلی عقیدت کا کافی ثبوت دیا ہے۔ جب گزشتہ چند سال میں ہندوستان کا پولیٹیکل مطلع اس صوبے میں بھی سیڈیشن(Sedition) اور بے چینی کے بادلوں سے مکدر ہو رہا تھا۔ مسلمانوں نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اپنی برٹش گورنمنٹ کی مستحکم عقیدت میں پس وپیش نہیں کیا۔"

"ہم ایک بار پھر اپنی دلی نفرت کا اظہار ان انارکسٹوں کی کارروائیوں پر کرتے ہیں جنہوں نے گزشتہ سالوں میں اہل ہند کی بے عیب نیک نامی پر ایک بدصورت داغ لگا دیا ہے اور بہ نظر انارکسٹانہ جرائم کے پھر پھوٹ پڑنے کے جیسا کہ کلکتہ میں حال کے جرائم سے ظاہر ہوا ہے، ہم قومی فرض سمجھتے ہیں کہ اس شرمناک تحریک پر اپنی زوردار ناراضگی کا اظہار کریں جس کا نتیجہ یہ خوفناک جرائم ہیں۔"[10]

حواشی:

1 منصوبہ کے مطابق مقررہ دن 40 انقلابی اور شورش پسند جن میں گنتی کے چند مسلمان بھی تھے ریل کے ذریعہ فیروز پور پہنچے مگر فوج پہلے ہی الرٹ ہو چکی تھی اس لئے یہ سازش بری طرح ناکام ہو گئی (نقش حیات جلد دوم صفحہ 662)۔

2 ایضاً صفحہ 641-642۔

3 ایضاً صفحہ 650 تا 658۔

4 ایضاً جلد دوم صفحہ 563۔

5 نقش حیات جلد دوم صفحہ 557 تا 580 از حسین احمد مدنی دارالاشاعت کراچی۔

6 ذاتی ڈائری صفحہ 22-23۔ ناشر ادبستان بیرون موچی دروازہ لاہور طبع اول اکتوبر 1946ء۔

7 بحوالہ "نقش حیات" جلد دوم صفحہ 241-242۔ تالیف مولوی حسین احمد ناشر محمد السعد ابن مولوی حسین احمد مطبع الجمعیۃ دہلی اشاعت 1954ء۔

8 ذاتی دائری صفحہ 27۔ ناشر ادبستان۔ بیرون موچی دروازہ لاہور طبع اول اکتوبر 1946ء۔

9 افادات وملفوظات حضرت مولوی عبیداللہ سندھی صفحہ 13-414۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور۔ ناشر سندھ ساگر اکادمی ریٹی گن روڈ لاہور اکتوبر 1987ء۔

10 اقبال صفحہ 58-59 (عتیق صدیقی) ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی اگست 1980ء۔

گیارھویں فصل

لینن اور ہندوستان کے سوشلسٹ

اب ہمیں یہ بتانا ہے کہ روس کے سرخ انقلاب کے بعد لینن نے 22 نومبر 1919ء کو دنیا بھر کی سوشلسٹ تنظیموں کی دوسری کل روسی کانگرس کو بتایا:

"ہمیں معلوم ہے کہ 1905ء کے بعد ترکی، ایران اور چین میں انقلاب آئے اور **ہندوستان میں بھی ایک انقلابی تحریک ابھری**۔ اسی طرح سامراجی جنگ میں بھی انقلابی جدوجہد کے لئے پوری نو آبادیاتی رجمنٹیں بھرتی کرنا پڑیں۔ سامراجی جنگ نے مشرق کو بھی جھنجھوڑ دیا، چونکا دیا۔ اور مشرق کی قوموں کو مسلّح کیا اور انہیں فوجی تکنیک اور جدید ترین مشینوں سے روشناس کیا۔ اس علم کو وہ سامراجی نوابوں کے خلاف استعمال کریں گی۔ اس موجودہ انقلاب کے دوران میں مشرق کی قوموں کی بیداری کا دور ختم ہو کر اب ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔"

ہندوستان میں انقلابی تحریک کے خصوصی تذکرہ کے بعد لینن نے کہا۔

"عالمی انقلاب کے ارتقا کی تاریخ میں اور انقلاب کے آغاز کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ابھی اور کئی سال چلے گا اور اس کے سلسلے میں بڑی کوشش اور جاں فشانی کی ضرورت ہو گی۔ انقلابی جدجہد میں اور انقلابی تحریک میں **آپ لوگوں کو اہم رول ادا کرنا ہے اور اس انقلابی جدوجہد کا بین الاقوامی سامراج کے خلاف ہماری جدوجہد سے ناطہ جوڑنا ہے**۔ بین الاقوامی انقلاب میں شرکت آپ کے لئے ایک کٹھن اور پیچیدہ فریضہ لائے گی اور اس فریضے کی انجام دہی ہماری مشترکہ کامیابی کے لئے بنیاد کا کام دے گی کیونکہ اس وقت زیادہ لوگ پہلی دفعہ چونک کر، بیدار ہو کر آزاد عمل اور حرکت کے میدان میں قدم رکھ رہے ہیں۔ اور وہ بین الاقوامی سامراج کو نیست و نابود کرنے میں ایک سرگرم اور باعمل عنصر ہوں گے۔"[1]

ماسکو میں کانگرس اور ہندوستان سے روابط میں استحکام

2 تا 6 مارچ 1919ء کو ماسکو میں کمیونسٹ انٹر نیشنل کی پہلی کانگرس نے ساری دنیا کے پرولتاریہ کے لئے مینی فیسٹو منظور کیا جس میں بتایا گیا کہ کمیونسٹ انٹر نیشنل مارکس اور اینجلز کے ان نظریات کی حامل ہے جن کا اظہار اس میں کیا گیا ہے۔ دستور کی منظوری کے بعد کمیونسٹ انٹر نیشنل نے ممالک عالم خصوصاً ہندوستان کے سوشلسٹوں سے اپنے روابط غیر معمولی طور پر پہلے سے زیادہ مستحکم اور وسیع کرنے شروع کر دیئے۔[2] ایک ماہ بعد امرتسر کے جلیانوالہ باغ کا خونیں واقعہ پیش کیا۔ ایک روسی دانشور اس سانحہ کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ”13 اپریل 1919ء کو پنجاب کے ایک اہم صنعتی شہر امرتسر میں برطانوی فوجیوں نے ہزاروں محنت کشوں کے جلسے پر گولی چلائی جو برطانوی نو آبادکاروں کے جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ اس میں تقریباً ایک ہزار آدمی مارے گئے اور دو ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔
>
> امرتسر کے قتل وغارت کے جواب میں پنجاب میں عوامی بغاوت پھوٹ پڑی اور اس کی لہر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ برطانوی نو آبادکاروں نے پنجاب کی بغاوت کو بُری طرح کچل دیا۔“[3]

صدر روس لینن نے کمیونسٹ انٹر نیشنل کی تیسری کانگرس میں جلیانوالہ کے قتل عام کا اپنی تقریر میں خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے کہا:

> ”نو آبادیاتی عوام اور نیم نو آبادیاتی ملکوں کے محنت کش عوام میں جن پر دنیا کی آبادی کی اکثریت مشتمل ہے۔ سیاسی زندگی کا احساس بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا.... برطانوی ہندوستان ان ملکوں میں سر فہرست ہے اور وہاں انقلاب اتنی ہی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے جتنا کہ ایک طرف صنعت اور ریلوے کے پرولتاریہ میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف جتنا اضافہ انگریزوں کی وحشیانہ دہشت انگیزی میں ہو رہا ہے جو اکثر قتل عام (امرتسر) اور منظر عام پر جسمانی اذیت وغیرہ پہنچانے کے مرتکب ہوتے ہیں۔“

نہرو۔ کانگرس میں سوشلسٹوں کے لیڈر

جناب ابوالکلام آزاد نے غدر پارٹی میں شامل ہو کر سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے اور بنگالی سادہ

مزاج مسلمانوں اور ملک کے دیوبندی علماء کو اپنے گرد جمع کرنے کے جو "کارہائے نمایاں" دکھلائے، اُن کی بدولت انہوں نے ہندو آل انڈیا نیشنل کانگرس میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا اور وہ جواہر لال نہرو کی آنکھ کا تارا بن گئے جو کانگرس کے سوشلسٹ ممبروں کے لیڈر تھے۔ اُن کی سوشل ازم سے وابستگی جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کو ہندوستان کی نجات اور اس کی معاشی مسائل کا واحد حل سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک بار الہ آباد میں منعقد ہونے والی انڈین اکنامکس کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"سوشلزم کے سوا ہماری اقتصادی نجات کا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ سیاسی جمہوریت کا تجربہ بالکل ناکام ہو چکا ہے اور جب تک ہم اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی جمہوریت کو قائم نہیں کرتے، یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جمہوریت اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے **کہ اس کی بنیاد سوشلزم پر رکھی جائے۔**"[4]

انہوں نے سینٹرل جیل نینی تال سے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے تیرھویں جنم دن کے موقع پر ایک خط میں لکھا:

"جس سال (1917ء) تم پیدا ہوئیں، وہ تاریخ کا ایک یادگار سال تھا۔ اسی سال ایک عظیم الشان لیڈر نے جس کا دل غریبوں کی محبت اور مظلوموں کی ہمدردی سے لبریز تھا، اپنے ملک کے لوگوں سے ایسا شاندار کام کرایا جو تاریخ کے اوراق سے کبھی مٹ نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی مہینہ میں جس میں تم پیدا ہوئیں، لینن نے وہ زبردست انقلاب شروع کیا جس نے روس اور سائبیریا کا نقشہ بدل دیا۔"[5]

خود پنڈت جی کا بیان ہے کہ:-

"میں ہندوستان میں اشتراکیت کا ہراول نہیں تھا بلکہ سچ پوچھئے تو میں اس میدان میں بہت پیچھے تھا اور بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ قدم اٹھایا تھا۔ بہت سے لوگ مجھ سے آگے نکل چکے تھے اور میں اُن کے روش نقش قدم پر چل رہا تھا۔ مزدوروں کی اشتراکیت کی تحریک اور نوجوانوں کی اکثر انجمنیں اصولاً صریح طور پر اشتراکیت کی حامی تھیں۔

ہندوستان میں اشتراکیّت کی ایک دُھندلی سی فضا چھائی ہوئی تھی اور بعض افراد اس سے بھی پہلے اشتراکی خیالات رکھتے تھے۔ زیادہ تر یہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے تھے مگر مارکس کے نظریہ کا اثر روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور چند اشخاص اپنے آپ کو مارکس کا

پورا پیرو سمجھتے تھے۔یورپ اور امریکہ کی طرح ہندوستان میں بھی اس رجحان کو سوویٹ یونین کی نشوونما خصوصاً اس کے پنج سالہ منصوبہ سے تقویت پہنچتی تھی۔

مجھے اشتراکی کارکن کی حیثیت سے جو کچھ اہمیت حاصل تھی، وہ اس وجہ سے تھی کہ میں ایک کانگریسی تھا اور کانگرس میں ایک بڑا عہدہ رکھتا تھا۔ بعض اور مشہور کانگرسیوں پر بھی ان خیالات کا اثر ہو چلا تھا۔ یہ چیز سب سے زیادہ صوبہ متحدہ کی کانگرس کمیٹی میں نمایاں تھی اور ہم نے 1926ء ہی میں اس کمیٹی میں ایک ہلکا سا اشتراکی پروگرام بنانے کی کوشش کی تھی۔"[6]

پنڈت نہرواور ابوالکلام آزاد کے سوشلسٹ افکار

سوشلسٹ ہونے کے ناطہ سے اسلام اور غیر کانگرسی مسلمانوں کا مذاق اڑانے میں ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو دونوں ہم منصب بلکہ ایک جان دو قالب ہو گئے تھے۔پنڈت نہرو کی باطنی کیفیت وذہنیت کا اندازہ کرنے کے لئے اُن کی ایک توہین آمیز تحریر کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

"مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنٰی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، صرف مذہبی اخوت کا رشتہ ایک چیز ہے اور اس لئے کوئی قوم (جدید مفہوم میں) ترقی نہ کرنے پائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید تہذیب وتمدن کو ترک کرکے ہم لوگ عہد وسطٰی کے طریقوں کو پھر اختیار کریں یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیئے یا بدیسی حکومت۔"

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہوتا تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔"[7]

یہی سیاسی وعظ و تلقین جناب ابوالکلام آزاد کی عمر بھر کا مقدورِ حیات رہا۔ فرماتے ہیں:

"اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب ومعاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار سال پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں اُن سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ

نہیں سکتے.... اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلہ پر رضامند ہونا چاہئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہئے۔"[8]

مسلمانان ہند کی توہین اور ہندوؤں کی تعریف

جناب آزاد نے مسلمانوں کو ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم کے ذلّت آمیز اور قابلِ شرم نام سے یاد کیا اور لکھا کہ آئندہ مورخ یہ لکھے گا کہ ہندوؤں نے ملکی ترقی اور ملکی آزادی کے لئے جہاد کیا۔ وہ اٹھے اور انہوں نے اپنی "تمام قوموں کو ملکی جہاد کے لئے صرف کر دیا۔" دنیا یاد رکھے گی کہ جو کچھ ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا جو مسلم نہ تھی۔ پر جو **"مسلم" تھے انہوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی اور سربلندی کی جگہ سجدۂ مذلّت کی کوشش کی....** ملک کو حکومت کی خود اختیاری ملی تو صرف ہندوؤں۔ قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لئے تازیانہ عبرت، ہندوؤں کی وجہ کیونکہ انہوں نے پالیٹکس (Politics) شروع کی اور پھر پالیٹکس کو سمجھا۔ مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لئے روئیں۔ پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔"[9]

یہی آزاد "انباء الالیم" کے زیر عنوان گاندھی کی شرمناک ثناء خوانی کرتے ہوئے انہیں مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب سے نوازتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "مسٹر گاندھی نے اس راہ میں اپنی جان اور مال دونوں لٹا دیا پس فی الحقیقت وہ مجاہد فی سبیل اللہ ہیں اور بانفسھم وباموالھم کے ہر دو مراحل جہادِ مقدس سے گزر چکے ہیں۔"

پھر مسلمانانِ ہند کی صریح توہین کا ارتکاب کرتے ہوئے انہیں بدبخت مسلمان کے نام سے یاد کیا اور لکھا:

> "افسوس کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر مسلمان غافل ہیں اور جس صف میں انہیں سب سے آگے ان کے خدا نے رکھا تھا اپنی بدبختی سے اُس میں سب سے پیچھے بھی ہیں۔"

نیز لکھا:

"آج تک انہوں نے ملک کی تمام خدمتیں صرف ہندوؤں ہی کے لئے چھوڑ دی تھیں اور خود اپنے لئے ہندوؤں کو باغی کہنے کا شریفانہ مشغلہ منتخب کر لیا تھا۔ ملک کی بہتری و فلاح کی فکر ہو تو صرف ہندوؤں کو، جابرانہ قوانین کے خلاف احتجاج کریں تو صرف ہندو، جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے لئے روئیں تو صرف ہندو۔ اگر ایسا ہی ہے تو **خدارا اپنے دلوں میں سوچو کہ بدبخت مسلمان آخر کس مرض کی دوا ہیں؟**"[10]

تحریک پاکستان اور آزاد

احراری "امام الہند" عمر بھر ہندو کانگرس کے مخالف مسلمانوں کی تحریک آزادی (تحریک پاکستان) کی مخالفت میں گاندھی اور نہرو سے بھی ایک قدم آگے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی آخری تصنیف "India Wins Freedom" کے صفحہ 142-143 میں یہاں تک لکھا۔

"I must confess that the very term Pakistan goes against my grain. It suggests that some portions of the world are pure while others are impure. Such a division of territories into pure and impure is un-Islamic and a repudiation of the very spirit of Islam. Islam recognises no such division and the Prophet say, God has made the whole world a mosque for me. Further, it seems that the scheme of Pakistan is a symbol of defeatism and has been built up on the analogy of the Jewish demand for a national home. It is a confession that Indian Muslim cannot hold their own in India as a whole and would be content to withdraw to a corner specially reserved for them.

One can sympathise with the aspiration of the Jews for such a national home, can they are scattered all over the world and cannot in any region have any effective voice in the administration. The condition of Indian Muslim is quite

otherwise. Over 90 millions in number they are in quantity and quality a sufficiently important element in Indian life to influence decisively all questions of administration and policy. Nature has further helped them by concentrating them in certain areas."[11]

یعنی میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبعیت قبول نہیں کرتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو پاک ہے اور باقی ناپاک۔ پاک اور ناپاک کی بنیاد پر کسی قطعۂ ارض کی تقسیم قطعاً غیر اسلامی اور روح اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام اس طرح کی کوئی تقسیم قبول نہیں کرتا۔ آنحضرتؐ کا قول ہے کہ خدا نے ساری دنیا کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔ علاوہ ازیں میں تو محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردگی کی ایک واضح علامت ہے۔ اس کی تعمیر جس بنیاد پر رکھی گئی ہے وہ ہے یہودیوں کے قومی وطن کی مثال۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان کو بحیثیت مجموعی اپنا وطن نہیں بنا سکتے۔ وہ صرف اس ٹکڑے پر قناعت کریں گے جو ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ جہاں تک یہودیوں کے قومی وطن کا مطالبہ ہے اس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہوئے ہیں اور کسی علاقہ میں بھی نظم وانصرام پر کوئی اثر نہیں رکھتے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نوے ملین سے زیادہ ہے۔ وہ کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے ہندوستانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہیں۔ وہ انتظام اور پالیسی کے ہر مسئلہ پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ قدرت نے ان کی مزید مدد اس طرح کی ہے کہ بعض رقبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے۔

جہاں کانگرس کے سوشلسٹ بلاک کے لیڈر جواہر لال نہرو تھے وہاں رام راج کا علم قیادت مسٹر گاندھی کے ہاتھ میں تھا۔ نہرو صاحب فرماتے ہیں:

> ”گاندھی جی.... اس زریں زمانہ کو اکثر رام راج کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔“[12]

تحریک عدم موالات کے اثرات

تحریک عدم موالات کے اصل قائد گاندھی تھے اور ان کی تحریک رام راج کی راہ ہموار کرنے کی غرض سے تھی۔ مسلمانوں کے نظریات وافکار کی صف لپیٹ دی اور گاندھی پرستی کا گہرا رنگ چڑھ

گیا۔اس حقیقت کا خوفناک نقشہ اس دور کے ”انقلابی لیڈر“ مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی اس تقریر سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے اس تحریک کی تائید میں جمعیتہ علماء ہند کے اجلاس میں پڑھی تھی۔ آپ نے بتایا۔

”بہت سے خیر خواہ ہند مسلم اتفاق کے عواقب اور عوام الناس اور بعض لیڈروں کی اُن غلط کاریوں پر متنبہ فرمارہے ہیں جو اس اتفاق کے جوش سے پیدا ہوئی ہیں مثلاً قربانی گاؤ میں بعض جگہ تشدد و مزاحمت کیا جانا۔ یا قربانی کے جانور کو سجا کر رضاکاران خلافت کا گوشالہ میں پہنچانا یا یہ کہنا کہ **امام مہدی کی جگہ امام گاندھی تشریف لائے ہیں یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے یا قرآن وحدیث میں بسر کی ہوئی عمر کو نثار بت پرستی کرنا** یا یہ دعا کرنا کہ اگر میں کوئی مذہب تبدیل کروں تو سکھوں کے مذہب میں داخل ہوں وغیرہ وغیرہ۔

بلاشبہ میں بھی جب اپنی قوم کے بڑے سربر آوردہ کفریات کے مرتکب ہوتے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بے دھڑک نکال دیتے ہیں جن کو سن کر ایک سچے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔“[13]

حواشی:

1 لینن منتخب تصانیف حصہ سوم صفحہ 253-254 دارالاشاعت ترقی ماسکو 1970ء۔

2 ایضاً حصہ دوم صفحہ 304 دارالاشاعت ترقی ماسکو 1969ء۔

3 ایضاً حصہ چہارم صفحہ 340 دارالاشاعت ترقی ماسکو 1971ء۔

4 الفضل 11 جنوری 1940ء صفحہ 8۔

5 تاریخ عالم پر ایک نظر (Glimpses of The World History) صفحہ 11 از جواہر لال نہرو ناشر اکرم آرکیڈ ٹمپل روڈ لاہور سن اشاعت 1992ء۔

6 میری کہانی حصہ اول صفحہ 307-309۔ شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی اشاعت 1936ء۔

7 "میری کہانی" حصہ دوم صفحہ 331-332۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔

8 خطبات ابوالکلام آزاد صفحہ 317-319 ناشر ایم ثناء اللہ خاں اینڈ سنز 26 ریلوے روڈ لاہور۔

9 مضامین آزاد صفحہ 110۔ ارسلان بکس علامہ اقبال روڈ میرپور آزاد کشمیر۔ ارشد بک سیلرز چوک شہیداں میرپور آزاد کشمیر۔

10 ”مضامین ابوالکلام آزاد“ صفحہ 155 تا 158۔ ناشر دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی اشاعت دوم جولائی 1962ء۔

11 ناشر اورینٹ لانگ مینز بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس۔ نئی دہلی۔ طبع اول 1959ء۔

12 میری کہانی حصہ اول صفحہ 129 طبع اول ناشر مکتبہ جامعہ دہلی اشاعت 1936ء۔

13 "ترک موالات پر زبردست تقریر" صفحہ 22 ناشر ناظم جمعیتہ علمائے ہند۔ حمیدیہ پریس دہلی۔

بارھویں فصل

مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کا احتجاج

جناب ابوالکلام آزاد کے ہمعصر دیوبندی عالم مولوی اشرف علی صاحب تھانوی چونکہ سیاسیات ہند کے عینی شاہد اور ابوالکلام آزاد اور ان کے دیوبندی رفقاء کے تمام مخفی حالات اور سرگرمیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اس لئے وہ عمر بھر کانگرس کے زرخرید غلاموں اور ان کی ملّی غداریوں پر سر تاپا احتجاج بنے رہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کو بالشویکی روس اور ہندوؤں کا ایجنٹ ثابت کرتے ہوئے واضح لفظوں میں بتادیا۔

> ”**دو کاموں کے خوب ہیں۔ ایک تو جو بات گاندھی کے منہ سے نکل جائے، اُس کو قرآن اور حدیث میں ٹھونسنا اور اُس پر منطبق کرنا۔** دوسرا یہ کہ کوئی بات ہوئی لاؤ چندہ۔ ان دونوں چیزوں میں کمال حاصل کر لیا ہے۔ دیکھ لیجیے اتنا زمانہ گزر گیا، گاندھی نے کسی نئی بات کا اعلان نہیں کیا۔ سب خاموش ہیں۔ اب وہ کسی نئی اسکیم کی فکر میں ہو گا۔ جستجو کر رہا ہو گا جہاں اُس نے کسی چیز کا اعلان کیا، پھر دیکھنا قرآن وحدیث میں بھی وہ چیز نظر آنے لگے گی اور کوئی چیز بھی تو اس تمام تحریک کی ایسی نہیں جو کسی مسلمان لیڈر یا علماء کی تجویز کردہ ہو۔ دیکھ لیجئے۔ اوّل ہوم رول(Home Rule)، گاندھی کی تجویز بائیکاٹ اُس کی تجویز، کھلہ اُسکی تجویز، خلافت کا مسئلہ اُس کی تجویز، ہجرت کا سبق اُسکی تجویز، غرضیکہ جملہ تحریکات میں جس قدر اجزاء ہیں سب اُسکی تجویزات ہیں۔ اُن کا صرف یہ کام ہے کہ جو اُس نے کہا لبیک کہہ کر ساتھ ہو لئے۔ کچھ تو غیرت آنا چاہئے۔ ایسے بدفہموں نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا۔ سخت صدمہ اور افسوس ہے۔ پھر غضب یہ ہے کہ **اُس کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی جائے اور اُس کو واجب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُس سے علیحدہ رہنے والوں کو گمراہ اور مرتکب کبائر کا سمجھتے ہیں۔** خدا معلوم لکھ پڑھ کر کہاں ڈبو دیا۔ گاندھی کے اقوال کا انطباق قرآن وحدیث پر ایسا ہی ہے جیسے ایک گاؤں میں بوجھ بجھکڑ رہتا تھا۔ اتفاق سے اُس گاؤں کے رہنے والوں میں سے ایک شخص کھجور کے درخت پر چڑھ گیا۔ چڑھ تو گیا تھا مگر اترا نہ گیا۔ تمام گاؤں جمع ہو گیا مگر کسی کے کوئی تدبیر ذہین میں نہ

آئی کہ اُسکے اُتر آنے کی درخت سے تدبیر ہے کیا؟ بالآخر بوجھ بجھکڑ بلائے گئے۔ آکر درخت کے پاس کھڑے ہوئے۔ کبھی اُوپر کو دیکھتے ہیں اور کبھی نیچے کو۔ سوچ ساچ کر بولے کہ رسّی لاؤ۔ رسّی لائی گئی۔ کہا کہ اس میں گرہ لگا کر پھندا لگاؤ اور اس کو قوت کے ساتھ اوپر پھینکو اور اُس شخص سے کہا کہ اُس کو پکڑ پھندہ کمر میں ڈال لے غرضکہ رسّا پھینکا گیا۔ اُس نے پکڑ کر کمر میں ڈال لیا۔ اب نیچے والوں سے کہا کہ زور سے جھٹکا مارو۔ انہوں نے زور سے جھٹکا لگایا۔ وہ پٹ سے نیچے آپڑا۔ ہڈی پسلی ٹوٹ گئیں۔ بھیجا نکل کر دور جا پڑا۔ ختم ہو گیا۔ لوگوں نے بوجھ بجھکڑ سے دریافت کیا کہ یہ کیسی تدبیر تھی یہ تو مر گیا۔ بوجھ بجھکڑ جواب میں کہتے ہیں۔ مر گیا تو میں کیا کروں۔ اسکی قسمت! میں نے سینکڑوں آدمی اس ہی صورت سے رسّی کے ذریعہ کنوئیں سے نکلوائے ہیں۔ تو جیسے اس بوجھ بجھکڑ نے قیاس کیا، کنوئیں پر کھجور کے درخت کو۔ ایسا ہی انطباق اور استدلال آجکل کیا جا رہا ہے۔ اسی استدلال کی بدولت (مشاہدہ ہے) موپلوں کی قوم کو تباہ وبرباد کرا دیا۔ ان لیڈروں اور اُنکے ہم خیال مولویوں نے لیکچر دیئے۔ عربی النسل تھے۔ جوش پیدا ہو گیا۔ بھڑک اٹھے پھر جو کچھ اُنکا حشر ہوا، اسکو معلوم ہے۔ پھر ایک لیڈر بھی وہاں نظر نہ آیا۔ کسی نے بھی ان کی امداد نہ کی۔ چاہتے یہ ہیں کہ ہم تو کُرسی صدارت پر بیٹھے رہیں اور لوگ جانیں دیتے رہیں۔ یہ انجام ہوتا ہے بے اصول کاموں کا کہ موپلوں کی قوم برباد ہو گئی۔ بجائے ترقی کے پستی کی طرف پہنچ گئے۔ بالکل وہی صورت ہے کہ کھجور کے درخت سے زمین پر لایا گیا۔ بلندی سے پستی کی طرف آیا۔ انجام ہلاکت ہوا تو یہ جس قدر من گھڑت تدابیر نصوص کے خلاف ہیں انکا درجہ بھی اُس بوجھ بجھکڑ کی تدبیر سے کم نہیں۔ جو انجام وہاں ہوا وہی یہاں ہو گا کہ بلندی سے پستی کی طرف آؤ گے۔ آؤ گے کرو کے خلاف مت کرو۔ حدود شرعیہ کا تحفظ۔ لگاؤ ایڑی چوٹی تک کا زور۔ واللہ ثم واللہ ثم واللہ۔ ایک انچ بھی تو آگے نہیں چل سکتے۔ کر کے دیکھ لو اور یہ ہی دیکھ لو کہ کسی نتیجہ پر پہنچتے ہو یا نہیں۔ مسلمانوں کی فلاح اور اُنکی بہبودی تدابیر منصوبہ ہی میں ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بعض لوگ دعا ماثور کو چھوڑ کر اور طریق دعا کا اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ طریق مقبول اور پسندیدہ خدا اور رسول کا ہوتا تو وہ بھی تو تعلیم کر دیا جاتا۔ جب نہیں کیا گیا اس سے

معلوم ہوا کہ یہ طریق مقبول اور پسندیدہ نہیں اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیر مقبول میں خیر اور برکت کہاں۔ بے برکتی بھی مشاہد ہے اور بے برکتی کے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ یہ اُس شخص کی تعلیمات اور تجویزات ہیں جو توحید اور رسالت کا منکر، اسلام اور مسلمانوں کا دشمن، رئیس المشرکین والکافرین۔ یہ سب اُسکا سبق پڑھایا ہوا ہے۔

تحریک خلافت کے زمانہ میں ہجرت کا رزلیوشن (Resolution) پاس کرنا، اسی پر مسلمان لبیک کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو بے خانماں کرا دیا۔ اس کا جو مسلمانوں کی ذات پر اثر ہوا اور ناقابل برداشت نقصان پہنچا وہ سب کو معلوم۔ پھر ملازمتیں ترک کرنے کی تعلیم دی گئی۔ جن کی متیں ماری گئیں تھیں وہ چھوڑ بیٹھے۔ مسلمانوں نے تو چھوڑیں اور ہندوؤں نے ان کی جگہوں کو پُر کیا۔ بہت سے تو اب تک جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ بعض کے خطوط آتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اُس وقت یہ حماقت ہو گئی تھی۔ اب تک بے روزگاری سے سخت پریشانی ہے۔ یہ سب بے اصول کاموں کے انجام۔ اگر کوئی اصول ہوتا یا کوئی مرکز ہوتا تو ان لوگوں کو کیوں پریشانی ہوتی اور کیوں بددل ہوتے۔ غرضیکہ قدم قدم پر ناکامی اور ذلّت گلوگیر ہو رہی ہے مگر پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ یہ سب مشرک کی تعلیم پر عمل کرنے کے ثمرات ہیں۔ اگر مسلمان تنہا اصول کے ماتحت حدود شرعیہ کا تحفظ کرتے ہوئے اور کسی کو اپنا بڑا بنا کر کام کریں، اپنی مالی اور جانی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں پھر کسی کو بھی اختلافات نہ ہو گا۔ مسلمانوں کے جو مقاصد شرعیہ یا اپنی بہبودی دنیا و دین کے لئے مطالبات ہیں، مجھ کو اُن سے اختلاف نہیں اور نہ کوئی مسلمان اختلاف کر سکتا ہے۔ وہ سب ہی کو مطلوب ہیں۔ مجھ کو جو اختلاف ہے وہ طریق کار سے ہے۔ حدود شرعیہ کا قطعاً تحفظ نہیں۔ سردار اور امیر کوئی نہیں۔ اختلاف اور خلاف کی یہ حالت ہے کہ پارٹی بندیاں ہو رہی ہیں کہ علماء ایک طرف کو چلے جا رہے ہیں۔ لیڈر ایک طرف چلے جا رہے ہیں۔ عوام کی یہ حالت ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دیدیا یا کوئی عالم یا لیڈر ان کی ساتھ ہو لیا اس میں سب کمالات ہیں۔ اُسکو عرش پر پہنچا دیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی

بات کی تو تحت الثریٰ میں اُس کو جگہ ملنا مشکل۔ غرضیکہ ایک گڑبڑ ہے اور یہ طریقہ کار جو موجود ہے۔ یہ تو سراسر اسلام اور شریعت سب کے خلاف ہے۔ اس کو اسلام اور مسلمانوں سے کیا تعلق؟ مثلاً کانگریس کی شرکت جو خاص مذہبی یا سیاسی ہندوؤں کی تحریک ہے، جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تباہ برباد کرنا ہے اور مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دینا اُس کا ایک خاص فرض منصبی ہے۔ یہ سب بالشویک خیالات کے لوگ ہیں۔ بالشویک نے جیسا کچھ اسلام اور مسلمانوں کو تباہ برباد کیا، مدارس دینیہ ومساجد کو خراب کیا، وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔ تو حضرت یہ سوراج سوراج ہانکتے پھرتے ہیں، اگر خدانخواستہ اس میں کامیابی بھی ہوگئی تو ہندوستان ایک خونی مرکز بن جائے گا۔"[1]

گاندھی کی اندھی عقیدت کے نتائج

جناب ابوالکلام آزاد کی گاندھی سے اندھی عقیدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد (مسجد ناخدا) کلکتہ کے افتتاح کے لئے مسلم دنیا کی کسی شخصیت کے بجائے اُن کی نظرِ انتخاب اپنے محبوب آقا اور پیرومرشد گاندھی جی پر پڑی اور انہوں نے اُن کی درخواست پر 13 دسمبر 1920ء کو اس کا اپنے "دستِ مبارک" سے افتتاح فرمایا۔

اس مدرسہ کے نگران وہ خود تھے اور انہوں نے عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کو اس کا مہتمم اور مجلس احرار کے "شیخ الاسلام" حسین احمد دیوبندی کو صدر مدرس مقرر کیا۔ **یہ مدرسہ گاندھی کے فدائی اور شیدائی علماء پیدا کرنے کی گویا فیکٹری تھی۔** چنانچہ انہوں نے 7 مارچ 1921ء سے قبل ملیح آبادی صاحب کو حکم دیا کہ:-

> "اگر مولوی منیر الزمان کے یہاں چرخے عمدہ ہیں تو آج ہی پانچ چرخے وہاں سے منگوا لئے جائیں۔ قیمت ان کو دے دی جائیگی۔ یا یوں کہے کہ جس قدر اُن کے پاس ہو خلافت کمیٹی خریدے اور کمیٹی سے حسب ضرورت مدرسے کے لئے لے لئے جائیں۔ فضل دین سے کہہ دیجئے، امتحان کی مدت بڑھائی جاسکتی ہے۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔"

"مکاتیب آزاد" کے مرتب جناب ابوسلمان شاہجہانپوری یہ خط درج کرنے سے پہلے یہ نوٹ لکھتے ہیں:

"ترکِ موالات کے زمانہ میں انگریزی کپڑے اور ہر قسم کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ہر شخص جس کے اندر ذراسی قومی غیرت وحمیت بھی تھی، اس نے دیسی کھڈی کا کپڑا پہننا شروع کر دیا۔ گھر گھر چرخے چلائے جاتے تھے اور قومی اسکولوں میں بھی ان کا چلانا سکھایا جاتا۔ گویا کہ چرخا قومی نشان بن گیا تھا۔ مدرسہ اسلامیہ کے طلباء نے بھی چرخوں کے لئے اصرار کیا نیز درخواست کی سالانہ امتحان 15 رجب کی بجائے یکم شعبان سے لیا جائے۔"[2]

جناب آزاد نے مدرسہ کے مہتمم عبد الرزاق ملیح آبادی کو اخراجات کے بارے میں یقین دلایا کہ ہر سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں اور انجمنوں میں ایک مخصوص فنڈ ہوتا ہے جس سے جماعت اور اس کے مقاصد کی نشر واشاعت ہوتی ہے۔ اس کے لئے جماعت ایک شعبہ قائم کرتی ہے۔ اس کا اسٹاف مقرر کیا جاتا ہے اوراس پر اخراجات ہوتے ہیں.... اگر آپ کانگرس کے ان مقاصد سے متفق ہیں تو آپ کو اس کا معاوضہ قبول کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہئے۔ جس پر ملیح آبادی قائل ہو گئے۔[3]

عالمی سوشلسٹوں کے نام لینن کا پیغام

1920ء ہی وہ سال تھا جس میں آزاد صاحب آل انڈیا کانگرس کی ہائی کمان کے مطابق ایجی ٹیشن پھیلانے کے ساتھ ساتھ اپنے مدرسہ اسلامیہ کی تعمیر کر رہے تھے اور اسی سال ستمبر 1920ء میں لینن نے سوویٹ آذربائیجان کے دارالسلطنت باکو میں مشرقی ممالک کے سوشلسٹ نمائندوں کی پہلی کانفرنس کا انتظام کیا۔ کانفرنس میں ترکی، مصر اور ایران کے علاوہ ہندوستان کے مندوب بھی پورے جوش وخروش سے شامل ہوئے.... کانفرنس نے ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے سوشلسٹ رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ متحد ہو جائیں اور امپریلزم اور نو آبادیاتی نظام سے آزادی کی جدوجہد تیز کر دیں۔[4] جنوبی افریقہ میں انقلابی سوشلزم کے نامور مورخ اور عالمی شہرت کے حامل سوشلسٹ رہنما کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے روس کے انقلاب سے ردِّ انقلاب تک کی تاریخ لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ ابو فراز نے کیا ہے۔ پاکستان کے بلند پایہ دانشور جناب لال خاں صاحب اس کے اردو ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"دنیا کے 7 دوسرے ممالک کی طرح برصغیر پاک وہند پر بھی بالشوک انقلاب نے بڑے گہرے اثرات مرتب کئے۔ اقبال نے بھی مارکس کو ایک ایسا پیامبر قرار

دے دیا جس کے پاس کتاب تو تھی مگر نبوت نہیں تھی۔ اس نے "لینن خدا کے حضور میں" جیسی بڑی نظم لکھی۔

حسرت موہانی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سیکرٹری رہے۔ سوشلزم کا نظریہ بڑی تیزی سے برصغیر میں پھیلا اور اس نے یہاں کی ثقافت، شاعری اور سیاست کو بڑا متاثر کیا۔ برطانوی سامراج کے خلاف قومی آزادی کی تحریک میں اشتراکی نظریئے دیکھتے ہی دیکھتے نمودار ہوئے۔ روس میں ہونے والی تبدیلیاں کسی معجزے سے کم نہ تھیں۔ دنیا بھر کے محنت کشوں اور مظلوموں کی طرح برصغیر کے محنت کشوں کے لئے اکتوبر انقلاب صدیوں کی محکومی اور ذلت سے نجات پانے کے لئے ایک مشعل راہ تھا۔ برطانوی سامراج کے جبر کے باعث برصغیر کے بہت سے سیاسی کارکن سوویٹ یونین گئے جہاں انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ یہ ان کے لئے سوشلسٹ تعلیم حاصل کرنے کا اہم موقع تھا۔ اس سے برصغیر میں اشتراکی نظریئے کی ترویج کا عمل تیز تر ہو گیا۔ جب 1919ء میں راؤلٹ ایکٹ کے خلاف ایک عوامی بغاوت ابھری تو 20 مارچ 1920ء کے "دی ٹائمز لنڈن" نے یہ سرخی لگائی "ہندوستان میں انقلاب لانے کا بالشویک منصوبہ۔" 1920ء کی نارتھ ویسٹ ریلوے کی ہڑتال پر برطانوی پریس چلا اٹھا کہ اس ہڑتال کو یقینی طور پر بالشویک کروارہے ہیں۔ اس رجعتی تاریخ دان ایم۔ آر۔ مانی کو اپنی کتاب میں لکھنا پڑا۔ 1920ء کی دہائی کے آغاز میں ہندوستانی دانش اور جذبات کا موسم کمیونزم کے لئے نہایت ہی ساز گار تھا۔

برصغیر میں ابھرنے والی تحریک کا جو رشتہ بالشویک انقلاب سے براہ راست بنتا تھا اس کا ذکر لینن نے اپنی کئی تحریروں میں کیا تھا۔ لینن ایک جگہ لکھتا ہے مشرق کے عوام کی یہ انقلابی تحریک اسی صورت میں فعال ہو سکتی ہے اگر یہ سامراج کے خلاف ہماری بین الاقوامی جدوجہد سے براہ راست منسلک ہو جائے۔"

اس سے واضح ہے کہ لینن ہندوستان میں قومی آزادی کی تحریک کو طبقاتی جنگ کا حصہ سمجھتا تھا اور اس کو عالمی سوشلزم کی لہر میں اہم عنصر کا رتبہ دیتا تھا۔ **کیونکہ قومی آزادی کا حصول سوشلسٹ انقلاب کے بغیر ممکن نہ تھا، ہندوستان کے ابتدائی مارکس رہنما لینن کی اس پوزیشن سے اتفاق رکھتے تھے۔** 5

لینن کارل مارکس کا سچا جانشین تھا۔ اسی لئے برسر اقتدار آنے سے قبل بھی مارکس نظریہ کے

مطابق دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں سوشلسٹ انقلاب اور انٹر نیشنل سوشلزم کی بقا اور ترقی کو لازم و ملزوم سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اگست۔ اکتوبر 1916ء کے ایک آرٹیکل میں تحریر کیا۔

We shall endeavour to render these nations. more backward and oppressed than we are "disinterested cultural assistance", to borrow the happy expression of the Polish Social-Democrats. In other words, we will help them pass to the use of machinery, to the lightening of labour, to democracy, to socialism.[6]

حواشی:

[1] "الافاضات الیومیہ" حصہ اول صفحہ 89 تا 94 ناشر مکتبہ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور۔

[2] مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتب ابو سلمان شاہجہانپوری صفحہ 811 مطبوعہ باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی فروری 1968ء۔

[3] ایضاً صفحہ 150۔

[4] A Short History of The Communist Party of The Soviet Union, p.180. ناشر پراگرس پبلشرز ماسکو 1970ء (طبع اول)۔ لینن حصہ دوم صفحہ 304 دارالاشاعت ترقی ماسکو 1969ء۔

[5] دیباچہ "روس انقلاب سے ردانقلاب" صفحہ 18-19 ناشر طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز رائل پارک لکشمی چوک لاہور۔ اشاعت دسمبر 1999ء۔

[6] بحوالہ Marx Engels Lenin Novosti Press Agency Publishing House Moscow 1976 P.4۔

تیرھویں فصل

سٹالن دور حکومت اور ہندوراج کے منصوبہ کی نئی لہر

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی چشم کشا تحریر

لینن کی زندگی کے آخری سال سٹالین (1953ء-1879ء) کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا اور لینن کی وفات کے بعد ٹراٹسکی اور زنیووی اف کی شراکت میں لینن کا جانشین بنا اور اپنے دو بڑے حریفوں ٹراٹسکی اور زنیووی اف کو پارٹی سے نکال باہر کیا اور خود کمیونسٹ روس کا آمر بن گیا۔ دسمبر 1925ء میں روس کی آل یونین کمیونسٹ پارٹی آف بالشویکس کی چودھویں کانگرس کا انعقاد ہوا جس میں پارٹی لینن کے نظریاتی مقالہ کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچی کہ سوویٹ یونین کا محنت کش طبقہ کسانوں کے ساتھ مل کر اور بین الاقوامی پرولتاریہ کی اخلاقی اور سیاسی حمایت ہی سے سوشلزم کی مادی اور تکنیکی بنیاد بن سکتا ہے اور **ایک بین الاقوامی سوشلسٹ سماج تعمیر کر سکتا ہے۔**[1]

سٹالن کی وفات (1953ء) یعنی احراری مطالبہ اقلیت تک نسنی کمیونسٹ پارٹی جو 1903ء میں ایک چھوٹی سی انڈر گراؤنڈ پارٹی تھی۔ اس کے ممبروں کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی۔[2]

سٹالن کے برسراقتدار آنے کے قلیل عرصہ بعد ہندوستان میں خوفناک ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ کیونکہ آل انڈیا نیشنل کانگرس اور انتہا پسند ہندوؤں کی سوچی سمجھی سازش سے تحریک خلافت اور تحریک عدم موالات نے ایک طرف مسلمانوں کو معاشی طور پر بربادی کے کنارے تک پہنچا دیا اور دوسری طرف ہندوستان میں سوشلسٹ انقلاب کی راہ ہموار ہوگئی۔ اس لئے ہندو لیڈروں کے مسلمانان ہند کے خلاف ناپاک عزائم کھل کر سامنے آگئے۔ جن کا ایک جامع خلاصہ اُسی زمانہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے اپنی معرکہ آراء کتاب "ہندوستان کے موجودہ مسئلہ کا حل" میں شائع فرمایا تھا۔ حضور نے یہ شاہکار کتاب پہلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر رقم فرمائی تھی اور اس کا انگریزی ترجمہ لندن میں عین اس وقت پہنچا دیا گیا جبکہ کانفرنس کی کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ حضور نے تحریر فرمایا۔

"مسٹر گاندھی نے 1918ء میں ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا۔

"یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یورپین کے لئے گاؤکشی جاری رہنے کی بابت ہندو کچھ

بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے
جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول
و عرض میں ایسا نہیں ہے جو ایک دن اپنی سر زمین کو گاؤ کُشی سے آزاد کرانے کی امید
نہ رکھتا ہو۔ اور ہندو مذہب کو جیسا کہ میں جانتا ہوں، اس کی روح کے سراسر خلاف
عیسائی یا مسلمان کو بزور شمشیر بھی گاؤ کُشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے اِغماض نہ
کرے گا۔ (سٹیٹسمین کلکتہ)

مسٹر گاندھی کے اس بیان کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جذبہ تعصب صرف چند جاہل افراد میں ہے اور اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔

اس امر کے ثابت کرنے کے بعد کہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کے لئے اکثریت نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ جس کی موجودگی میں صرف ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کو حفاظت کا ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب میں یہ بتاتا ہوں کہ ہندوؤں کے آئندہ ارادے اقلیت کے متعلق کیا ہیں۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ ایک اکثریت پہلے سے ارادہ کر کے آزادی کے حصول کو اقلیت کی محبوب چیز کے قربان کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کا نقطہ نگاہ کسی قریب کے مستقبل میں بدل جائے گا۔

ہندوؤں کے مشہور قومی لیکچرار ریتہ دیو صاحب اپنے ایک لیکچر میں بیان کرتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل اگر وہ قوم پرست نہ بنیں، بڑے خطرہ
میں رہے گا۔ ہندوستان کے مسلمان اگر اپنے مذہبی.... دیوانہ پن میں ڈوبے رہے
(یعنی ہندو نہ ہو گئے) تو ان کا کام صرف بدیشی گورنمنٹ کی مدد کر کے ہندوستان
کو غلام رکھنا رہ جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی آزادی کے موقع پر ملک کے سب
لوگ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی ہستی بڑے خطرے میں پڑ جائے گی۔
مسلمانوں کی نجات کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ قوم پرستی کا ہے۔"

(اخبار وکیل امرتسر 9 دسمبر 1925ء)

اس اعلان کے لفظ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو صرف اسلام کے جُرم کی ہی سزا نہیں ملے گی بلکہ انگریزی حکومت سے تعاون کی بھی سزا ملے گی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لارڈ ارون (Lord Irwin) اور مسٹر بن (Mr.Ben) نے جو پچھلے دنوں مسلمانوں کی وفاداری

کے متواتر اعلان کئے ہیں، اس میں انہوں نے مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں کی بلکہ مذکورہ بالا اعلان کی موجودگی میں ان کے موت کے وارنٹ (Death Warrant) پر دستخط کئے ہیں۔

یہی ملکی خادم ساگر صوبہ سی۔پی میں اپنی تقریر میں یہ بھی بیان کرتا ہے۔

"ہندوؤ! سنگھٹن کرو اور مضبوط بنو۔ اس دنیا میں طاقت کی پوجا ہوتی ہے اور جب تم مضبوط بن جاؤ گے تو یہی مسلمان خود بخود تمہارے قدموں پر اپنا سر جھکا دیں گے۔ جب ہم ہندو سنگھٹن کے ذریعہ سے خاطر خواہ طور پر مضبوط ہو جائیں گے۔ تو مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط پیش کریں گے۔(۱) قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھنا چاہئے....(۲) حضرت محمد کو رسول خدا نہ کہا جائے۔(۳) عرب وغیرہ کا خیال دل سے دور کر دینا چاہئے۔ (۴) سعدی و رومی کی بجائے کبیر و تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔ (۵) اسلامی تہواروں اور تعطیلوں کی بجائے ہندو تہوار تعطیلات منائی جائیں۔(۶) مسلمانوں کو رام و کرشن وغیرہ دیوتاؤں کے تہوار منانے چاہئیں۔ (۷) انہیں اسلامی نام بھی چھوڑ دینے چاہئیں اور ان کی جگہ رام دین، کرشن خاں وغیرہ نام رکھنے چاہئیں۔(۸) عربی کی بجائے تمام عبادتیں ہندی میں کی جائیں۔"

(اخبار وکیل امرتسر 9 دسمبر 1925ء)

پھر یہی صاحب فرماتے ہیں:

"بھارت ورش کی قومی زبان ہے۔ سنسکرت۔ عربی اور فارسی کو میں بھارت ورش سے باہر کر دینا چاہتا ہوں۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ہندو سوراج میں مسلمانوں سے یہ سلوک کرنا چاہتے ہیں کہ ان سے ان کا مذہب، ان کا تمدن اور ان کی زبان اور ان کے نام تک چھڑوانا چاہتے ہیں۔

شاید کوئی کہے کہ ستیہ دیو گو کتنے ہی بڑے آدمی ہوں لیکن ہندو قوم کے چوٹی کے لیڈر نہیں اس لئے میں چند چوٹی کے لیڈروں کے حوالہ جات نقل کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مونجے جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس (Round Table Conference) کے نمائندے مقرر ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو یوں نصیحت کرتے ہیں۔

"ہندو اگر سنگھٹ ہو جائیں تو انگریزوں اور ان کے مسلمان پٹھوؤں کو کسی دوسرے کی مدد کے بغیر نیچا دکھا کر سوراج حاصل کر سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کی تجاویز

فورٹین ڈیمانڈز آف مُسلمز(Fourteen Demands Of Muslims) منتقمانہ مقابلہ کی دھمکی دے رہی ہیں جن کی ہندوؤں کو کچھ پرواہ نہیں۔ ہندوؤں کو یہ پرانا خیال دل سے نکال دینا چاہئے کہ مسلمانوں کی مدد کے بغیر سَوَراج حاصل ہونا محال ہے۔"

ڈاکٹر مونجے صاف لفظوں میں ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندو، مسلمانوں کو ان کا حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ اپنے زور سے انگریزوں اور مسلمانوں کو درست کر کے رکھ دیں گے اور مسلمانوں سے کوئی سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ جن لوگوں کا شروع میں یہ حال ہے، ان کا انجام کیا ہوگا؟

ایک اور ہندو لیڈر لالہ ہردیال ایم۔اے جن سے یورپ وامریکہ کے لوگ خوب واقف ہیں، لکھتے ہیں:-

"جب انگلستان کچھ عرصہ بعد ہوم رول (Home Rule) یعنی75 فیصدی سَوَراجیہ ہمیں پیش کرے تو وہ ہندو قومی دل کے ساتھ عہد وپیمان کرے۔"

پھر یہی صاحب لکھتے ہیں:

"ہندو سنگھٹن کا آدرش یہ ہے کہ ہندو قومی سنتھاؤں انسٹی چیوشنز (Institutions) کی بنیادوں پر ہندو قومی ریاست قائم کی جائے۔ ہندو قومی سنتھائیں یہ ہیں۔ مثلاً سنکرت بھاشا، ہندی بھاشا، ہندو قوم کا اتہاس، ہندو تہوار، ہندو مہاپرشوں کا سمرن، ہندوؤں کے دیش بھارت یا ہندوؤں کے ستھان کا پریم، ہندو قوم کے ساہتیہ کا پریم وغیرہ وغیرہ۔ پھر جو لوگ آج کل کے نیم عربی۔ نیم ایرانی مسلمانوں کو قومی تحریک میں خواہ مخواہ شامل کرنا چاہتے ہیں، وہ اس صداقت کو نہیں سمجھتے کہ ہر ایک قومی ریاست پرانی قومی سنتھاؤں پر قائم کی جاتی ہے جس سے لوگوں میں یگانگت کا بھاؤ پیدا ہوتا ہے۔"

پھر یہی صاحب لکھتے ہیں:

"جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے سوراجیہ لینے کا وقت قریب آئے گا۔ تو ہماری جو، نیتی (پالیسی) عیسائیوں اور مسلمانوں کی طرف ہوگی اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت باہمی سمجھوتا وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہندو مہاسبھا صرف اپنے فیصلہ کا اعلان کرے گی کہ نئی ہندو ریاست میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے کیا فرائض اور حقوق ہونگے اور ان کی شدھی کی کیا شرائط ہونگی۔" ("ملاپ" لاہور 25 مئی 1925ء)

اسی طرح یہ صاحب فرماتے ہیں:

”سوَراج پارٹی کا اصول ہونا چاہئے کہ ہر ہندوستانی بچہ کو قومی رتن دیئے جائیں خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی۔ اگر کوئی فرقہ ان کے لینے سے انکار کرے اور ملک میں دورنگی پھیلائے تو اس کی قانونی طور پر ممانعت کر دی جائے۔ یا اس کو عرب کے ریگستان میں کھجوریں کھانے کے لئے بھیج دیا جائے۔ ہمارے ہندوستان کے آم، کیلے اور نارنگیاں کھانے کا انہیں کوئی حق نہیں۔“ ("ملاپ" 23جون 1928ء)

یہی لالہ ہر دیال صاحب ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

”میں کہتا ہوں کہ ہندو اور ہندوستان اور پنجاب کا مستقبل ان چار آدرشوں (نصب العین) پر منحصر ہے۔ یعنی (۱) ہندو سنگھٹن (۲) ہندو راج (۳) اسلام اور عیسائیت کی شدھی (۴) افغانستان اور سرحد کی فتح اور شُدھی۔“

اگر ہندوؤں کو اپنی رکھشا کرنی منظور ہے تو خود ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے اور مہاراجہ رنجیت اور سردار ہری نلوہ کی یادگار میں افغانستان اور سرحد کو فتح کر کے تمام پہاڑی قبیلوں کی شدھی کرنی ہوگی۔ اگر ہندو اس فرض سے غافل رہیں گے تو پھر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم ہو جائے گی۔“

پھر یہی صاحب فرماتے ہیں:

”جب تک پنجاب اور ہندوستان بدیشی مذہبوں (یعنی عیسائیت اور اسلام) سے پاک نہ ہو گا تب تک ہمیں چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش (مقصد) کو نہیں مانتا وہ کپُوت ہے، بے جان ہے، مردہ دل ہے، بے سمجھ ہے، پر سچے ہندو کی یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ اپنے دیش کو اسلام اور عیسائیت سے پاک کر دے۔“

(اخبار تیج دہلی)

مہاشہ کرشن ورنیکلر پریس (Vernacular Press) کے سب سے بڑے مالکوں میں سے ہیں۔ اور آریہ پرتی مذہبی سبھا کے اہم ترین ممبروں میں سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”اب وقت دور نہیں سمجھنا چاہئے جبکہ اسلام ہمیشہ کے لئے سر زمینِ ہند سے غائب ہو جائے گا اور جو شخص خواہ وہ مہاتما گاندھی بھی کیوں نہ ہو۔ ایسے اسلام کی اشاعت یا ڈیفنس (Defence) میں بالواسطہ یا غیر واسطہ مدد دے گا وہ ملک اور

سوَراجیہ کا دشمن سمجھا جائے گا اور کوئی سچا ہندو ایسے اشخاص کے ساتھ اپنا کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔"

"سب سے پہلے آپ کا یہ فرض ہو گا کہ ایسے اسلام کو ہمیشہ کے لئے گنگا جی کے سپرد کر دو.... جب تک مسلمان تبلیغ کو ہندوستان کے اندر سے بند نہیں کریں گے، دونوں قوموں میں اتحاد نہیں ہو گا اور جو لوگ وید بھگوان اور شام کرشن کا نام مٹا کر عرب کے ریگستان کی تہذیب اور حضرت محمد کا نام سر زمین ورت میں پھیلانا چاہتے ہیں ان کے ساتھ ہندوؤں کا اتحاد کبھی نہیں ہو سکتا۔" (آریہ دیر)

پروفیسر رام دیو جو آریہ سماج کے بڑے لیڈر اور ان کے مرکزی کالج کے پرنسپل رہے ہیں اور بعد میں سیاسی کاموں میں پڑ گئے، لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔" (گورد گھنٹال اشاعت 10 جنوری 1927ء)

یہی صاحب آریہ سماج کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرما چکے ہیں:

"اسی طرح اب ایک زمانہ آنے والا ہے کہ تمام مسجدیں آریہ مندر بنائے جائیں گے اور ان میں ہون ہوا کریں گے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ جب دہلی کی جامع مسجد آجائے گی۔ ہم کیا کریں گے۔ ہم تمام ہندوستان کے آریہ نہیں بلکہ تمام دنیا کے آریہ جمع ہو کر ایک کانفرنس کیا کریں گے۔"

ڈاکٹر گوگل چند نارنگ ایم۔ ایل۔ سی لاہور ہائی کورٹ کی بار کے پریزیڈنٹ جو سائمن کمیشن کی پنجاب کمیٹی کے ممبر بھی تھے، فرماتے ہیں:

"مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی شرم نہیں آتی کہ اگر آپ کے ایک ہندو بھائی کو مسلمان بنانے میں آپ کسی کو روکتے نہیں اور وہ باز نہیں آتا تو بہتر ہے کہ آپ وہاں کٹ کر مر جائیں۔" (پرتاپ)

یہ تو انگریزی علاقہ کے لوگوں کا حال ہے۔ اب ریاستوں کا حال دیکھیں۔ سر والٹر لارنس (Sir Walter Lawrence) اپنی کتاب (India Which We Served) انڈیا جس کی ہم نے خدمت کی) میں لکھتے ہیں کہ

"لارڈ کرزن (Lord Curzon) نے میری دعوت کا انتظام کیا تھا۔ جنرل سرپر تاب سنگھ بہادر برادر مہاراجہ صاحب جودھ پور میرے بڑے دوست تھے۔ دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں کہنے لگے کہ "میرا مقصد یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو ہندوستان میں فنا کردوں۔" میں نے ان کے تعصب کی مذمت کی اور ان کے اور اپنے مسلمان دوستوں کا ذکر کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "ہاں میں بھی انہیں پسند کرتا ہوں لیکن مجھے زیادہ اچھا یہ معلوم ہوتا کہ وہ مر جائیں۔"

ان حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حصہ ہندو لیڈروں کا خواہ انگریزی علاقہ کے ہوں یا ریاستوں کے (۱) مسلمانوں سے شدید تعصب رکھتے ہیں۔(۲) وہ علے الاعلان یہ ارادہ ظاہر کر چکے ہیں کہ اگر ان کو طاقت حاصل ہوئی تو وہ مسلمانوں کو ہلاک کر دیں گے۔(۳)وہ ہندوستان میں صرف ہندوراج قائم کریں گے۔ (۴) عیسائیوں اور مسلمانوں سے وہ کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق ان کو ہندوستان میں رہنے کی اجازت دیں گے۔اور اس اجازت کے ساتھ یہ شرط ہوگی کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو ہو جائیں۔(۵)وہ مسلمانوں کی زبان کو مٹا دیں گے۔(۶) وہ اقلیتوں کے تہواروں کو قانوناً ناجائز کر دیں گے۔(۷)ان کی عبادتوں کو بدلائیں گے۔(۸) گائے کے ذبیحہ کو بزور شمشیر روک دیں گے۔ (۹) تبلیغ کو ناجائز کر دیں گے۔(۱۰) اگر کوئی ہندو اقلیت کے مذہب کو قبول کرنے لگے گا تو ہندو اس سے روکیں گے لیکن اگر وہ باز نہ آیا تو ہندو کٹ کر مر جائیں گے۔(۱۱) افغانستان اور سرحد کو فتح کر کے انہیں شدھ کر لیا جائے گا۔(۱۲)مسلمانوں کی مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔(۱۳)مسلمانوں کے اسلامی نام تک بدل دئے جائیں گے۔ (۱۴)جو لوگ ہندو زبان، ہندو مذہب اور ہندو تہذیب اور ہندو تہوار اختیار کرنے کو تیار نہ ہوں گے انہیں ہندوستان سے نکال دیا جائے گا۔(۱۵)اگر کوئی خواہ مہاتما گاندھی ہی کیوں نہ ہوں، اسلام اور مسلمانوں سے نرمی کی تعلیم دے گا تو اس کا بھی ہندو بائیکاٹ کر دیں گے۔

یہ ارادے ہیں جو سَوَراج کے قیام پر ہندو مسلمانوں کے متعلق خصوصاً اور دوسری اقلیتوں کے متعلق عموماً رکھتے ہیں۔ جو ان کا موجودہ سلوک ہے اس کا ذکر پہلے کر آیا ہوں۔ کیا ان کی موجودگی میں کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اقلیتوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے یا یہ کہ ایسا مطالبہ ڈیماکریسی (Democracy) کے حصول کے خلاف ہے۔ کیا اس قدر سخت سلوک اور اس قدر خطرناک ارادوں کی موجودگی میں دنیا کی کسی اور اقلیت نے بھی اس قدر نرم مطالبے کیے ہیں جس قدر

کہ مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوتے ہیں؟

میں اس جگہ یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ہر گز یہ نہیں سمجھتا کہ سب کے سب ہندو مذکورہ بالا خیالات میں مبتلا ہیں۔ ان میں یقیناً ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ان خیالات کو اسی طرح حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جس طرح اقلیتوں کے لوگ۔ چنانچہ بعض ہندو صاحبان نے ان خیالات کے خلاف اظہارِ نفرت کیا بھی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ طبقہ بہت تھوڑا اور دوسرے گروہ کے مقابلہ میں کم اثر رکھنے والا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا آجائے کہ ہندوؤں کے دل سے تعصّب اور کینہ نکل جائے اور وہ اپنے اس مرض سے صحت پائیں جس کی وجہ سے اپنی قوم کے سوا ہر قوم انہیں گردن زدنی نظر آتی ہے۔ لیکن جب تک وہ دن آئے اس وقت تک نہایت ضروری ہے کہ اقلیتوں کی حفاظت کا کوئی سامان ہو۔"[3]

حواشی:

[1] "سویٹ کیمونسٹ پارٹی تاریخ کے آئینہ میں" صفحہ 42-43۔ مطبع ابن حسن آفسٹ پریس کراچی۔

[2] ایضاً صفحہ 85-87۔

[3] "ہندوستان کے موجودہ مسئلہ کا حل" صفحہ 51 تا 57۔ طبع اول دسمبر 1930ء کاتب قاضی بشیر احمد بھٹی مطبع ہال بازار امرتسر باہتمام شیخ غلام یٰسین پرنٹر وانوارالعلوم جلد 11 صفحہ 294-300۔ ناشر فضل عمر فاؤنڈیشن ربوہ۔

چودھویں فصل

پنڈت نہرو کا سفر بلجیمؑ و ماسکو اور سٹالین سے ملاقات

بلجیمؑ کے شہر برسلز(Brussels) کو سوشلسٹ تاریخ میں ایک مرکزی عظمت حاصل ہے اور وہ یہ کہ مارکس پیرس سے جلاوطن ہونے کے بعد یہیں پناہ گزیں ہوا۔ یہیں اُس نے اپنے ساتھی وولف کو1847ء میں لندن کی کمیونسٹ لیگ کی پہلی کانگرس کے لئے برسلز شاخ کی طرف سے نمائندہ کے طور پر بھیجا۔ پھر برسلز میں اس کا دس روزہ اجلاس دسمبر1847ء میں ہوا جس میں مارکس نے بھی شرکت کی اور یہیں مارکس اور اینجلز نے کمیونسٹ لیگ کا دستور مرتب کیا۔ یہی وہ مشہور عالم کمیونسٹ مینی فیسٹو(Manifesto) ہے جس کے بعد اس کے بنیادی خطوط پر دنیا بھر کی سوشلسٹ اور اشتراکی پارٹیوں کے لائحہ عمل تیار کئے گئے۔ مارکس کے برسلز میں قیام کی وجہ سے کمیونسٹ لیگ کا صدر دفتر لنڈن سے برسلز میں منتقل کر دیا گیا۔

اسی دوران1863ء میں سوشلسٹوں نے لنڈن میں انٹرنیشنل تنظیم قائم کی جس کا پہلا اجلاس برسلز ہی میں ہونا قرار پایا تھا لیکن حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔ چنانچہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا اور اس کی بجائے لنڈن میں جنرل کونسل کی ایک میٹنگ ہوئی۔ انٹرنیشنل کا تیسرا اجلاس برسلز میں ستمبر1868ء کو ہوا۔ فرانس کے سوشلسٹ مزدوروں نے18مارچ1871ء کو پیرس میں کمیون نظام قائم کر دیا۔ مگر یہ نظام کُل دس ہفتہ چل سکا جسے حکومت فرانس نے اس کے چھ ہزار حامیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ختم کر دیا۔ جس کے بعد ستمبر1872ء میں مارکس کی تجویز پر انٹرنیشنل کا جنرل کونسل کا مرکزی مقام لنڈن سے نیویارک منتقل کر دیا گیا۔[1]

المختصر یہ کہ ہندو کانگرس کے سوشلسٹ لیڈر جواہر لال نہرو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ مارچ 1926ء میں یورپ کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں انہیں پتہ چلا کہ فروری1927ء میں سوشلسٹوں کی عالمی کانفرنس برسلز میں منعقد ہو رہی ہے۔ انہوں نے کانگرس کو توجہ دلائی کہ یہ ایک زرّیں موقع ہے جس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسے باضابطہ طور پر شرکت کرنا چاہیے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> "میری تجویز پسند کی گئی اور میں اس کام کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔"[2]

جناب سروی پلّی گوپال (Sarvepalli Gopal) اپنی کتاب "جواہر لعل نہرو"

(Jawahar Lal Nehru) کی پہلی جلد میں سفر یورپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"The turning-point in Jawaharlal's mental development was the invitation to help in organizing and to participate as the representative of the Indian National Congress in the International Congress against Colonial Oppression and Imperialism to be held at Brussels in February 1927. The chief organizer of the conference was Willi Muenzenberg, who really invented the fellow-traveller. The Soviet Union kept severely aloof and no one from that country attended the conference. Though as Jawaharlal realized even at the time, the objectives of the conference were wholly in accordance with Soviet foreign policy and were intended to bring together the forces of anticolonialism and organized labour as against imperialism, especially British imperialism. This did not frighten Jawaharlal and he suggested that a large delegation, including an economist and an expert on military matters, be sent from India by the Congress, but in fact he was the only delegate.

Clearly, at such a conference where the prime target was British imperialism's the official representative of the Indian Congress would be an important figure; and Jawaharlal was appointed one of the members of the Presidium. He arrived at Brussels on 6 February, took part in all the informal meetings. Presided over one of the formal sessions and played a leading role in the drafting of many of the resolutions. 'I am dead tired' he wrote from Brussels on the 16th, "after 8 or 9 days of the Congress here, I have not had a good night's sleep and hardly a decent meal since I

came here.' It was a strange medley of delegates - European Communists, trade unionists and pacifists, nationalists from Asia, Africa and Latin America, and secret service agents-with many delegates doubling the roles. However, Jawaharlal could not be influenced by some of the men and women he met here - Henri Barbusse, George Lansbury, Ellen Wilkinson, Fenner Brockway, Harry Pollitt, Reginald Bridgman, Edo Fimmen, Willi Muenzenburg, Ernst Toller, Mohammed Hatta and Roger Baldwin, apart from a large number of delegates from China, Africa, Mexico and Latin America - and his fallow mind was receptive to Marxist and radical ideas.

In his first statement to the press, Jawaharlal merely emphasized the common element in the struggles against imperialism in various parts of the world; the fabric of imperialism looked imposing and appeared to hold together, but any rent in it would automatically lead to its total destruction. Indian nationalism was based on the most intense internationalism, just as the problem of Indian freedom was a world problem; as in the past, so in the future, other countries and peoples would be vitally affected by the conditions of India. But his speech at the inaugural session of the conference was at a deeper level. Jawaharlal pointed out that India was the prime example of imperialism. She had been continuously exploited and terrorized by the British, and her workers and peasants had been systematically crushed. 'It does not require statistics, facts or figures to convince you that India in the course of the last

few generations had terribly deteriorated, and is in such a bad way that if something drastic is not done to stop this process, India may even cease to exist as a nation. ‘It was the policy of the British to create differences among Indians or 'where they already existed' to increase them, to maintain the feudal princes in power, to support the rich landowners and to promote an unholy alliance of British and Indian capitalist. 'Naturally, therefore concluded, Jawaharlal, introducing into his articulated thought a consciousness of the interlinking economics and politics, from their capitalist and imperialist point of view they wanted to do everything in their power to hold on to India'. For the first time, instead of merely condemning British imperialism, Jawaharlal had tried to understand the motives, manner and methods of its functioning. His mind had taken a big step forward.

The resolution on India, drafted by Jawaharlal, accorded the warm support of the conference to the liberation of India from foreign domination and all kinds of exploitation as an essential step in the full emancipation of the peoples of the world. The peoples and workers of other countries should fully cooperate in this task and in particular take effective steps to prevent the dispatch of foreign troops to India and the retention of an army of occupation in India. This was really meant by Jawaharlal for his audience in India, to weaken 'the extraordinary mentality which clings on to the British connection in spite of everything' and took the presence of British troops for granted. Similarly' to goad the Indian National Congress into looking beyond political

freedom, Jawaharlal, in the last paragraph of the resolution, expressed the hope of the conference that the Indian national movement would base its programme on the full emancipation of the peasants and workers of India, without which there can be no real freedom, and would cooperate with the movement for emancipation in other parts of the world."[3]

خلاصہ اس تحریر کا یہ ہے کہ۔

اس کانفرنس کے تعلق سے سوویت یونین کا رویہ بالکل بے تعلقانہ رہا اور وہاں سے کسی فرد نے اس میں شرکت نہیں کی۔ اگرچہ، جیسا کہ جواہر لعل کو اس وقت بھی یہ خیال تھا کہ کانفرنس کے مقاصد کسی صورت سوویت یونین کی خارجہ پالیسی کے مغائر نہیں تھے۔اس کا بنیادی مقصد سامراجیت بالخصوص برطانوی سامراجیت کے خلاف تمام مخالف نو آبادیاتی طاقتوں اور مزدور تنظیموں کو ایک محاذ پر لانا تھا۔ جواہر لعل جانتے تھے اور انہوں نے صلاح بھی دی تھی کہ ہندوستان سے کانگریس کا ایک بڑا ڈیلی گیشن معاشیات اور فوجی معاملات کے ماہرین کی سرکردگی میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے بھیجا جائے۔ یہ ممکن نہ ہوسکا اور ہندوستان کے واحد نمائندے جواہر لعل ہی رہے۔ لازماً ایک ایسی کانفرنس میں جس کا اصل نشانہ برطانوی سامراجیت تھی، ہندوستانی کانگریس کے سرکاری نمائندے کی بہت اہمیت تھی۔ جواہر لعل پریسیڈیم کے بھی رکن چُنے گئے۔ وہ فروری کو برسلز پہنچے۔ تمام غیر رسمی جلسوں میں شرکت کی۔ ایک رسمی جلسے کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے اور کئی قراردادوں کی تیاری میں حصہ لیا۔ جواہر لعل اس کانفرنس میں شریک بہت سے لوگوں سے ملے اور چند شخصیتوں نے (جس میں خواتین بھی تھیں) ان کو بے حد متاثر کیا، نیز مارکسٹ اور ریڈیکل خیالات نے بھی ان کی فکر و نظر کو بطور خاص کشش کیا۔

پریس کے اپنے پہلے بیان میں جواہر لعل نے سرسری طور پر دنیا کے مختلف حصوں میں مخالف سامراج جہد کے عناصر سے بحث کی تھی اور اس طرف توجہ دلائی تھی کہ جس طرح ہندوستانی قومیت کی بنیاد انتہائی شدید بین الاقوامیت پر تھی اسی طرح ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ایک عالمی مسئلہ تھا۔ یقیناً ماضی کی طرح مستقبل میں بھی دنیا کے تمام دوسرے ممالک اور عوام پر ہندوستان کے حالات کا اثر پڑے گا۔ لیکن کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں انہوں نے جو تقریر کی وہ بہت زیادہ پُر مغز اور گہری

تھی۔ جواہر لعل نے بتایا کہ ”ہندوستان سامراجی استحصال کی اوّلین مثال تھا۔ برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانیوں کے درمیان اختلافات پیدا کیے جائیں۔ جہاں پہلے سے یہ اختلافات موجود ہوں، انہیں اور ہوا دی جائے۔ رجواڑوں، نوابوں، جاگیر داروں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ دولت مند زمینداروں کی حمایت اور سرپرستی کی جائے۔ برطانیہ اور ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ناپاک گٹھ جوڑ کو ہر طرح تقویت پہنچائی جائے۔ جواہر لعل نے اقتصادیات اور سیاسیات کی باہم پیوستگی کے نئے شعور کے ساتھ تقریر اس طرح ختم کی تھی کہ ”برطانیہ اپنے سرمایہ دارانہ اور آمرانہ عزائم کی تکمیل کے لیے ہندوستان کو اپنا محکوم اور غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے ہر ممکنہ ذرائع اور طاقت کا استعمال کر رہا ہے“۔ پہلی بار برطانوی شہنشاہیت کی محض مذمت کرنے، اسے بُرا بھلا کہنے کے بجائے جواہر لعل نے اب اس کے طرز عمل اور محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ ان کی یہ فکر اگلی سمت میں ایک بڑی جَسُت تھی۔

ہندوستان کے تعلق سے قرارداد کا مسودہ جواہر لعل نے تیار کیا تھا جس کی کانفرنس نے پُرزور تائید کی۔ اس قرارداد میں ہندوستان کو بیرونی اقتدار سے آزاد کرانے اور ہر قسم کے جبر واستحصال سے نجات کو پوری دنیا کے عوام کے لیے ضروری اقدام قرار دیا گیا تھا۔ تمام دوسرے ملکوں کے عوام اور مزدوروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اس کام میں بھرپور حصہ لیں اور خاص طور سے ہندوستان میں بیرونی فوجی دستوں کے بھیجے جانے اور ہندوستان میں ”قابض فوج“ کی موجودگی کے خلاف پُرزور احتجاج کریں۔ یہ بات جواہر لعل نے بطور خاص اپنے ہندوستانی بھائیوں کے لیے کہی تھی۔

مصنف گوپال کانگریس کے کوائف پر روشنی ڈالنے کے بعد رقمطراز ہیں:

“However, it was the Soviet Union that now dominated Jawaharlal's mind, just as it had an unseen presence, dominated the Brussels conference. He read all that he could lay hands on, books both by partisans and by critics, about developments and conditions in that country, and found much to admire. He believed that whatever the tradition of hostility between Britain and Russia, to a free India she would be no threat: and even if India were wholly opposed to communism she could have friendly relations with Russia. Jawaharlal 'far-seeing as ever' recognized that

as she grew in power Soviet Russia might develop a new type of imperialism; but he thought there was little chance of this for a long time to come, and for the moment, for reasons of self-interest, Russia was befriending all oppressed nationalities. It seemed logical; therefore, that he should visit the Soviet Union before returning to India; and the opportunity came, after Motilal's arrival in Europe in the autumn, when father and son were invited to the decennial celebrations of the 1917 revolution. When they were at Berlin, the Soviet ambassador conveyed the invitation to them, and though this was short notice they decided 'after some hesitation' to accept it.

The invitation came in the last phase of the Soviet policy of support for national liberation movements in Asia, regardless of their ideology. This was a heritage from Lenin, who had believed that colonial countries like India should have their bourgeois 'democratic revolution before they could think of proletarian rule' and that therefore it was the duty of Communists to work at this stage in cooperation with the leadership of the bourgeoisie. So to Lenin, Gandhi was a 'revolutionary' and he rejected the argument of M.N.Roy that the Indian bourgeoisie was no different from the traditional feudal classes. The thesis of Lenin became the official policy of the Soviet Union and the Comintern, and although by the end of 1922 there were the beginnings of Communist party organization in India, the general plan was for the Communists to infiltrate the Congress rather than

promote a revolutionary mass party of their own. It was true that in May 1925 Stalin had accepted the position of Roy and advocated the formation of a revolutionary bloc in India led by the proletariat in general and the Communists in particular, and including the revolutionary section of the bourgeoisie. But the other line of working with bourgeoisie leadership still held the field till the end of 1927. The Brussels Congress testified to the importance the Soviet Union still attached to bourgeoisie nationalist movements; and the severance of diplomatic relations by Britain in 1927 followed by strong rumours of British preparations for military invasion' with Peshawar as a base' led to a war scare in the Soviet Union. Now more than ever it seemed invaluable to have the sympathy' if not the active support of the Congress Party.

A change in Soviet attitude came towards the end of 1927. The setbacks in China and the failure of the efforts to reach a approachment with the Western Powers unnerved the makers of Soviet and Comintern policy; and Stalin, who was now finally emerging as the victor in his rivalry with Trotsky' viewed the colonial question only against the background of European events and had a more limited idea of the Security of the Soviet Union. At the Fifteenth Party Congress, Bukharin made it clear that the bourgeoisie in India could no longer be supported. The Sixth Congress of the Third International formally abandoned in 1928 the policy of a united front against imperialism and directed the Indian Communist Party to act in isolation and work for an

armed insurrection for the bourgeoisie nationalist parties had become supporters of imperialism and 'having assumed a reformist and class-collaborationist character' could not be expected to lead the revolution.

So November 1927 was the last occasion, for many years at any rate, when the Nehrus could expect an official invitation to Moscow. They were in Russia for only a few day, but the articles Jawaharlal wrote for The Hindu covering this visit and which were later published as a book, show the deep impression made on him by this strange Eurasian country of the hammer and sickle' where workers and peasants sit on the thrones of the mighty and upset the best-laid schemes of mice and men. They were, he wrote to his sister from Moscow, in topsy-turvy land. All one's old values get upset and life wears a strange aspect here'. He knew that they were on a conducted tour, seeing only what they were allowed to see; he knew too that conditions in the sprawling provinces hardly up to what was to be found in Moscow and its environs. Yet he was convinced that the Soviet Union had made rapid progress in agriculture, prison reform, the eradication of illiteracy, the treatment of women, the handling of the problem of minorities and the removal of the sharp contrasts between luxury and poverty and of the hierarchy of class. He was sure too that the Soviet Union had much to teach India, which also was a large agricultural country with a poor and illiterate population. His mood was defined by the lines which he put on the title page of his book:

'Bliss was it in that dawn to be alive,

But to be young was very heaven'.

Starry-eyed Perhaps; but it is well to remember that the Russia which Jawahar Lal visited was still very much the Russia of Lenin, even though Lenin had been dead for over three years. Stalin had not yet become the undisputed dictator, and there was a considerable amount of mass support for the Soviet regime. The New Economic Policy was still in effect. 'Get rich', Bukharin had advised the peasants in 1925; and the peasants still dominated the countryside and brought about a strong recovery in food production. This was to then the 'golden era of Soviet rule'. The number of family holdings rose to 25 millions in 1927, and comprised 98.3 percent of the sown area. Stalin, like Lenin, was still speaking in terms of voluntary collectivization of agriculture. It was only after 1927 that it was felt that 'Bolshevism in alliance with the peasants', apart from being ideologically untenable, was also impracticable. The food shortages in large cities in the summer of 1927, despite a good harvest, showed that 'without mass production of consumer goods' the peasants could not be induced to sell their grain. The percentage of the crops being sent to the urban markets was even less than that in the year before the war. On the other hand, industrial production, which till 1927 had shown a rapid rise because of the reactivation of productive capacity of the years before 1917, now began to slacken. If industrialization – and specially heavy industrialization, thought to so necessary with the

imminent prospect of war – were to be maintained, it was necessary to insist on the peasants disgorging their supplies; and this meant rapid and enforced collectivization. In December 1927, therefore – a month after the visits of the Nehru's – the Party congress decided on an offensive against the ruler, opening a new chapter in Soviet history.

So Jawaharlal saw the Soviet Union in the last days of its first, falcyon period. If his reaction was idealistic, it was partly because there was still some idealism in the air. The grounding in Marxism, which he had received at the Brussels conference and after, was followed by a near-conversion to communism by practical testimony. Jawaharlal had been particularly impressed by Lenin's leadership, by his realism and resilience, and above all by his insistence on professional, full-time revolutionaries. The need for such workers in India was obviously even greater, and it was as one such that Jawaharlal now doubtless saw himself. He who had sailed from India as a dedicated disciple of Gandhi returned a self-conscious revolutionary radical. Although always to be deeply influenced by Gandhi, he was never again to be wholly a prisoner in the Gandhian mould. But it is significant that the change was wrought not be the revolutionary situation in India but by what he was and heard and read in Europe. Jawaharlal was always a radical in the European tradition, seeking to apply and adapt its doctrine to his own country. This could be both a strength and a weakness."[4]

ترجمہ: بہر حال جواہر لعل کے ذہن پر اب سوویت یونین کا غلبہ تھا۔ سوویت روس کے حالات اور ترقیوں کے بارے میں حامیوں اور نقادوں کی جو بھی کتابیں انہیں ہاتھ لگیں، سب پڑھ ڈالیں اور وہاں انہیں بہت کچھ قابل تعریف نظر آیا۔ ان کا یہ ایقان تھا کہ برطانیہ اور روس کے درمیان دشمنی کی جو بھی روایت رہی ہو، ایک آزاد ہندوستان کو سوویت روس سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا اور اگر ہندوستان کمیونزم کا بالکلیہ مخالف ہو، تب بھی وہ روس سے دوستانہ تعلقات رکھ سکتا تھا اور ہمیشہ کی طرح جواہر لعل کی دوربین نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ جیسے جیسے اس کی طاقت بڑھے گی، سوویت روس میں ایک نئے طرز کی سامراجیت پروان چڑھ سکتی تھی۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ ابھی بہت دور کی بات تھی۔ مستقبل قریب میں ایسا کوئی امکان نہیں تھا اور فی الحال وہ اپنے مفاد کے پیش نظر تمام مظلوم قومیتوں کی حمایت کر رہا تھا۔

ہندوستان واپس ہونے سے پہلے جواہر لعل سوویت یونین جانا ضروری سمجھ رہے تھے۔ موسم گرما میں جب ان کے والد موتی لعل یورپ آئے تو ان کو اسکا موقع مل گیا۔ باپ بیٹے دونوں کو 1917ء کے بالشویکی انقلاب کے دہ سالہ جشن سالگرہ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ روس میں اگرچہ وہ صرف چند دن رہے لیکن جواہر لعل نے اپنے اس سفر کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر اس کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ ایک انفرادی سیاحت پر تھے، انہوں نے صرف انہی چیزوں کو دیکھا جو انھیں دکھائی گئیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بے ترتیب وسیع صوبوں میں حالات ویسے نہیں تھے جیسے ماسکو اور اس کے مضافات میں تھے۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ سوویت یونین نے زراعت میں، ناخواندگی ختم کرنے میں، جیلوں کی اصلاح میں، عورتوں کے ساتھ سلوک میں، اقلیتوں کے مسائل سے نمٹنے میں، امیری اور غریبی کے فرق کو مٹانے اور طبقاتی "کلیسائیت" کو ختم کرنے میں بہت تیز رفتا ترقی کی تھی۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ سوویت روس سے ہندوستان بہت کچھ سیکھ سکتا تھا کہ وہ بھی ایک زرعی ملک تھا۔ جس کی کثیر آبادی نادار اور ناخواندہ تھی۔ جواہر لعل نے کہنا چاہیے، سوویت یونین کو اپنے ایک "زمانہ عافیت Falcyon days" کے آخری دنوں میں دیکھا تھا۔ اگر ان کا ردعمل عینیت پسندانہ ہوا تو اس لیے کہ ابھی فضا میں کچھ عینیت باقی تھی۔ مارکسزم کی بنیادی تعلیم انہوں نے برسلز کانفرنس میں اور اس کے بعد حاصل کی۔ عملی شہادتوں نے اسے تقریباً کمیونزم میں بدل دیا تھا۔

جواہر لعل بطور خاص لینن کی رہ نمائی، ان کی حقیقت پسندی، لچک اور جھند گی سے بے حد متاثر

تھے اور سب سے زیادہ اُن کے اس خیال سے کہ پارٹی کا کام پیشہ وارانہ ہمہ وقتی انقلابیوں کے سپرد ہونا چاہیے۔ ایسے کارکنوں کی یقیناً ہندوستان میں اور زیادہ ضرورت تھی اور اب جواہر لعل بجا طور پر خود کو ایسا ہی کارکن سمجھ رہے تھے۔ وہ جواہر لعل جو ہندوستان سے یورپ جاتے وقت گاندھی جی کے بے چون وچرا مقلّد اور پیرو تھے، اب ایک خود شناس، انتہا پسند انقلابی بن کر ہندوستان لوٹے۔ گاندھی جی کا اثر یوں تو ان پر زندگی بھر رہا مگر اب وہ پھر بھی کبھی کبھی خود کو "گاندھین سانچے" میں محصور نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن معنی خیز امر یہ ہے کہ ان میں یہ تبدیلی ہندوستان کی انقلابی صورت حال نے پیدا نہیں کی بلکہ یورپ میں انہوں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا، یہ اس کا نتیجہ تھی۔ یورپین نظریات اور عقائد کو خود اپنے ملک پر لاگو کرنے اور اپنانے کی کوشش میں جواہر لعل ہمیشہ ایک انتہا پسند رہے۔ یہ ان کی طاقت بھی تھی اور کمزوری بھی۔[5]

مسٹر گوپال نے اپنے بیان میں پنڈت نہرو اور ان کے والد کے ماسکو جانے اور بالشویکی انقلاب کے دس سالہ جشن انقلاب میں شرکت کا ذکر کیا ہے۔[6] مگر دنیا بھر کے سینکڑوں نمائندوں سمیت سٹالین کے "دربار عام" میں حاضری کا انقلاب آفریں واقعہ سیاسی مصلحتوں کی نذر کر دیا ہے۔ حالانکہ دو سال بعد دسمبر 1929ء میں کانگرس کی طرف سے ملکی آزادی کی قراداد براہ راست اس کا رد عمل تھا۔ جیسا کہ وہ اگلے باب میں ہی اعتراف کرتے ہیں کہ

"جواہر لعل اب ہندوستان لوٹے تو پہلے کی طرح افسانوی رومانیت کے موڈ میں نہیں تھے بلکہ انقلابی تبدیلی کے لئے ایک فکری انہماک اور سپردگی کا جذبہ لے کر لوٹے۔ وہ عمل کے لئے بے چین تھے اور اب ان کے سامنے جو مقصود تھا، وہ کامل آزادی تھا۔ جواہر لعل اس بارے میں عرصے سے سوچ رہے تھے اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ کانگرس کو اپنی تمام تر کوششیں کامل آزادی کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے جیسا کہ اکثر اعتدال پسند کانگریسیوں کا خیال تھا کہ درجہ نو آبادیات اور کامل آزادی میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، جواہر لعل کی نظر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مطلب یہ تھا کہ موجودہ نظام بدستور باقی رہے۔ حکومت بظاہر ہندوستانیوں کی ہو لیکن ہر معاملے میں عمل دخل برطانیہ کا رہے اور کامل آزادی کے معنی تھے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور اپنی آزاد حکومت بنائی جائے.... اس ایقان کو لے کر جواہر لعل نئے جوش اور جذبے کے ساتھ کسی لگی لپٹی کے بغیر کامل آزادی کی جدوجہد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے"۔[7]

اب روس کی مستند تاریخ سے پنڈت نہرو اور ان کے والد کے علاوہ دنیا بھر کے سینکڑوں

سوشلسٹ نمائندوں سے سٹالن کے خطاب کا احوال سنئے:

نامور روسی مولّف جی ایف الیگزنڈروف (G.F. Alexundrov) لکھتا ہے۔

"The U.S.S.R. became a veritable Mecca to which scores and hundreds of workers, delegations flocked from all parts of the world. And it was with keen interest and profound emotion that they saw how the workers, having ousted their exploiters, were building a new Socialist society. They were interested in everything and wanted to know everything. On November 5, 1927, Stalin gave a long interview to workers' delegations from Germany, France, Austria, Czechoslovakia, China, Belgium and other countries."[8]

ترجمہ: سوویت یونین دنیا بھر سے آنے والے ہزار ہا مزدوروں کے لئے (مکہ کی طرح) ایک غیر متنازعہ مرکزی مقام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مزدوروں کے وفود جو گروہ در گروہ وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے نہایت درجہ دلچسپی اور جذباتی وابستگی کے ساتھ محنت کش طبقے کے مقابلہ میں استحصالی طبقے کی پسپائی کو دیکھا اور مزدور طبقے کو ایک نئے سوشلسٹ نظام کی بنیاد رکھتے ہوئے ملاحظہ کیا۔

محنت کش طبقہ پورے انہماک کے ساتھ دلچسپی لیتے ہوئے ہر بات سے باخبر رہنا چاہتا تھا۔ 5نومبر 1927ء کو سٹالن نے جرمنی، فرانس، آسٹریا، چیکوسلواکیہ، چین، بیلجئیم اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے مزدوروں کے وفود کو ایک طویل انٹرویو دیا۔

ماسکو میں انقلاب روس کی دسویں سالگرہ اور نہرو

سفر یورپ کی ارتقائی اور آخری منزل ماسکو تھا جہاں مسٹر نہرو کو نہ صرف پہلی سوویٹ حکومت کا قریبی مشاہدہ کرنے کا سنہری موقع ملا بلکہ لینن کے جانشین اور مرد آہن سٹالن سے بھی "شرف باریابی" نصیب ہوا۔

اخبار "الفضل" قادیان 15نومبر 1927ء کے صفحہ 12 پر عالمی پریس کے حوالہ سے اس سالگرہ کی خبر بایں الفاظ شائع ہوئی۔

"ماسکو۔7دسمبر1927ء۔انقلاب روس کی دسویں سالگرہ بڑے تزک واحتشام سے منائی گئی.... اس سالگرہ پر دس لاکھ آدمی جمع تھے۔ جلوس نکالا۔ دیواروں پر سرخ کپڑے لٹک رہے تھے جن پر گزشتہ دس سال کے اہم واقعات لکھے ہوئے تھے۔ بالشویک حکام لینن کے عجائب گھر میں جمع ہوئے جس کی ایک جانب سیاسی جماعت اور کئی سو غیر ملکی مندوب کھڑے تھے۔"

حواشی:

1 "کارل مارکس" صفحہ20تا32از جناب ڈاکٹر احمد حسین کمال ناشر ادارہ "ندائے انقلاب" 5 بیگم روڈ لاہور بار اول یکم مئی1976ء۔

2 میری کہانی حصہ اول صفحہ272ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔

3 Jawahar Lal Nehru A Biography Vol. One (1889-1947) P.100-102. Oxford University Press Delhi.

4 Jawahar Lal Nehru A Biography Vol. One (1889-1947) P.107-106. Oxford University Press Delhi.

5 "جواہر لال نہرو" صفحہ175-177مترجم جناب اختر حسن ناشر نگارشات میاں چیمبرز3ٹیمپل روڈ لاہور اشاعت1994ء۔

6 یہاں اس افسوناک مغالطہ انگیزی کا ذکر ضروری ہے کہ جناب ابوالکلام آزاد نے الہلال6ستمبر1927ء میں "روسی انقلاب کی جوبلی" پر نوٹ لکھتے ہوئے یہ خلاف واقعہ بات لکھ دی ہے کہ تقریب میں کوئی ہندوستانی رہنما شامل نہیں ہوا جو کانگرس اور روس کے دیرینہ گہرے روابط پر پردہ ڈالنے کی افسوناک مگر ناکام کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

7 ترجمہ "جواہر لال نہرو" صفحہ78-79۔

8 "Joseph Stalin" p.94. Foreign Languages Publishing House Moscow 1949.

پندرھویں فصل

پنڈت نہرو کا بمبئی میں جماعت احمدیہ کے خلاف بیان

سٹالن نے 5 نومبر 1927ء کے طویل انٹرویو کے دوران پنڈت جواہر لعل نہرو (نمائندہ کانگرس) کو براہ راست ہندوستانی پالیٹکس کے متعلق اور کیا ہدایات دیں اور انگریزوں کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا کو سوشلسٹ انقلاب سے پُر کرنے کے معاملہ میں کن خطوط پر راہنمائی کی، اس بارے میں تو مستقبل کا مورّخ ہی بتا سکے گا بشرطیکہ اسے ماسکو اور دہلی سے 1927ء کے کانگرس روس پیکٹ کا سراغ مل سکا۔

مگر یہ ایک یقینی اور قطعی بات ہے کہ پنڈت جی نے سفر یورپ سے واپسی پر ہندوستان میں قدم رکھتے ہی بیان دیا کہ کانگرس کے سوراج کی کامیابی کے لئے جماعت احمدیہ کو تباہ وبرباد کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے قادیان میں احراریوں کی کانفرنس 1934ء کے معاً بعد مسجد اقصیٰ کے منبر پر خطبہ کے دوران یہ چونکا دینے والا انکشاف فرمایا:

> ”ہماری جماعت کی مخالفت نہایت وسیع پیمانہ پر ہے اور سیاستدان یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک احمدیوں کو کمزور نہ کر دیا جائے یا احمدیوں اور حکومت میں لڑائی نہ کرادی جائے اسوقت تک ان کا قدم مضبوطی سے جم نہیں سکتا۔ یہ صرف خیالی بات نہیں بلکہ خود مجھ سے آل انڈیا کانگرس کے ایک ذمہ دار آدمی نے کہا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو جب یورپ کی سیاحت سے واپس تشریف لائے تو اسٹیشن پر ہی دوران گفتگو میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے دوران سیاحت میں محسوس کرایا گیا ہے کہ اگر ہندوستان میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے پہلے احمدیہ جماعت کو کچل دینا چاہئے۔“[1]

یہ ذمہ دار شخصیت جیسا کہ خود حضرت مصلح موعود نے چند ماہ بعد خطبہ جمعہ میں ہی انکشاف فرمایا، سید محمود صاحب سیکرٹری آل انڈیا نیشنل کانگرس تھے اور یہ بات انہوں نے خود حضور کو قادیان میں ایک ملاقات کے دوران بتائی تھی۔[2]

حواشی:

[1] الفضل مورخہ 22 نومبر 1934ء صفحہ 10، کالم 1۔

[2] الفضل مورخہ 6 اگست 1935ء صفحہ 8۔

سولھویں فصل

جماعت احمدیہ کی تباہی کا منصوبہ

پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کے والد موتی لعل نہرو نے یورپ سے واپسی کے معاً بعد سٹالین کے ایجنڈا پر عمل پیرا ہوتے ہوئے برٹش حکمرانوں سے مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا اور ساتھ ہی جماعت احمدیہ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے ملک گیر اور خفیہ منصوبہ کی زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ اور اس کا آغاز لدھیانہ شہر سے کیا کیونکہ یہ شہر 1888ء سے کانگرسی مولویوں کا مضبوط گڑھ تھا اور یہیں سے سرسید تحریک کے خلاف اور کانگرس کے حق میں "نصرۃ الابرار" کے نام سے فتاوٰی شائع ہوئے۔ اور 22 دسمبر 1888ء کے اجلاس کانگرس الٰہ آباد میں تقسیم ہوئے۔ "نصرۃ الابرار" کے مرتب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے دادا مولوی محمد صاحب اور مولوی عبد العزیز تھے۔[1] یہی لدھیانوی علماء تھے جنہوں نے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ پر "براہین احمدیہ" کی پہلی چار جلدوں کی اشاعت پر سب سے پہلا فتوٰی کفر دیا تھا۔[2]

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کے اپنے ایک اقراری بیان کے مطابق وہ 1905ء میں کانگرس کے پُر جوش ممبر بنے اور ٹھیک یہی وہ سال ہے جبکہ ابوالکلام آزاد صاحب بھی کانگرس میں شامل ہوئے۔ اس طرح دونوں "ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست بن گئے"۔

ایک بار مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو اپنے ہاں دعوت چائے پر مدعو کیا اور نہایت ادب سے ان کی خدمت میں "نصرت الابرار" کا نسخہ پیش کیا تو انہوں نے مولوی صاحب کو مبارک باد دی۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے عرض کیا "ہندوستان میں ہزاروں لیڈروں کو کانگرس تحریک نے جنم دیا لیکن میرے آباء واجداد خود کانگرس کے فونڈر (Founder) تھے۔"[3] مولوی صاحب کے بیٹے عزیز الرحمٰن جامعی یہ واقعہ سپرد قرطاس کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

> "علماء لدھیانہ نے کانگریس کو مقبول بنانے میں جو رہنمائی کی تھی، وہ آج مسلمانانِ ہند کا ایک تاریخی سرمایہ ہے جس پر ہندوستانی مسلمان جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ علماء لدھیانہ کے فکر و عمل کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اب اور کیا ہو گا کہ آج علی گڑھ یونیورسٹی میں سرسید کی سیاست کا جنازہ نکل چکا ہے۔"[4]

مولوی حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا بیان ہے کہ جب انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں

داخلہ لیا تو" مدرسہ میں اندرونی طور پر نہایت گہری سیاسی تنظیم اور تحریک چل رہی تھی جو میرے جذبات کے عین مطابق تھی۔"[5]

المختصر لدھیانہ کے کانگرسی ملّاؤں کی چالیس سالہ روایات کا تقاضا تھا کہ لدھیانہ ہی سے مکمل آزادی کے لیے پورے ملک میں راہ ہموار کی جائے چنانچہ ایسا ہی عمل میں آیا۔

پنڈت نہرو کی مخالف احمدیت سکیم کو بروئے کار لانے کے لئے ملک بھر کے کانگرسی ہندوؤں نے 1928ء میں ہی انڈر گراونڈ یہ خوفناک منصوبہ تیار کر لیا کہ جماعت احمدیہ کو تباہ و برباد کر کے صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ چنانچہ ایک مخلص احمدی وکیل میاں فضل کریم صاحب بی اے (علیگ) ایل ایل بی نے 7 نومبر 1928ء کو حضرت مصلح موعود کی خدمت میں حسب ذیل مکتوب لکھا کہ

"حضور کو قبل اس کے ہندوؤں کی مخالفت اور بغض کے متعلق کافی علم ہے مگر کل ہی مجھے ایک مسلمان وکیل دوست سے ایک ایسے امر کے متعلق علم ہوا کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ہندوؤں نے Organized ہمارا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور اس کی طرف اپنے عوام کو بھی توجہ دلا دلا کر تیار کر رہے ہیں۔ خصوصیت سے گذشتہ ایک دو سال بعد موجودہ نہرو رپورٹ کی ہماری طرف سے مخالفت نے انہیں آگ لگا دی ہے۔ اس دوست نے مجھے بتلایا کہ ایک ہندو نے مجھے بتلایا ہے کہ احمدی ملکی ترقی میں ایک زبردست روک ہیں۔ اب ہم ان کو Crush کر کے چھوڑیں گے اور سارے ملک کے ہندوؤں نے یہ ٹھان لیا ہے اور اس کے لئے روپیہ کا بھی انتظام کیا جائے گا۔

میں نے دوست سے دریافت کیا کہ وہ کس حیثیت کا انسان ہے تو انہوں نے بتلایا معمولی سا آدمی ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ عوام میں بھی ہماری مخالفت اور مقابلہ کی روح پھونکی جارہی ہے۔ میں انشاء اللہ العزیز مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تو یہ سن کر ایک پہلو سے خوشی ہوئی اور ایک پہلو سے فکر پیدا ہوئی۔ خوشی تو اس لئے کہ ملک کی ایک زبردست قوم بھی سلسلہ کی طاقت کو مان گئی ہے اور روز افزوں ترقی سے گھبرا رہی ہے۔ فکر اپنی کمزوریوں کا ہے کہ مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی قوت عطا کرے گا۔ خادم کو دعاؤں میں یاد فرمائیں۔ خاکسار فضل کریم۔"

مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بیٹے عزیز الرحمٰن لدھیانوی مصنف ”رئیس الاحرار“ کا بیان ہے۔

”1928ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس لدھیانہ میں ہوئی۔ اس کی صدارت کے لئے خواجہ محمد یوسف کے ذریعہ پنڈت موتی لعل نہرو کو کشمیر کانفرنس کا صدر بنایا۔ کانفرنس میں بڑے بڑے مسلمان کشمیری تاجروں نے پنڈت موتی لعل کی گاڑی اپنے ہاتھ سے کھینچی۔ ایک لاکھ ہندو اور مسلمان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ نہرو رپورٹ کی وجہ سے پنجاب میں پنڈت موتی لعل نہرو کی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں سخت مخالفت ہو رہی تھی لیکن رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی اس تدبیر سیاست نے ہوا کا رخ پلٹ دیا۔... پنڈت موتی لعل مولانا کی اس تدبیر سیاست سے بہت خوش ہوئے اور جب تک زندہ رہے، برابر پنڈت جی نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو اپنے دوستوں اور خاص مشیروں کی فہرست میں رکھا۔“[6]

حواشی:

[1] کتاب رئیس الاحرار صفحہ 36 (سوانح مولوی حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر مجلس احرار) تالیف عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی اشاعت 1961ء۔

[2] مکتوبات احمدیہ جلد اول صفحہ 74 مرتب حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی صاحب۔ انوار احمدیہ مشین پریس قادیان 29 دسمبر 1908ء۔

[3] ”رئیس الاحرار“ صفحہ 75۔

[4] ”رئیس الاحرار“ صفحہ 52۔

[5] ”رئیس الاحرار“ صفحہ 99۔

[6] ”رئیس الاحرار“ صفحہ 74-75۔

سترھویں فصل

کانگرس کے پلیٹ فارم پر مجلس احرار کا قیام

جب مکمل آزادی کے نعرہ کی پذیرائی کے لیے ماحول تیار ہو چکا تو دسمبر 1929ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو ہی کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل کانگرس کا اجلاس لاہور منعقد ہوا جس میں کانگرس نے مکمل آزادی کی قرارداد منظور کی اور ساتھ ہی مسلمانوں میں نہرو کے سوشلسٹ خیالات کے پھیلانے، کانگرسی پروگرام کو کامیاب بنانے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جماعت احمدیہ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کانگرس ہی کے پلیٹ فارم پر ڈرامائی انداز میں ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کا نام ابوالکلام آزاد صاحب کی تجویز پر "احراراسلام" رکھا گیا چنانچہ "رئیس الاحرار" مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کی سوانح میں صاف لکھا ہے۔

"1929ء کے کانگرس کے اجلاس میں 29 دسمبر 1929ء کو مولانا آزاد کے مشورہ پر آل انڈیا کانگرس کے اسٹیج پر چودھری فضل حق کی صدارت میں مجلس احرار کا پہلا جلسہ ہوا۔ مجلس مشاورت میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا سید داؤد غزنوی اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی صاحب اظہر، خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے مشورہ کر کے مولانا آزاد کے تجویز کردہ نام کے مطابق 'مجلس احرار اسلام ہند' قائم کی اور مولانا سید عطاء اللہ بخاری مجلس احرار کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ کانگرس کی طرف سے عام سول نافرمانی کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس لئے سب احرار تنظیم کو چھوڑ کر کانگرسی تحریک میں شامل ہو گئے۔"[1]

مفکر احرار چوہدری افضل حق صاحب کا بیان ہے:

"مجلس احرار کا سب سے پہلا جلسہ 29 دسمبر 1929ء کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہوا جس میں سید عطاء اللہ شاہ نے میری صدارت میں تقریر کی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان نوجوان ہندوستان کی آزادی کا ہراول ثابت ہوں۔ آزادی کے حصول کا فخر ہمارے حصے میں آئے۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد سول نافرمانی کا آغاز ہوا اور کانگرس کے جھنڈے تلے سب نے مل کر قربانیاں پیش کیں.... کانگرس کی اس سول نافرمانی میں احرار کے موجودہ کارکن روح رواں تھے۔"[2]

اس کی تفصیل مصنف "رئیس الاحرار" نے اپنی کتاب کے صفحہ 136-137 پر دی ہے اور لکھا ہے۔

2 مئی 1930ء کو امروہہ میں مولوی حسین احمد صاحب کی تائید سے جمعیۃ علماء ہند نے کانگرس کی تحریک سول نافرمانی میں شمولیت کی تجویز پاس ہوئی جس کے بعد بخاری صاحب یوپی بہار کا دورہ کر کے بنگال جا پہنچے اور دیناج پور میں گرفتار ہوگئے۔ اس دورے میں ایک لاکھ آدمی شاہ صاحب کی تقریروں سے گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں تیس ہزار مسلمان تھے۔ اس روداد کے بعد لکھا ہے۔

"پنڈت موتی لعل نہرو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر بیانی کے عاشق تھے۔ انہی کے پروگرام کے مطابق شاہ صاحب کام کر رہے تھے۔ الٰہ آباد میں جب شاہ صاحب پنڈت موتی لعل جی کے یہاں پہنچے تو پنڈت موتی لعل جی نے خود شاہ صاحب کے کھانے کا بندوبست کیا اور اپنے ہاتھ سے دونوں وقت چائے بنا کر پلائی۔ پنڈت موتی لعل بار بار شاہ صاحب سے کہتے کہ شاہ صاحب کانگرس سیتہ گرہ کی کامیابی صرف آپ ہی سے وابستہ ہے۔ کانگریسی تحریک میں پنجاب کے احراری رہنماؤں کی شرکت اور شاہ صاحب کے دورہ کا یہ اثر ہوا کہ گاندھی ارون پیکٹ کے بعد جب بھی احرار رہنما گاندھی جی سے ملنے گئے تو گاندھی جی اٹھ کر دروازے تک خود احرار رہنماؤں کو لینے آتے اور چلتے وقت خود ان رہنماؤں کو دروازے تک چھوڑنے آتے۔ یہ امتیازی بات تھی جو زندگی میں گاندھی جی نے صرف احراری رہنماؤں کی عزت و تکریم میں کی۔"[3]

حواشی:

1 "رئیس الاحرار" صفحہ 144 مولف عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی اشاعت 1961ء۔

2 تاریخ احرار طبع اول صفحہ 8 ناشر زمزم بک ایجنسی بیرون موری دوازہ لاہور۔

3 "رئیس الاحرار" صفحہ 136-137۔

اٹھارھویں فصل

احرار کا سوشلزم کے حق میں اور احمدیوں کے خلاف پراپیگنڈے کا آغاز

بہر کیف احرار کے انقلابی رہنما سول نافرمانی میں اپنے سیاسی جوہر کا سکہ جمانے کے بعد مسلمانوں میں سوشلزم کے پراپیگنڈہ اور سوشلزم ہی کے حوالہ سے جماعت احمدیہ کی مخالفت کے لئے وقف ہوگئے اور اس بناء پر انہوں نے تحریک پاکستان کو ملیامیٹ کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگادی۔ یہ کوئی خیالی یا قیاسی بات نہیں بلکہ ایک ایسی ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے جس کے لفظ لفظ پر مجلس احرار کا مستند لٹریچر شاہد ناطق ہے چنانچہ مفکر احرار چوہدری افضل حق صاحب بانی رکن "مجلس احرار اسلام" نے "تاریخ احرار" کے باب چہارم صفحہ 138 پر فتنہ ء قادیان کے عنوان سے لکھا۔

"باب چہارم

فتنہ قادیان

لوگ بجا طور پر پوچھتے ہیں کہ احرار کو کیا ہوگیا کہ مذہب کی دلدل میں پھنس گئے۔ یہاں پھنس کر کون نکلا ہے جو یہ نکلیں گے؟ مگر یہ کون لوگ ہیں؟ وہی جن کا دل غریبوں کی مصیبتوں سے خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ مذہب اسلام سے بھی بیزار ہیں اس لئے کہ اس کی ساری تاریخ شہنشاہیت اور جاگیرداری کی دردناک کہانی ہے۔ کسی کو کیا پڑی کہ وہ شہنشاہیت کے خس وخاشاک کے ڈھیر کی چھان بین کر کے اسلام کی سوئی ڈھونڈے تاکہ انسانیت کی چاک دامانی کا رفو کر سکے؟ اس کے پاس کارل مارکس کے سائنٹیفک سوشلزم کا ہتھیار موجود ہے۔ وہ اس کے ذریعے سے امرا اور سرمایہ داراں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے اسلام کی اتنی لمبی تاریخ میں سے چند سال کے اوراق کو ڈھونڈ کر اپنی زندگی کے پروگرام بنانے کی فرصت کہاں؟ سرمایہ داروں نے ان برسوں کی تاریخ کے واقعات کو سرمایہ داری کے رنگ میں رنگا۔ اور مساوات انسانی کی تحریک جس کو اسلام کہتے ہیں، مذہبی لحاظ سے عوام کی تاریخ نہ رہی اور نہ ہی اس میں کوئی انقلابی سپرٹ باقی رہی۔ عامتہ المسلمین۔ امیروں جاگیرداروں کے ہاتھ میں موم کی ناک بن کر رہ گئے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی سب سے زیادہ مفلوک الحال مگر حال مست ہیں۔ انہیں اپنے حال کو بدلنے کا کوئی احساس نہیں۔ یہ کیوں ہوا۔

اس لئے کہ خود علمائے مذہب انقلابی سپرٹ سے نا آشنا ہیں اور وہ اب تک مذہب کی اموی عباسی عقائد کے مطابق تشریح کر رہے ہیں۔

تاہم کسی کی بے خبری یا کسی گروہ کا تعصب واقعات کو نہیں بدل سکتا ہے۔
محمد رسول اللہ نئے دور کے انقلابی تھے۔ درانتی اور کلہاڑا تو اب مزدوروں کی نشانی بنا لیکن جس نے سرمایہ داری پر پہلے کلہاڑا چلایا اور قومی امتیاز کے ان ریشوں کو کاٹ کر رکھ دیا جس نے انسان کو انسان سے علیحدہ کر دیا تھا۔ صرف سرمایہ ہی طبقات پیدا نہیں کرتا بلکہ انسانوں میں گروہ بندی کرنے والے اور بھی محرکات ہیں۔ ان سب کا بڑا ذریعہ مختلف نبیوں پر ایمان ہے۔ قومیں خدا پر ایمان کے نزاع پر مختلف نہیں بلکہ مختلف نبیوں پر ایمان لانے کے باعث الگ الگ ہیں۔ پہلے آمدورفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے ہر ملک ایک الگ دنیا تھی۔ الگ الگ پیغمبروں کے ذریعے ہر ملک کی روحانی تربیت ضروری تھی۔ ایک ملک میں بیٹھ کر سب ملکوں میں پیغام نہ پہنچایا جاسکتا تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہوا۔ آپ نے لا نبیّ بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں) کا اعلان کر کے دنیا کو اتحاد کا مژدہ سنایا کہ آئندہ نبیوں کی بنا پر قوموں کی تربیت ختم ہو گئی۔ آؤ ایک محکم دین کی طرف آؤ۔ یہ سب کے حالات کے مطابق ہے۔ اسلام تمہارے سارے عوارض کا مکمل نسخہ ہے۔ زمانے نے دیکھ لیا کہ حضور کے بعد بتدریج دور دور کے ملک آمدورفت کے سلسلوں میں آسانیوں کے باعث نزدیک تر ہوتے گئے۔ اب تو دور دراز ملک ایک شہر کے محلوں سے بھی قریب معلوم ہونے لگے ہیں۔ اس لئے ملک ملک کے لئے علیحدہ پیغامبر کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اب انسانی دماغ کافی نشو نما پا چکا تھا۔ لوگ اپنا بھلا بُرا خود سمجھنے لگے۔ اب ایک سچائی پیش کرنا کافی ہے۔ باقی معاملہ لوگوں کی سمجھ پر چھوڑنا کفایت کرتا ہے۔ مذہب کی سچائی اب سمجھ سے بالا نہیں۔ بلکہ تعصب کے باعث اسے قبول کرنے میں دقت ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا سرور کائناتؐ کے آتے ہی اہل دنیا کی عقل اور علم نے حیرت انگیز ترقی کی۔

محمدؐ رسول اللہ کی نبوت کے معنے یہ تھے کہ اب انسانیت سن شعور کو پہنچ چکی ہے۔ اب کسی سکول ماسٹر کی ضرورت نہیں.... جو لوگ دنیا کے حالات کا مطالعہ

کر سکتے ہیں۔ سچی اور جھوٹی بات میں فرق کر کے وہ صحیح راہ تلاش کر سکتے ہیں۔ اب مکمل سچائی یعنی اسلام ہم تک پہنچ گیا۔ اب کسی نبی کی ضرورت نہ رہی۔ اگر ہم نبوت کا سلسلہ ابھی تک جاری مان لیں تو پھر مختلف نبیوں پر ایمان کے باعث قوموں ملکوں پر اور انسانیت میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہے گا۔پہلے توملک ملک ایک الگ دنیا تھی۔ الگ الگ نبیوں کی ضرورت تھی۔ اب جب دنیا سمٹ کر ایک کنبہ میں رہتی ہے تو نبوت کے مختلف دعویداروں کا آنا دنیا کو تقسیم بلا ضرورت کرنے سے کم نہ تھا۔رسول کریم کا لانبی بعدی کا ارشاد دنیا کے لئے رحمت کا پیغام اورانسانیت کیلئے خوش خبری تھی۔“

تاریخ اپنے تیئں دوہراتی ہے۔ علامہ بلاذری کی معجم البلدان سے بالبداہت ثابت ہے کہ حروراء مقام پر خوارج نے قرآنی آیت ”ان **الحکم الاﷲ**“ کی آڑ میں ہی امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ کی خلافت کے خلاف فتنہ برپا کیا تھا۔[1]

مفکر احرار نے اس تمہید کے بعد سیاسی پیشوا جناب جواہر لعل نہرو کی خفیہ سکیم کا پردہ فاش کرتے ہوئے صاف لکھ ڈالا:

”قادیانی تحریک کی مخالفت سیاسی اور مذہبی دونوں وجوہات کی بناء پر تھی۔ جس اسلامی جماعت نے مسلمانوں کو آزاد اور توانا قوم دیکھنے کا ارادہ کیا ہو، اسے سب سے پہلے اس جماعت سے ٹکرانا ناگزیر تھا۔ اس جماعت کے اثرورسوخ کو کم کئے بغیر آزادی کا تصور کرنا ممکن نہ تھا۔“[2]

ازاں بعد انہوں نے ”خدا سے انکار بھی مذہب کی شاخ ہے“ کے جلی عنوان سے اپنی دہریت پر اپنے ہاتھوں مہر تصدیق ثبت کر دی۔

”مذہب کیا ہے، خدا کے متعلق ایک خاص تصور اور عقیدہ۔ کوئی گروہ اس کا اقرار کر کے مذہبی ہے کوئی انکار کر کے۔ منکر خدا بھی تو خدا کے متعلق سوچتا ہے۔ وہ خدا کے اقراری کے خلاف ایسے ہی جذبات رکھتا ہے جیسے منکر خدا کے متعلق خدا کو ماننے والے۔ پس نفی واثبات کی عملی دنیا میں بحث فضول ہے کیونکہ ذہنی اعتبار سے دونوں کے خیالات کا مرجع و مرکز خدا ہی ہے۔“[3]

مفکر احرار نے ”تاریخ احرار“ کے آخر میں شہنشاہ اولین وآخرین خاتم النبیین حضرت محمد عربی

صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو "کامریڈ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ جس سے ہر عاشق رسول عربیؐ کا دل مجروح اور جگر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ پھر تحریک پاکستان کا ذکر کر کے لکھا ہے:

"اقتصادی مساوات کے بغیر ہندوستان میں امن اور آزادی ممکن نہیں۔ یہ ملک غلام رہے گا۔ اگر آزادی اور امن حاصل کرے گا تو سوشلزم کی بنیاد پر"

اور کتاب کا اختتام سوشلزم کی تبلیغ پر کرتے ہوئے لکھا:

"سرمایہ داری حقیقی اسلام کو کھا گئی۔ سرمایہ داری ختم کر وگے تو اسلام زندہ ہو جائے گا۔"

تاریخ احرار کے دوسرے ایڈیشن (1968ء) میں ایک طرف مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی کا یہ اعتراف درج ہے کہ۔

"کانگرس کی محبت اور قربانی کا نتیجہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی حکومت انگریزی سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ دے دی جائے۔"

پاکستان کے متعلق احراری سوشلسٹوں کا نظریہ

دوسری طرف پاکستان کے خلاف احراری پالیسی بایں الفاظ واضح کی گئی ہے:

"پاکستان کے متعلق ہر روز ہم سے ہماری پوزیشن پوچھی جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایسے پاکستان کو ہم پلیدستان سمجھتے ہیں" ہمیں اسلامی پروگرام کے باغی مگر نام نہاد مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اسلام کے باغی پاکستان سے ہم اس ہندوستان کو پسند کریں گے جہاں نماز روزہ کی اجازت کے ساتھ اسلام کے باقی عدل و انصاف کے پروگرام کے مطابق نظام حکومت ہو گا۔ یعنی ہر شخص کو حضرت رسول کریم ﷺ، صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی زندگی کی پیروی میں محض ضروریات زندگی مہیا کی جائیں گی اور کسی کو کسی دوسرے پر سیاسی یا اقتصادی فوقیت نہ ہو گی۔ جن لیگیوں اور کانگرسیوں کو سیاسی اور اقتصادی مُساوات سے گھن آتی ہے، وہ سن لیں کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں نہ وطنی بھائی۔ وہ لٹیروں کا ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اور احرار کا ساتھ نہیں نبھ سکتا۔

سب کو علم ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کارل مارکس کی پیدائش سے 58 سال پہلے فوت ہوئے۔ ان کے قول کے مطابق رسول کریم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ امراء اور سلاطین کی لوٹ کھسوٹ سے عوام کو بچایا جائے۔ قیصر و کسریٰ کو اور ان کے سرمایا دارانہ نظام اور امیرانہ رسم و رواج کو برباد کیا جائے اور لوگوں کو امتیازی زندگی بسر کرنے سے منع کیا جائے (حجۃ اللہ البالغہ 64)

گویا نظام اسلامی کو چلانا اور امرا اور سلاطین کی لوٹ کھسوٹ سے لوگوں کو بچانا پیغمبر (ﷺ) کا مشن تھا۔ پس اگر محمد علی جناح اسلام کے اقتصادی اور سیاسی نظام کے خلاف کسی سرمایہ داری کے نظام کو چلائے تو نفع کیا؟ اور اگر جواہر لعل اور گاندھی، خلفائے راشدین کی پیروی میں سوسائٹی میں نابرابری کے سارے نقوش کو مٹائے چلے جائیں تو بطور مسلمان کے ہمیں نقصان کیا۔"[4]

کانگرس اور برطانوی ایجنٹ ہونے کا الزام

چوہدری افضل حق صاحب نے "تاریخ احرار" میں کانگرسی مسلمانوں کے خبث باطن اور کمینہ فطرت کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ۔

"کانگرسی مسلمان کا ذہن بے حد متشکک اور متشدد ہے۔1935ء سے پہلے تو لوگوں کو سی آئی ڈی اور انگریز کے ایجنٹ کا الزام لگانا عام تھا۔ کانگرسی مسلمان اپنے دعویٰ اور عمل میں مخلص ہوتے ہیں مگر وہ دوسروں کو ہمیشہ بد عقل اور دوسروں کا آلہ کار سمجھتے ہیں.... جھوٹی خبروں کے اصرار اور تکرار کو بھی پروپیگنڈے کے فن کا اہم جزو قیاس کیا جاتا ہے۔ انسان کچھ وقت کے لئے دروغ بے فروغ کو بھی سچائی کی جان سمجھنے لگ جاتا ہے۔ بعض وقت تو دوسروں کے کہے بے وقوف سمجھ کر اپنی پگڑی میں ہاتھی ٹٹولنے لگ جاتا ہے کیونکہ معتبر راوی کہہ دیتا ہے کہ بھلے مانس تیری پگڑی میں ہاتھی ہے۔ کانگرسی مسلمانوں نے بھی بعض کے کان میں یہی پھونک دیا کہ بھیاّ مسلمانو احرار انگریز کے ایجنٹ ہیں۔ یہ ریاست (کشمیر) سے گلگت دلا رہے ہیں۔"[5]

کانگرسی مسلمانوں کی یہ سوشلسٹ گالی احرار کے انقلابی رہنما احمدیت اور پاکستان دونوں کے خلاف معرکہ آزمائی میں بے شمار مرتبہ استعمال کر چکے ہیں اور اب تک کر رہے ہیں۔ کیونکہ گوئبلز کے فن پراپیگنڈا کی اصل جان یہی ہے۔

"تاریخ احرار"کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن ملاحظہ فرمایئے توان میں "سوشلزم" کے حوالہ سے احمدیت اور تحریک پاکستان دونوں کو برطانوی امپریلزم کا ایجنٹ قرار دیا گیاہے۔ حد یہ ہے کہ اس کتاب میں کانگرس کے ہر مخالف مسلمان کو مسلمان نما، کفر پرور، زلّہ خواران افرنگ، لیگی یا غیر لیگی پشتینی کاسہ لیس اور غدار بلکہ دشمن اسلام کی گالی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔[6] احرار کے "امام الہند" ابوالکلام آزاد نے 1905ء میں بنگالی ہندوؤں کے ساتھ ملک کرملک بھرکے امن وامان کو ملیامیٹ کرنے کی خاطر "غدر پارٹی" میں شرکت کی تھی۔ اس لئے احراری "انقلابی" میں شرکت کی تھی۔ اس لئے احراری "انقلابی" رہنماؤں کے نزدیک 1857ء کو غدر کہنے والا فرنگی سامراج کا ازلی ابدی کاسہ لیس تھا۔[7]

مفکر احرار چوہدری افضل حق نے "آزادی ہند" میں لکھا کہ۔

"ہندوستان میں ایسے عالم، ایسے مصلح ایسے نبی پیدا ہو گئے جنہوں نے انگریزوں کی خوشنودی کے لئے جہاد کو منسوخ قرار دیا اور تمام مسلمانوں نے اپنے سکوت سے اس تنسیخ کی تائید کی۔"[8]

اسی کتاب میں "مفکر احرار" نے ہندوستانی مسلمانوں کو یقین دلایا کہ:-

"اسلام کو روس کے اقدامات سے کوئی خوف نہیں بلکہ اس کا اقتصادی پروگرام اسلامی پروگرام ہے.... اسلام نے دنیا کو مساوات کی بنیاد پر نئی تعمیر کی دعوت دی۔ روس کے اقدامات اس اسلامی دعوت کی تجدید ہیں۔"[9]

بالفاظ دیگر کارل مارکس، اینجلز، لینن اور سٹالین یہ سب "مجددین" اسلام تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

مفکر احرار سوشلزم کی تبلیغ کا حق ادا کرنے کے فوراً بعد تخیل پاکستان کے خلاف زہر افشانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"علیحدہ تنظیم کے مدعی ملک کی مستقل نامرادی ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندوانڈیا اور مسلم انڈیا کے تصور کو بتدریج دماغوں سے محو کر دیا جائے۔"[10]

اب اگر "مفکر احرار" کی تصانیف کے بعد ان کی مشہور تقریروں کا جائزہ لیا جائے تو قریباً ہر اہم خطاب میں سوشلزم کا پرچار اور جماعت احمدیہ اور تحریک پاکستان پر تنقید یہ تینوں موضوع یکجا اور متوازی رنگ میں ضرور ملیں گے۔ مثلاً آل انڈیا احرار کانفرنس پشاور (7تا9اپریل1939ء) کے صدارتی خطبہ میں سے اُن کے چند فقرات ملاحظہ ہوں:

"لیگ کا نقاب اوڑھے ہوئے انگریز کا ایجنٹ ایسے موقع کی تاک میں رہتا ہے کہ کب کانگرسی مسلمان کی زبان سے کوئی غیر محتاط کلمہ نکلے اور اسے عوام میں بدنام کر نے کا موقع میسر آئے۔"[11]

"ہم لیگ کو دام فرنگ سمجھ کر دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔"[12]

"سوشلسٹ کی مایوسیوں میں مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ اخوت و مساوات کے علاوہ کسی اونچ نیچ کے اصول پر سوسائٹی کی تعمیر کرنے والا خدا اگر ڈھونڈے سے بھی مل جائے گا تو احرار کے ہاتھ سے پناہ نہ پائے گا۔"[13]

"مسلمانوں کو سوشلسٹ سے نفرت نہ ہونی چاہئے.... امید رکھنی چاہئے کہ ایک دن اشتراکی روس لَااِلٰہ کہتے کہتے چند سالوں کے بعد یک بیک الا اللہ کا نعرہ بلند کرے گا۔ ہم آہستہ سے مشورہ دیں گے کہ بھلے اب محمد رسول اللہ بھی کہہ دے۔"[14]

"قادیانی فتنہ کے خلاف ہماری جدوجہد بے حد صبر آزما رہی ہے.... تاہم ہمیں خدا کی مہربانی پر بھروسہ ہے کہ احرار کا وسیع نظام.... دس برس کے اندر اندر اس فتنہ کو ختم کر کے چھوڑے گا.... ملک میں انگریزی اثر ورسوخ جوں جوں کم ہو گا، توں توں سرکار کا یہ خود کاشتہ پودا مرجھاتا چلا جائے گا۔"[15]

"سوچ لو پاکستان کی تحریک بھی برطانوی جھانسہ ہی نہ ہو.... پاکستان کی تحریک مکانی لحاظ سے نہیں بلکہ زمانی لحاظ سے بھی شر انگیز ہے۔"[16]

مجلس احرار کا ترجمان "آزاد" لاہور لکھتا ہے:

"جب حجۃ الاسلام حضرت علاّمہ انور شاہ صاحب کاشمیری، حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی اور حضرت مولانا ثنا اللہ صاحب امرت سری وغیرہم رحمہم اللہ کے علمی اسلحہ فرنگی کی اس کاشتہ داشتہ "نبوت" کو موت کے گھاٹ نہ اتار سکے تو مجلس احرار اسلام کے مفکر اکابر نے جنگ کا رُخ بدلا، نئے ہتھیار لئے اور علمی بحث و نظر کے میدان سے ہٹ کر سیاست کی راہ سے فرنگی سیاست کے شاہکار پر حملہ آور ہو گئے۔"[17]

برصغیر کی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے خلاف ملک بھر کے علماء کا فتویٰ کفر شائع کرنے والے محمد حسین صاحب بٹالوی کو انگریزی حکومت نے چار مربعے زمین عطا کی مگر حضرت مسیح موعودؑ کے شاہی خاندان کی جاگیر جو اسّی دیہات پر مشتمل تھی، ضبط کر لی گئی۔

یہی وہ اوّلین محافظ ختم نبوت تھے جنہیں شمس العلماء کا خطاب ملا اور دربار دہلی میں انگریزی حکومت کے میزبان بنے اور انہی کی تحریک پر وہابی کہلانے والوں کو سرکاری کاغذات میں اہلحدیث لکھا جانے لگا۔ یہی صاحب تھے جنہوں نے برطانوی حکومت کو خبردار کیا کہ:-

"گورنمنٹ کو اس کا اعتبار کرنا مناسب نہیں اور اس سے پُر حذر رہنا ضروری ہے۔ ورنہ اس مہدی قادیانی سے اس قدر نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جو مہدی سوڈانی سے نہیں پہنچا۔"18

اسی طرح مولوی کرم دین صاحب آف بھیں نے انگریزی حکومت کو انتباہ کرتے ہوئے لکھا کہ:-

"گورنمنٹ کو اپنی وفادار مسلمان رعایا پر اطمینان ہے۔ اور گورنمنٹ کو خوب معلوم ہے کہ مرزا جی جیسے مہدی مسیح وغیرہ بننے والے ہی کوئی نہ کوئی آفت سلطنت میں برپا کیا کرتے ہیں.... مرزا جی نے تو مسلمانوں میں یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ مہدی و مسیح کا یہی زمانہ ہے اور قادیان ضلع گورداسپور میں وہ مہدی و مسیح بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کسر صلیب کے لئے مبعوث ہوا ہے تا کہ عیسویت کو محو کرکے اسلام کو روشن کرے اور یہ بھی بر ملا کہتا ہے کہ خدا نے اسے بتلا دیا ہے کہ سلطنت بھی اُسی کو ملنے والی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی متعدد تصانیف میں یہ الہام و کشف سُنایا ہے کہ خدا نے اُسے بتلا دیا ہے کہ بادشاہ اس کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔ بلکہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ بادشاہ اسے دکھائے بھی گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہت مرزائیوں کی جماعت کو کسی زمانہ میں ملے گی۔ اب خیال فرمایئے کہ یہ خیال کہاں تک خوفناک خیال ہے۔ جبکہ مرزا جی نے یہ الہام ظاہر کرکے پیشگوئی کر دی ہے کہ بادشاہ اس کے حلقہ بگوش ہوں گے اور بادشاہت مرزائیوں کو ملے گی۔ کیا عجب کہ ایک زمانہ میں مرزائیوں کو جو اس کی پیشگوئیاں پورا کرنے کے لئے اپنی جانیں دینے کو تیار ہیں.... یہ جوش آجائے کہ اس پیشگوئی کو پورا کیا جائے اور وہ کوئی فتنہ وبغاوت برپا کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا جی نے مسلمانوں کو نصاریٰ سے سخت بدظن اور مشتعل کر رکھا ہے کہ وہ دجّال سمجھتے ہیں تو نصاریٰ کو۔ خر دجال کہتے ہیں تو ریلوے کو۔ اب سوال یہ ہے کہ ریلوے کس نے جاری کر رکھی ہے۔ جب یہ خر دجّال ہے تو اس کے چلانے والے بادشاہ وقت کو ہی یہ دجّال کہتے ہیں۔ اور

مسلمانوں کو اس کے خلاف سخت مشتعل کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ کو ایسے اشخاص کا ہر وقت خیال رکھنا چاہئے۔"[19]

اسی نظریہ کے مطابق جناب ابو القاسم صاحب دلاوری مؤلف "رئیس قادیان" اخبار "آزاد" میں لکھتے ہیں:

"گو مرزا صاحب نے تقدس کی دکان ابتداءً محض شکم پروری کے لئے کھولی تھی لیکن ترقی کر کے سلطنت پر فائز ہونے کا لائحہ عمل بھی شروع سے ان کے پیش نظر تھا۔ اور انہیں آغازِ کار سے اس مطلب کے الہام بھی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بقول میاں بشیر احمد ایم۔ اے مرزا صاحب کا پہلا الہام جو 1868ء یا 1869ء میں ہوا، یہ تھا کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے.... خود مرزا صاحب نے نہ صرف الہام کا بڑے طمطراق سے براہین میں تذکرہ فرمایا۔ بلکہ عالم کشف میں وہ بادشاہ بھی مرزا صاحب کی مقدس بارگاہ میں پیش کر دیئے گئے.... گو بادشاہوں کی متابعت کا کشف یا خواب کبھی پورا نہ ہو۔ لیکن اس سے کم از کم قادیانی صاحب کی ذہنی کیفیت، ان کے خیالات کی بلند پروازی اور ان کی الوالعزمی کا ضرور پتہ چلتا ہے اور اس سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ قیامِ سلطنت کے اصل داعی و محرک میرزا صاحب ہی تھے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ قوم کے مغل تھے اور رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا تھا۔ میرے خیال میں میرزا صاحب نے قیام سلطنت کی جن آرزوؤں کو اپنے دل میں پرورش کیا، وہ قابل صد ہزار تحسین تھیں۔"[20]

لیکن ان حقائق کے باوجود اشتراکیت اور کانگرس کے ایجنٹوں نے جماعت احمدیہ کو برطانوی امپریلزم قرار دے کر مسلمانان ہند میں نفرت کی ایک خلیج حائل کر دی حالانکہ یہ سو فیصدی جھوٹ تھا جس کی بنیاد "انقلابی" احرار لیڈروں کے "شیخ الاسلام" حسین احمد دیوبندی کے اس فتویٰ پر تھی کہ

"عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں بُرا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے۔"

"ہمارے بزرگوں نے 1857ء میں سب کچھ کیا تھا مگر جب انگریز حکام نے پوچھا تو سب کا انکار کر کے چلے آئے اور کسی چیز کا اقرار نہ کیا.... یہ جھوٹ ناجائز نہیں بلکہ ضروری ہے۔"[21]

حواشی:

1 "خطبات احرار" (ناشر مکتبہ احرار لاہور مارچ 1944ء) کے دیباچہ میں شورش کاشمیری لکھتے ہیں "ان الحکم الا اللہ.... اس قرآنی اعلان کی روشنی میں کوئی انسانی بادشاہت احرار کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں"

2 ایضاً صفحہ 141۔

3 ایضاً صفحہ 142۔

4 صفحہ 59-60 ناشر مکتبہ مجلس احرار اسلام پاکستان لاہور۔ ملتان طبع ثانی 1968ء۔

5 طبع دوم صفحہ 114-115۔

6 "تاریخ احرار" طبع ثانی صفحہ 31۔

7 "تاریخ احرار" طبع ثانی صفحہ ہ۔

8 صفحہ 202۔ ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔

9 صفحہ 194۔

10 صفحہ 200۔

11 خطبات احرار صفحہ 22۔ طبع اول مارچ 1944ء ناشر مکتبہ احرار لاہور۔

12 ایضاً صفحہ 22۔

13 ایضاً صفحہ 27۔

14 ایضاً صفحہ 31۔

15 ایضاً صفحہ 37۔

16 ایضاً صفحہ 42۔

17 "آزاد" 30 اپریل 1951ء صفحہ 17۔

18 "اشاعۃ السنہ" حاشیہ جلد 16 صفحہ 168۔

19 "تازیانہ عبرت" طبع دوم صفحہ 93-94 از "شیر اسلام مولوی محمد کرم دین صاحب دبیر" مطبوعہ پرنٹنگ پریس لاہور۔

20 "آزاد" 24 نومبر 1950ء۔

21 نقش حیات جلد دوم صفحہ 626 از حسین احمد دیوبندی ناشر دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر 1 طبع اول۔

انیسویں فصل

مسلمانان ہند کے مطالبہ سے غداری

سر اقبال نے اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد 1930ء میں ایک خطبہ دیا جس میں انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ مسلمانان ہند کا متفقہ مطالبہ ہندوستان میں مسلم ریاست کا قیام ہے۔ اور یہی مطالبہ نہرو کمیٹی میں پیش کیا گیا جسے کمیٹی نے اس بناء پر ردّ کر دیا کہ اس کے نتیجہ میں ملک کا وسیع رقبہ مسلمانوں کے اقتدار میں چلا جائے گا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ اس موقع پر مسلمانان ہند کے قومی مطالبہ کی پُرزور وکالت کر کے اسکی تائید میں سیاسی اور قانونی نکات کا دریا بہا دیتے۔ الٹا انہوں نے مسلم مفاد سے غداری کرتے ہوئے اپنی ذاتی تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کی تسلی کے لئے سرحد، سندھ، بلوچستان اور صرف مسلم اکثریت کے اضلاع پنجاب پر مشتمل شمال مغربی ہند کو ایک مسلم صوبہ بنا دیا جائے اور ساتھ ہی رام راج کے حامی کانگرسی لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا:-

> "ایسی مجوزہ ریاست تو بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ ادھر اگر ضلع انبالہ اور شاید دوسرے اور اضلاع کو الگ کر دیا جائے جہاں غیر مسلموں کی آبادی ہے تو پھر یہ وسعت اور بھی گھٹ جاتی ہے۔"
>
> پھر بتایا، "اس چیز سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری بڑھ جائے گا اور اُن کے احساسِ وطن کو بھی زبر دست تقویت پہنچے گی۔ وہ ہندوستان کے بہترین رکھوالے اور محافظ ثابت ہوں گے۔" [1]

آل انڈیا نیشنل کانگرس مسلمانوں میں قومیت متحدہ کا جو تصور اپنے احراری اور دیوبندی ایجنٹوں کے ذریعہ مسلط کرنا چاہتی تھی، یہ خطبہ صدارت اس کا شاہکار تھا۔ ویسے بھی انہوں نے خطبہ کے شروع میں یہ واضح کر دیا تھا کہ "میں نہ تو کسی جماعت کا قائد ور ہنما ہوں اور نہ کسی کا پیرو ہوں۔" [2]

بنابریں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں اس ذاتی تجویز پر کسی قرارداد کے منظور کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خصوصاً اس لئے کہ اس ذاتی تجویز نے مسلمانان ہند کے اصل مطالبہ کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور صرف ایک صوبہ کے قیام پر قناعت کی گئی۔ جہاں تک مسلمانوں کے سب سے بڑے خطّہ یعنی اکثریتی صوبہ بنگال کا تعلق تھا، اسے ہندو سودیش تحریک سے دلی ہم آہنگی کے باعث

یکسر نظر انداز کر دیا گیا جو مسلمانانِ ہند کی وحدت ملی میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھا۔

تاریخ مسخ کرنے کی سازش

جناب جسٹس جاوید اقبال صاحب شریف الدین پیرزادہ کی کتاب ”ارتقائے پاکستان“ انگریزی کے صفحات 37 تا 120 کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

”برصغیر میں فرقہ وارانہ مسئلہ یا اس کے شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں مسلم اکثریت کی موجودگی بجائے خود ایسی حقیقتیں تھیں جو روز روشن کی طرح عیاں تھیں۔ اس لئے اقبال سے پیشتر بھی بعض شخصیتوں کو ان کا احساس تھا اور فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہندوستان کی تقسیم کے متعلق بسا اوقات خیالات کا اظہار کیا جاتا یا تجاویز پیش کی جاتی تھیں۔ شریف الدین پیرزادہ نے اپنی انگریزی تصنیف ”ارتقائے پاکستان“ میں سرسید، حالی اور عبدالحلیم شرر (دونوں سرسید کے معتقدین میں سے تھے) کے علاوہ ایسی انیس شخصیتوں کا ذکر کیا ہے، جن کی کارگزاری کا اس مرحلہ پر جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

شریف الدین پیرزادہ کی تحقیق کے مطابق 1857ء میں جان برائیٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان میں بیس مختلف قومیں آباد ہیں جو بیس مختلف زبانیں بولتی ہیں۔ اس لئے انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنے سے پیشتر وہاں پانچ یا چھ آزاد ریاستیں قائم کرنی پڑیں گی۔ 1881ء میں جمال الدین افغانی نے وسطی ایشیا کے روسی مسلم علاقوں، افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ری پبلک کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔ 1883ء میں ولفرڈ بلنٹ نے تجویز پیش کی کہ شمالی ہندوستان میں مسلم اور جنوبی ہندوستان میں ہندو حکومتیں قائم کر دی جائیں مگر ہر صوبہ میں انگریزی فوج موجود رہے۔ 1905ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا نفاذ کیا تا کہ مشرقی بنگال کے پسماندہ مسلمان ترقی کر سکیں۔ لیکن چونکہ بنگالی مسلمان سیاسی طور پر منظم نہ تھے، اس لئے بنگالی ہندوؤں کے احتجاجی مظاہروں کے سبب تقسیم منسوخ کرنی پڑی۔ 1911ء میں سید امیر علی نے سر محمد شفیع کو خط لکھا تھا کہ ہندو اور مسلم دو علیحدہ قومیں

ہیں۔ اس لئے یہاں صرف ایسا دستوری نظام ہی قابل عمل ہو سکتا ہے جو ان کے جداگانہ قومی تشخص یا حقوق کے تحفظ کا ضامن ہو۔ 1913ء میں ولایت علی بمبوق نے اخبار کامریڈ کے مزاحیہ کالم میں تحریر کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھنا چاہیے تا کہ شمالی ہندوستان مسلمانوں کو دیا جا سکے اور جنوبی ہندوستان ہندوؤں کو۔ 1917ء میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے یورپ میں سٹاک ہوم کی سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس کے دوران ایک تحریری بیان میں کہا تھا کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کو خود مختاری کا حق دیا جانا چاہئے تا کہ مسلم اور ہندو اکثریتی صوبے علیحدہ علیحدہ وفاق قائم کر سکیں۔ 1920ء میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے اخبار ذوالقرنین بدایوں میں مہاتما گاندھی کے نام ایک خط شائع کیا جس میں تجویز پیش کی کہ ہندوستان کو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تقسیم کر دینا چاہیئے۔ اس خط میں صوبوں کے مختلف اضلاع میں ہندو مسلم آبادی کے تناسب کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔ 1921ء میں نادر علی، جو انگریزوں کے بڑے مداح تھے اور تحریک خلافت کی مخالفت میں سرگرم عمل رہے، نے حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنازعوں کے حل کے لئے ہندوستان کی تقسیم لازمی ہے۔
1923ء میں سردار گل محمد خان، صدر انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خان نے سر ڈینس برے کی زیرِ صدارت شمال مغربی سرحد کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ پشاور سے آگرہ تک کا علاقہ مسلمانوں کو اور آگرہ سے راس کماری تک کا علاقہ ہندوؤں کو دے دیا جائے اور دونوں قومیں آپس میں اپنی اپنی آبادیوں کا تبادلہ کر لیں۔ 1924ء میں مولانا حسرت موہانی نے تجویز پیش کی تھی کہ شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں کو مدغم کر کے ایک صوبہ بنایا جائے اور اسے ہندوستان کے وفاقی نظام میں ایک وحدت کی پوزیشن حاصل ہو۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی نے رد کر دی تھی۔ 1924ء میں لالہ لاجپت رائے نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ہندو مسلم آبادی کے لحاظ سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کر دی جائے اور پھر مغربی پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے علاقے مسلمانوں کو دے دیئے جائیں اور ہندوستان کے باقی تمام صوبوں میں ہندو حکومتیں قائم کی جائیں۔ مگر بعد میں لالہ

لاجپت رائے مکر گئے اور کہا کہ انہوں نے ایسے کسی خیال کا اظہار نہیں کیا تھا۔
1924ء میں اسٹالن (روسی آمر) نے کہا تھا کہ ہندوستان بظاہر ایک متحدہ ملک دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب وہاں انقلاب آیا تو کئی اجنبی قومیں منصّہ شہود پر آجائیں گی۔1924ء میں مولانا محمد علی نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے قسطنطنیہ سے لے کر دہلی تک ایک "کارے ڈور" (رستہ کی شکل میں علاقے کا ٹکڑا) بنا دینی چاہئے۔1925ء میں دست شناس کیرو نے پیشین گوئی کی تھی کہ ہندوستان سے انگریزوں کو بالآخر نکلنا پڑے گا اور وہ مسلمانوں اور بدھ مت کے ماننے والوں میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ 1928ء میں "ایک ہندی مسلمان" نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ہندواور مسلمان دوایسی ہی مختلف قومیں ہیں جیسے جرمن اور فرانسیسی اور چونکہ ان میں اتحاد ممکن نہیں، اس لئے ہندوستان کو ان میں تقسیم کر دینا چاہئے۔
1928ء میں مرتضٰے احمد خان نے اخبار انقلاب میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا جس میں شمال مغرب کے اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم وطن کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔"[3]

انہی حقائق کی بناپر تحریک پاکستان کے نامور لیڈر اور قائداعظم محمد علی جناح کے دست راست ایم اے ایچ اصفہانی نے ایڈیٹر پاکستان ٹائمز کے نام خط میں ڈنکے کی چوٹ لکھا۔

"اس بات سے بلا شبہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر اقبال کا فکر شاعری اور خطبات بھی اسی سمت میں اشارہ کرتے تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ وہ مسلم ریاست کے تصوّر کے خالق تھے، تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔"[4]

اوائل1934ء کا واقعہ ہے کہ لنڈن کے اخبار آبزرور (Observer) میں کیمرج یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ ٹامسن کا لکھا ہوا ایک مضمون سپرد اشاعت ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے برسبیل تذکرہ اقبال کو پاکستانی اسکیم کا حامی لکھ دیا۔ جس پر سر اقبال نے 4مارچ1934ء کو پروفیسر ٹامسن کے نام خط لکھا جس میں کیمرج سے اٹھنے والی پاکستان اسکیم سے بریت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔

"اپنے (مسلم لیگ) کے خطبے میں جو اسکیم میں نے پیش کی تھی، وہ ایک مسلم صوبے کے قیام کی ہے یعنی شمال مغربی ہند میں ایک ایسے صوبے کا قیام عمل میں آئے

جس میں بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے مگر پاکستان کی اسکیم یہ ہے کہ مسلم صوبوں کی ایک جداگانہ وفاقی ریاست کا قیام عمل میں آئے جس کی حیثیت ایک ڈومینین کی ہو اور اس کا انگلستان سے براہ راست رشتہ ہو۔ یہ اسکیم کیمرج سے شروع کی گئی ہے اور اس کے مصنّفوں کا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس کے ہم مسلم ممبروں نے ہندو یا نام نہاد ہندوستانی قوم پرستی کی قربان گاہ پر مسلم قوم کو قربان کر دیا ہے۔"[5]

گول میز کانفرنس اور سر اقبال

یہ حقیقت ہے کہ سر اقبال دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں مسلم وفد کے ممبر کی حیثیت سے شامل ضرور ہوئے مگر انہوں نے مسلم حقوق کے تحفظ سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ لی۔ چنانچہ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"لندن میں ان کا ورود وہاں کے فلسفی، ادبی اور مستشرقین حلقوں میں بہت دلچسپی کا موجب رہا۔ والڈارف ہوٹل میں آپ کے اعزاز میں وسیع پیمانہ پر استقبالی دعوت کا انتظام ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پرانے اور نئے احباب کی ملاقاتوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن کانفرنس کی سُست رفتاری سے اُن کی طبیعت بہت اکتائی رہی۔"[6]

کانگرسی سیاست کا فرقہ پرستانہ مفاد اسی میں تھا کہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسی مسلمان شخصیت مسلم اقلیت کے مسئلہ میں چپ سادھے رہے۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوئے اور اس طرح ان کا سکوت کانگرسی موقف کی تقویت کا موجب بنا اور اگر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی روداد کا باریک نظری سے مطالعہ کیا جائے تو قائد اعظم کا کانگرسی رویہ سے بیزار ہو کر انگلستان ہی میں مستقل قیام کے فیصلہ میں اقبال کی مصلحت آمیز خاموشی کا بھی بھاری عمل دخل تھا۔

گول میز کانفرنس اور انڈیا ایکٹ کے نفاذ سے قبل مطالبہ اقلیت

آل انڈیا نیشنل کانگرس اور احرار، رام راج کے لئے ملک بھر میں اپنی سکیم کے مطابق پورے زور و شور سے باغیانہ کارروائیاں کر رہے تھے۔ اور اُن کا یقین تھا کہ وہ برٹش حکومت کو ہتھیار ڈالنے اور ملک بدر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مسلمانوں اور ملک کی دوسری اقلیتوں کے مستقبل کے بارے میں ہندو کانگرس خود فیصلہ کرے گی۔ لیکن حکومت نے اُس کے سامنے جھکنے کی بجائے مسلم حقوق اور دوسرے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے تین بار لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا۔

کانفرنس میں مسلم زعماء میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب، سر آغا خاں اور حضرت قائد اعظم محمد علی جناح پیش پیش تھے۔ گول میز کانفرنس میں مسلم حقوق کی ترجمانی ایک جہاد عظیم سے کم نہیں تھی خصوصاً اس لئے کہ انگریزی حکومت اس وقت آل انڈیا نیشنل کانگرس کی عددی اکثریت سے لرزہ براندام تھی اور انگریزی ڈپلومیسی درپردہ مسلم حقوق کو نظر انداز کرنے اور کانگرس کی خوشنودی حاصل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح نے 12 نومبر 1930ء کو انگریزی حکومت کو انتباہ کیا:

"When you say that a large, a very influential party in India stands for wrecking or misusing the future constitution, I ask you this question. Do you want those parties who have checked, held in abeyance the party that stands for complete independence, do you want those people to go back with this answer from you that nothing can be done because there is a strong party which will misuse or wreck the constitution which we will get from you. Is that the answer you want to give? Now let me tell you the tremendous fallacy of that argument and the grave danger. Seventy millions of Mussulmans - all, barring a few individuals here and there, have kept aloof from the non-cooperation movement. Thirty-five or forty millions of depressed classes have set their face against the non co - operation movement. Sikhs and Christians have not joined it. And let me tell you that even amongst that party which you characterize as a large party and I admit that it is an important party it has not got the support of the bulk of Hindus. Do you want every one of the parties who have still maintained that their proper place is to go to this conference, and across the table to negotiate and come to a settlement

which will satisfy the aspirations of India, to go back and join the rest? Is that what you want? Because what other position will they occupy? What will be the answer? I want you to consider the gravity of it, a gravity which was emphasized by previous speaker. You may, of course, argue it as long as you like.[7]

کانگرس کی مسلمانوں کے خلاف معاندانہ چال

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شامل مسلم زعماء کے مقابل کانگرسی ہائی کمان اور دوسرے تمام لیڈر سرے سے برٹش انڈیا کی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کو ملکی قانون میں مراعات دینے کے سراسر خلاف تھے اور ان کا واحد مطالبہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت فی الفور ملک کی باگ ڈور ہندو کانگرس کو سونپ دے۔ کانگرس خود اقلیتوں سے نبٹ لے گی اور جو چاہے گی ان کے حقوق کی نسبت فیصلہ کرے گی۔ چنانچہ پنڈت نہرو نے گول میز کانفرنس کی کارروائی کا دل کھول کر مذاق اڑایا اور لکھا۔

"گول میز کانفرنس ختم ہو رہی تھی اور اس کے فیصلوں کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ہمیں اس پر ہنسی آتی تھی اور شاید اس ہنسی میں کسی قدر حقارت بھی شامل تھی۔ یہ ساری تقریریں اور بحثیں بالکل بے کار اور حقیقت سے خالی معلوم ہوتی تھیں۔"[8]

جناب نہرو صاحب نے گول میز کانفرنس کے بارے میں کانگریس کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

"گاندھی جی لنڈن گول میز کانفرنس میں کانگرس کے تنہا نمائندہ کی حیثیت سے گئے تھے.... ہم گول میز کانفرنس میں کچھ اس لئے تو شرکت نہیں کر رہے تھے کہ جا کر دستور ملکی کی ضمنی تفصیلات (مثلاً مسلم اقلیت کے حقوق۔ناقل) سے متعلق وہ بحثیں چھیڑیں جو کبھی ختم ہی ہونے میں نہ آئیں۔ اس وقت ان تفصیلات میں ہمیں ذرا دلچسپی نہ تھی۔ ان پر تو غور اسی وقت ہو سکتا تھا کہ برطانوی حکومت سے بنیادی معاملات پر کوئی سمجھوتا ہو جاتا۔ اصل سوال یہ تھا کہ جمہوری ہند کو کتنی طاقت منتقل کرنی ہے۔ تفصیلات کو طے کرنے اور انہیں قلمبند کرنے کا کام تو کوئی بھی قانون دان بعد کو کر سکتا تھا۔"

نیز مسلم نمائندوں کو برطانوی سامراج کا گماشتہ قرار دیتے ہوئے یہ گوہر افشانی کی کہ
"کانفرنس کے ہندوستانی ممبروں میں سے بڑی اکثریت زیادہ تر ارادۃً کچھ بے ارادہ، اس سرکاری چال کا ساتھ دے رہی تھی۔ اور یہ مجمع تھا بھی نرالا۔ ان میں کون تھا جو اپنی ذات کے سوا اور کسی کا نمائندہ ہو۔ بعض ان میں سے ضرور قابل اور معزز لوگ تھے اور بہت سے ایسے تھے جن کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے یہ لوگ بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی دشمن عناصر کے نمائندے تھے اور ایسے رجعت پسند اور تغیر دشمن کہ ہمارے ہندوستانی لبرل تک، جو یہاں اس درجہ محتاط اور معتدل لوگ سمجھے جاتے ہیں، وہاں ان کے مقابلہ میں ترقی خواہ کی حیثیت سے چمکتے رہے! یہ لوگ ہمارے ملک کے ان اہل غرض گروہوں کی نمائندگی کر رہے تھے جن کا مفاد برطانوی سامراج سے وابستہ ہے اور اپنی غرضوں کی تکمیل اور تحفظ کے لیے یہ اسی سامراج کا منہ تکتے ہیں۔ سب سے ممتاز نمائندگی مختلف اقلیتوں اور اکثریتوں کی طرف سے فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق تھی، ان میں اونچے طبقہ کے کچھ لوگ تھے جو کسی کی بات نہیں مانتے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ آپس میں بھی متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاسی لحاظ سے یہ سب کٹر ترقی دشمن تھے اور ان کا مقصد بس یہ تھا کہ کچھ فرقہ داری فائدہ حاصل کر لیں، چاہے اس میں ملک کی سیاسی ترقی کو یکسر ہاتھ سے دینا ہی کیوں نہ پڑے۔ چنانچہ انہوں نے صاف اعلان ہی کر دیا تھا کہ کسی ایسی کارروائی پر جس سے ملک کو کچھ اور سیاسی آزادی ملے، یہ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک ان کے فرقہ وارانہ مطالبات پورے نہ ہو جائیں۔ کیسا نرالا نظارہ تھا! اور کیسی تکلیف دہ وضاحت سے یہ بات روشن ہوتی تھی کہ ایک محکوم قوم کس قدر نیچے جا سکتی ہے اور کس طرح اسے سامراجی بساط کا مہرہ بنایا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ راجوں، مہاراجوں، لاٹ صاحبوں، سروں اور بالقابہم، کا یہ انبوہ ہندوستانی قوم کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اراکین کو برطانوی حکومت نے نامزد کیا تھا اور اپنے نقطہ نظر سے واقعی خوب انتخاب کیا تھا۔ یہ سب صحیح، مگر پھر بھی اس بات سے کہ برطانوی حکام ہمیں یوں برت سکتے اور اپنے کام میں لا سکتے ہیں، ہماری قوم کی کمزوری ظاہر ہوتی تھی۔ اور

پتہ چلتا تھا کہ ہمیں کس آسانی سے بہکا یا جاسکتا ہے اور ایک سے دوسرے کی کوششوں کا کیسے کاٹ کرایا جا سکتا ہے۔ ہمارے اونچے طبقہ کے لوگ ابھی تک سامراجی حکمرانوں کی ذہنیت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انہیں کا کام کرتے ہیں۔ کیا انہیں اس کی حقیقت نہیں دکھائی دیتی؟ یا یہ بات ہے کہ اس کی حقیقت کو جانتے ہیں اور جان بوجھ کر اس لیے اسے قبول کرتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت اور آزادی کے قیام سے انہیں ڈر لگتا ہے۔؟

بہت ہی ٹھیک بات تھی کہ اغراض کے اس ہجوم میں سامراجی منصب داری، مالیاتی، صنعتی، مذہبی، فرقہ داری اغراض کے اس جمگھٹ میں، برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغاخاں کے حصہ میں آئی تھی۔ اس لیے کہ اغراض کچھ نہ کچھ سب ہی ان کی ذات میں یکجا جمع ہیں۔ ایک نسل سے زیادہ عرصہ سے یہ برطانوی سامراج اور برطانوی حکمران طبقہ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ رہتے سہتے بھی زیادہ تر انگلستان ہی میں ہیں۔ یہ ہمارے حکمرانوں کے مفاد اور ان کے نقطہ نظر کو واقعی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اگر گول میز کانفرنس میں سامراجی انگلستان کی طرف سے یہ آتے تو اس کے نہایت ہی قابل نمائندہ ثابت ہوتے۔ مگر ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ ہندوستان کی نمائندگی فرمارہے تھے۔

کانفرنس میں ہمارا مقابل پلّہ بہت بھاری تھا اور ہمیں اس سے کوئی زیادہ توقع بھی نہ تھی۔ پھر بھی اس کی کارروائی کو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور گھن آتی تھی۔ ہم قومی اور معاشی مسائل کی بھی سطح کو کھرچنے کی لغو اور جھوٹ موٹ کی کوششوں کو دیکھتے تھے۔، معاہدوں اور سازشوں اور چالوں کو دیکھتے تھے۔ برطانوی کنزرویٹو پارٹی کے ترقی دشمن حصہ سے اپنے بعض اہل وطن کا سازباز دیکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات پر لامتناہی بک بک سُنتے تھے۔ دیکھتے تھے کہ اصلی معاملات کو کیسے جان بوجھ کر ٹالا جارہا ہے اور ہمارے ہی آدمی برابر کس طرح اہل غرض اور خصوصاً برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ آپس کی جھک جھک دیکھتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ جشن اور دعوتیں اور باہمی مدح وثنا کا طوفان! شروع سے آخر تک خدمتوں کی تلاش تھی، بڑی ہوں کہ چھوٹی، ہندووں کیلئے خدمتیں اور نشستیں،

مسلمانوں کے لیے خدمتیں ہوں اور نشستیں، سکھوں کے لیے بھی ہوں، اینگلو انڈین جماعت کے لیے بھی اور یورپین گروہ کے لیے بھی۔ مگر ہوں خدمتیں سب اعلیٰ طبقہ کے لیے، بیچارے عوام کو ان میں ذرا دخل نہ ہو۔ ابن الوقتی کا دور دورہ تھا اور مختلف گروہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شکار کی گھات میں تھے، بس یہی فکر کہ نئے دستور سیاسی میں کچھ لے مریں۔ خود آزادی کے تصور نے بڑے پیمانے پر خدمت طلبی کی شکل اختیار کرلی تھی، جسے Indianisation یا 'ہندیانا' کہتے تھے، یعنی فوج میں ہندوستانیوں کو زیادہ خدمتیں ملیں، سول سروس میں بھی زیادہ ملیں وغیرہ وغیرہ۔ خود مختاری حقیقی آزادی، جمہوری ہند کو طاقت اور اختیار کی منتقلی، یا ہندوستانی قوم کے کسی اہم اور ضروری معاشی مسئلہ کے حل کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ کیا اسی کے لیے ہندوستان نے یوں مردانہ وار جدوجہد کی تھی؟ اور کیا ایثار و قربانی کی اس لطیف فضا کو کانفرنس کی کثیف ہوا سے بدلنا ضروری تھا؟

اُس سنہرے اور بھرے ہوئے ہال میں گاندھی جی بیٹھے تھے، یکہ و تنہا، ان کا لباس یا بے لباسی، انہیں اوروں سے ممتاز کرتی تھی مگر ان میں اور ان کے خوش لباس ہم نشینوں میں افکار اور نقطہ نظر کا فرق اس سے بھی زیادہ تھا۔ اس کانفرنس میں ان کی حیثیت بڑی ہی مشکل کی تھی۔ اور ہم یہاں دور سے بیٹھے حیرت کرتے تھے کہ یہ اسے کس طرح برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ حیرت انگیز صبر کے ساتھ اپنا کام کئے گئے اور پیہم کوشش کرتے رہے کہ سمجھوتہ کی کوئی صورت پیدا ہو۔ اُنہوں نے ایک خاص بات کی جس نے ایک مرتبہ یہ راز فاش کردیا کہ فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔ کانفرنس کے مسلمان نمائندوں نے جو فرقہ دارانہ مطالبات پیش کئے تھے، گاندھی جی ان میں سے بہتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور ان کے مسلمان قوم پرور ساتھیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ان مطالبات میں سے بعض آزادی اور جمہوریت کی راہ میں حائل ہوں گے۔ پھر بھی انہوں نے کہہ دیا کہ میں بلا پوچھے گچھے اور بے دلیل و بحث ان سب مطالبوں کو مان لونگا اگر مسلمان نمائندے سیاسی مطالبہ یعنی خود مختاری کے مطالبہ میں میرے ساتھ اور کانگرس کے ساتھ مل جائیں۔

یہ بات انہوں نے بالکل شخصی طور پر کہی تھی اس لیے کہ وہ اس وقت تو

کانگریس کواس کا پابند نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں کانگریس کواس کے تسلیم کرنے پر آمادہ کرونگااور کوئی شخص جو کانگریس میں ان کی حیثیت کو جانتا ہو شُبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کانگرس سے اس بات کو منوانے میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔ لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور سچ بھی ہے۔ آغاخاں کو آزادی ہند کی حمایت میں کمربستہ تصور کرنا بھی ذرا مشکل ہے۔"[9]

نیز لکھا۔

"یہ ایک حقیقت بالکل ظاہر تھی کہ اس وقت جب ہمارا ملک انتہائی مصیبت کے دور سے گزر رہا تھا اور ہماری عورتیں اور مرد حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دے رہے تھے، ہمارے بعض وطن پرست ان سب چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہمارے حریفوں کو اخلاقی مدد پہنچارہے تھے۔ ہم پر یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ قوم پرستی کے پردے میں متضاد معاشی اغراض کام کررہے ہیں اور وہ لوگ جو مستقل حقوق کے مالک ہیں اسی قوم پرستی کے نام سے آئندہ کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کا انتظام کر رہے ہیں۔ گول میز کانفرنس صریحی طور پر ان ہی لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ ان میں سے اکثر نے ہماری تحریک کی مخالفت کی تھی اور بعض دور سے تماشا دیکھا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں جتادیتے تھے کہ ان لوگوں کی خدمت بھی کچھ کم نہیں جو موقع کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ مگر یہ انتظار کا زمانہ لندن کی نگاہ ناز کے ایک اشارے میں ختم ہو گیا۔ اور یہ سب حضرات وہاں دوڑے گئے کہ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کریں اور جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آجائے اس میں حصہ بٹائیں۔ لندن میں یہ صف بندی کرنے میں اس خیال سے اور بھی عجلت کی گئی کہ کانگرس کی انتہا پسندی بڑھتی جاتی ہے اور اس پر عام لوگوں کا اثر غالب آتا جاتا ہے۔ مستقل حقوق کے مالکوں میں خود بخود یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر ہندوستان میں کوئی بنیادی سیاسی تبدیلی ہوئی تو عام لوگوں کا طبقہ حاوی ہو جائے گا یا کم سے کم اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اور وہ یقینا بنیادی سماجی تبدیلیوں پر زور دے گا جس سے ان کے مستقل حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس خطرے کو دیکھ کر یہ حضرات گھبرائے اور انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ کوئی اہم سیاسی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ وہ چاہتے تھے انگریز ہندوستان

میں پنچ بنے بیٹھے رہیں تاکہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو قائم رکھیں اور ان کے مستقل حقوق کی حفاظت کرتے رہیں۔ نوآبادیات کے درجے پر زور دینے میں اصل مصلحت یہی تھی۔ ایک بار ایک مشہور اعتدال پسند لیڈر مجھ سے اس بات پر خفا ہوگئے کہ میں نے برطانوی حکومت سے معاملہ کرنے کے لئے یہ لازمی شرط قرار دی کہ برطانوی فوج ہندوستان سے فوراً ہٹالی جائے اور ہندوستانی فوج جمہور ہند کی نگرانی میں دے دی جائے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خود برطانوی حکومت بھی اسے منظور کرلے تب بھی میں اس کی انتہائی مخالفت کروں گا۔ وہ قومی آزادی کی اس لازمی شرط کے مخالف کچھ اس وجہ سے نہیں تھے کہ موجودہ حالات میں اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ بلکہ وہ سرے سے اسے ناپسند کرتے تھے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ انہیں بیرونی حملے کا خوف تھا اور وہ چاہتے تھے کہ برطانوی فوج ہماری حفاظت کے لئے موجود رہے۔ قطع نظر اس بحث کے کہ بیرونی حملے کا امکان ہے یا نہیں، یہ بات بجائے خود ہر غیرتمند ہندوستانی کے لئے باعث شرم ہے کہ اپنی حفاظت کی درخواست دوسروں سے کی جائے۔ مگر میرے خیال میں ہندوستان میں برطانوی قوت قائم رکھنے کی خواہش بیرونی حملے کے خوف پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت اس وجہ سے محسوس کی جاتی ہے کہ وہ مستقل حقوق کے مالکوں کو خود ہندوستانیوں سے یعنی خالص جمہوریت سے اور عام لوگوں کے غلبے سے بچائے۔

غرض گول میز کانفرنس کے ہندوستانی نمائندے یعنی نہ صرف وہ لوگ جو کھلے ہوئے رجعت پسند اور فرقہ پرست تھے بلکہ وہ بھی جو اپنے آپ کو ترقی پسند اور قوم پرست کہتے تھے، برطانوی حکومت کے ساتھ بہت سی مشترک اغراض رکھتے تھے۔"10

پنڈت جی نے گول میز کانفرنس میں شامل مسلم زعماء پر فرقہ پرست، دشمن وطن اور رجعت پسند ہونے کی پھبتی ہی نہیں کسی بلکہ نہایت بے حجابی سے مسلم قومیت کا بھی جی بھر کے مذاق اڑایا۔ چنانچہ لکھا۔

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف

ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد بھی ہو تا تو بھی حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔"[11]

پنڈت جی پکے اشتراکی اور سوشلسٹ ہونے کے علاوہ مذہب اسلام کے سخت خلاف تھے چنانچہ مزید لکھتے ہیں۔

"میں نے اسلامی تمدن کا مطلب سمجھنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔۔۔ہاں مسلم قوم اور مسلم تمدن کیا ہو گا؟ کیا یہ آئندہ صرف شمالی ہند میں سرکار دولتمدار برطانیہ کے زیر سایہ پھلے پھولے گا؟"[12]

یہ تھی وہ فضا جس میں گول میز کانفرنس کا اختتام ہوا جس کے بعد کانگرسی لیڈروں کی سب امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ کانفرنس کی بحث و تمحیص کی روشنی میں وزیر اعظم برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ(Communal Award) شائع کر دیا اور پھر ملک میں انڈیا ایکٹ1935ء کے نفاذ کی تیاریاں زور وشور سے شروع ہو گئیں۔ یہاں بھارت کے مشہور مورخ جناب کے۔ آر بمبوال ایم اے (K.R. Bombwall) کے قلم سے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، برطانوی حکومت کے قرطاس ابیض اور انڈیا ایکٹ کے نفاذ کا اجمالی ذکر مناسب ہو گا۔ فرماتے ہیں:

Third Round Table Conference:

The last and truncated session of the Round Table of the Conference opened in November, 1932, and concluded a few days before the year closed. The Labour party had withdrawn its co-operation from the Conference. As a result, its last session was held under the complete domination of reactionary elements and India was represented by ultra loyalistsonly. The Conference was concerned with reaffirming the decisions already arrived at in regard to the outlines of the new constitution and filling in some of the details.

In March.1933, the British Government published the white paper embodying, in the main, the conclusions reached in the Round Table Conference but with significant changes designed to meet Conservative criticism. The proposals in the White Paper were "so reactionary as to be utterly unacceptable to any section of progressive India opinion. "The document was described by Srinivasa Sastri as" hideous, grinning anthropoid." The White Paper scheme was examined by a joint select Committee of the two Houses of Parliament. In its report, the Committee generally endorsed the proposals embodied in the White Paper. A few modifications introduced by it only made the scheme worse. For instance, the Committee recommended indirect elections to the Federal Assembly as against the direct representation originally proposed. The constitutional scheme, as it emerged from the Joint Parliamentary Committee was communalism run riot and retrogression in the name of reform. This scheme took the form of Government of India Act of 1935 which Parliament in August 1935."[13]

موصوف نے اپنی کتاب کے صفحہ 249-250 میں انڈیا ایکٹ کی روشنی میں حق رائے دہی اور انتخابی عمل کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ جس سے صاف پتہ چل سکتا ہے کہ گول میز کانفرنس کے مسلم نمائندگان کی کامیاب نمائندگی نے آل انڈیا کانگرس کی مسلم امہ کے متعلق خوفناک سکیم کو پیوند خاک کر دیا اور وہ برسر اقتدار برطانوی حکومت کے چوٹی کے سیاسی لیڈروں کو مسلم حقوق سے دستکش ہونے یا زیر بحث نہ لانے میں سراسر ناکام ونامراد ہوگئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"The act of 1935 made some improvement on the Act of 1919 by lowering the property and literary qualifications for franchise. As a result, 35 million persons including more

than 6 million women received the vote. While the Montford Reforms had enfranchised only 3 percent of the total population, the Act of 1935 gave the vote to 14 per cent of the total population or 27 per cent of the total adult population."

آل انڈیا نیشنل کانگرس اور احرار نے متفقہ سازش کر کے ملک کا تختہ الٹنے اور مکمل آزادی کا جو مطالبہ امن شکنی کی صورت میں کرر کھا تھا، وہ بھی ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا اور انڈیا ایکٹ میں ہوم گورنمنٹ کے قیام سے عملاً تحریک پاکستان کی راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ بھارتی ودان کتاب کے صفحہ 250 پر لکھتے ہیں:

Franchise and Electorate

"Under the Act of 1935, as under the Montford Reforms, the electoral system of India was based on the principle of "communities, classes and interests". To the existing separate communal and class electorates, special electorates for Labour and Women were added for the first time. The system of weightage in representation also continued. Thus, Muslims received 13 per cent seats in Madras and 27 percent in U.P. as against 7.1 percent and 14.8 percent of population respectively. Europeans were particularly favoured. With a population under: 1/35th of one percent, they were given 3 percent seats in the provincial Legislation.

Home Government

The Act of 1935 made only a few formal changes in the Home Government. No explicit mention was made of the Secretary of State's power of superintendence, direction and control" over the administration of India. This power

was now vested in the Crown. The change, however, was nominal. Although the Crown came into the foreground, its power continued to be used in practice by the Secretary of State. He exercised supervision and control on the Governor General and the Governors when they acted in their discretion or exercised their individual judgment. The Act abolished the India Council and provided the Secretary of State with not less than 3 and not more than 6 Advisers of whom atleast one-half must have served in India for not less than ten years and should not have ceased to work there more than two year before appointment. The Advisers were appointed for five years and received a salary of $.1,350 a year with 600 extra for those of Indian domicile. This expenditure was to be provided for by the British Parliament and was not to be charged on Indian revenues. The Advisers could be consulted by the Secretary of State individually or collectively but he was not bound to accept their advice."

انڈیاایکٹ1935ء کے نفاذ سے قبل مطالبہ ءاقلیت

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی سفارشات کی روشنی میں برطانوی حکومت نے انڈیاایکٹ تیار کرلیاتا کہ اس کے مطابق ملکی انتخابات کروائے جاسکیں لیکن عین اس وقت جبکہ انڈیاایکٹ کے نفاذ میں صرف چندماہ باقی رہ گئے، آل انڈیاکانگرس کے مسلم دشمن رہنماؤں نے ہندوجاتی کی تعداد کوبڑھانے اور مسلم اقلیت کومزید کمزور کرنے کے لئے یہ شرمناک دوغلی پالیسی اختیار کرلی کہ ایک طرف گاندھی جی نے بڑودا جیل میں مرن برت رکھتے ہوئے اعلان کیاکہ کانگرس ہرحال میں اچھوتوں کوہندوشمار کرتی ہے۔ لہٰذا برطانوی سیاستدان اچھوتوں کوجداگانہ نیابت دے کر ہندوقوم کوٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں جو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اور دوسری طرف انڈیاکے مسلمانوں کی تعداد میں کمی کرنے کے لئے اپنے زرخرید اور ایجنٹ ملّاؤں کے ذریعہ یہ مطالبہ کرادیاکہ احمدیوں کومسلمانوں سے الگ تسلیم کر

کے انہیں سرکاری طور پر غیر مسلم قرار دیا جائے۔ یہ اقدام مظلوم مسلمانوں کے سیاسی اور ملّی جسم میں خنجر گھونپنے کے مترادف تھا۔

احرار کانفرنس1934ء

یہ مطالبہ احرار کانفرنس کے آخری اجلاس منعقدہ23اکتوبر1934ء کو بذریعہ قرارداد کیا گیا جو مولوی ظفر علی خاں[14] نے پیش کی۔ یہ وہی صاحب تھے جو تحریک خلافت کے زمانہ سے گاندھی، نہرو اور دوسرے متعصب ہندو لیڈروں کے غلام بے دام بن گئے تھے۔ وہ اس معاملہ میں اس قدر غالی تھے کہ انہوں نے23جولائی1921ء کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں یہاں تک کہہ ڈالا "ہندوؤں نے اور مہاتما گاندھی نے مسلمانوں پر احسان کئے ہیں۔ ان کا عوض ہم نہیں دے سکتے۔ ہمارے پاس زر نہیں ہے۔ جب چاہیں ہم حاضر ہیں۔"[15]

مولوی ظفر علی خاں کے عقیدت منداُن کے منظوم کلام کو "شعری الہامات" سے بھی تعبیر کر تے ہیں۔ گاندھی کی شان میں اُن کے چند "تاریخ ساز" اشعار ملاحظہ ہوں۔

"گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا
سر رکھ دیا رضائے خدا کی حریم پر
خنجر کو پھر حوالہ شیطان کر دیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر
سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا
پروردگار نے کہ ہے وہ منزلت شناس
گاندھی کو بھی یہ مرتبہ پہچان کر دیا"[16]

مولوی صاحب معاندین احمدیت کی صف اوّل میں شمار ہوتے تھے اور انہیں سفیر کانگرس ہونے پر بے حد فخر تھا جس کا کسی قدر اندازہ اُن کے درج ذیل اشعار سے بخوبی لگ سکتا ہے۔

قادیاں مرزا براندام مرے نام سے

کہ میں ویران یہ عمارت بھی کیا کرتا ہوں

کیا تعجب کہ احرار بھی گرما جائیں

کہ میں پیدا یہ حرارت بھی کیا کرتا ہوں

ہندوؤں کومیں ملاتا ہوں مسلمانوں سے

کانگرس کی میں سفارت بھی کیا کرتا ہوں[17]

مولوی ظفر علی ایڈیٹر زمیندار گاندھی،نہرو، مالوی جی اور دوسرے متعصب ہندوؤں کے ارادت مند تھے۔ یہ شعر انہی کا ہے۔

جومولوی نہ ملے گا تومالوی ہی سہی

خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

پنڈت نہرو جی کے سفر یورپ کے بعد انہوں نے فرمایا۔

جس آزادی کی تلقین آج ہوتی ہے بنارس میں

کبھی یہ کان سنتے تھے مدینہ سے پیام اس کا

مولانا عبدالمجید سالک نے اپنے روزنامہ انقلاب 27 جنوری 1928ء میں ”افکار وحوادث“ کے مشہور کالم میں اس پر زبردست تنقید کرتے ہوئے لکھا:-

”شعر بالکل صاف ہے اور اس کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ مدینہ منورہ سے آزادی کا پیام ملا کرتا تھا۔ آج اسی آزادی کی تلقین بنارس سے ہورہی تھی۔ گویاجوپیغام آج سے ساڑھے تیرہ سوسال پیشتر حضور رسالت مآب ﷺ نے دیا تھاوہی آج بنارس میں پنڈت مالوی جی مہاراج دے رہے ہیں۔ شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ والا پیام تواب کانوں تک نہیں پہنچتا لیکن بنارس کی تلقین آج بھی زندہ وقائم موجود ہے۔ نعوذ باللہ منھا۔اس شعر میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا گیاہے۔ توہین واضح ہے۔ہم شاعر صاحب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ بنارس کے ساتھ

تعلقات اچھے رکھیں۔ خواجہ مالوی جی کے بھگت بنیں۔ لیکن خدارا جوش عقیدت
یاہنگامہ آرائی میں ایسے الفاظ کے استعمال سے بچیں جن سے صراحتاً اسلام کی توہین
ٹپکتی ہے۔"[18]

فروری1928ء کا واقعہ ہے کہ مولوی ظفر علی خاں نے سکھ تبلیغ کانفرنس میں وعظ کیا کہ "ایک غلام ملک میں کوئی تبلیغ نہیں ہو سکتی۔"

یہ فقرہ آنحضرت ﷺ کے مکی دور کی تمام سرگرمیوں پر ایک شرمناک حملہ تھا جس پر اخبار انقلاب نے 26فروری1928ء کو "کیا تبلیغ اسلام روک دی جائے۔ ایک نیا فتنہ" کے زیر عنوان پُرزور اداریہ لکھا جس میں16فروری1928ء کے اخبار "زمیندار" سے کانفرنس کی روداد کے تعلق میں مولوی صاحب کے اس فقرہ کو خاص طور پر نقل کیا کہ "تبلیغ کے لئے فضا ساز گار ہونی چاہیے۔ تبلیغ جنگ کی حالت میں نہیں ہو سکتی اس کے لئے صلح درکار ہے۔" انقلاب نے مسلم زعماء سے پوچھا کہ کیا قادیانی اور لاہوری احمدی اور دوسری جماعتیں جو تبلیغ اسلام کا کام کر رہی ہیں "کیا یہ تمام ادارے اور نظام فضول تھے اور فضول ہیں۔ انہیں جلد بند کر دینا چاہیے۔ انقلاب نے اپنے اداریہ میں یہ بھی انکشاف کیا کہ مولوی ظفر علی خاں پنڈت جواہر لال نہرو جیسے دہریہ اور سوشلسٹ رہنما کے مشن ہی کی تکمیل کر رہے ہیں جن کے نزدیک "غلاموں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا"۔[19]

مولوی ظفر علی صاحب نے یہ لکھ کر نہرو گاندھی سے اپنے خفیہ گٹھ جوڑ کا پردہ چاک کر دیا کہ "اگر مسلمانوں کو نقصان پہنچنے پر آزادی حاصل ہو جائے تو میں مسلمانوں کے فوائد کو آزادی پر قربان کر دینے کو تیار ہوں۔"[20]

بالکل یہی ذہنیت انتہا پسند اور متعصب ہندولیڈروں اور ہندوپریس کی تھی۔ چنانچہ اخبار "پرتاپ" نے مورخہ 24ستمبر1930ء کالم3 میں لکھا۔

"ہندوستان میں اگر رہنا ہے تو ہندوستانی مسلمان بن کے رہنا پڑے گا۔ فرقہ
داری کی اجازت نہ کسی اور ملک میں دی گئی ہے نہ ہندوستان میں دی جاسکتی ہے۔ غلامی
منظور مگر فرقہ داری نامنظور۔"[21]

مسلمانان ہند کو مولوی ظفر علی خاں کے ہندو کانگرس کے درپردہ ایجنٹ ہونے کا پتہ چلا تو اُن کے خلاف قہر و غضب کی ایک زبردست لہر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بنگلور میں تو اُن کی تقریر کے دوران ہنگامہ ہو گیا۔ اگر وہ بھاگ نہ جاتے تو یقیناپٹ جاتے۔ اس ضمن میں بنگلور کے ایک نامہ نگار جناب محمد قاسم

خاں کی جو رپورٹ انقلاب 11 ستمبر 1931ء میں چھپی۔ اس کا ایک حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"شام کو محمد علی میدان میں مولانا نے مذہبی تقریر کی۔ دوران تقریر میں پہلو بدلتے ہوئے آپ نے کہا کہ اگر ہند کو آزادی ملے گی تو میں جھنڈا لے کے سب سے آگے ہوں گا اور میرے بعد مہاتما گاندھی اور پھر جواہر لال نہرو۔"

"جلسہ کے اختتام پر اعلان کیا گیا کہ شب کو محمد علی ہال میں ٹھیک ساڑھے نو بجے مولانا کا وعظ ہو گا.... مولانا نے وعظ میں مہاتما کی زبردست تعریفیں کیں جس پر فساد ہونے کا احتمال تھا لیکن خدا نے رحم کیا کہ مسلمانوں میں خونریزی ہوتے ہوتے رہ گئی۔"

اسی روز کانگرس کمیٹی کی طرف سے اشتہار کے ذریعہ اعلان کیا گیا کہ ڈیڑھ بجے محمد علی میدان میں مولانا کا انگریزی لیکچر ہو گا.... جلسے کے صدر رضوی صاحب تھے جو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کے خادم ہیں۔ جلسہ میں ہندو رضاکار بھی تھے۔ ایک ہندو نے کھڑے ہو کر ایڈریس پیش کیا جس کا جواب دینے کے لئے مولانا کھڑے ہی ہوئے تھے کہ چاروں طرف سے شوکت علی زندہ باد کے نعروں نے خاص کر مولانا اور ان کے ننگ قوم ہوا خواہوں کے ہوش اڑا دیئے۔

ہجوم میں سے ایک نوجوان موسوم بہ محمد یعقوب صدر سے اجازت لے کر اسٹیج پر جا کر کھڑا ہوا اور مجمع کو مخاطب کر کے کہا کہ حضرات ذرا خاموش ہو جایئے! میں مولانا کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جب سامعین کچھ خاموش ہو گئے۔ صاحب موصوف نے دلی جوش ضبط کرتے ہوئے نہایت مؤثر پیرائے میں تقریر شروع کی اور مولانا کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ مولانا! آپ کی توہین منظور نہیں۔ ہمارے دل آپ کی خدماتِ ملی کی قدر کرتے ہیں۔ آپ نے فارسی اور اردو کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور آپ ہی نے مسلمانان ہند میں پہلے پہل بیداری کی روح پھونکی تھی۔ اس کا شکریہ، لیکن آج کل جو روش آپ نے اختیار کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے ناکارہ اور ناقابل برداشت ہے۔ مولانا آپ کو کیا ہو گیا ہے جو آپ 8 کروڑ غریب مسلمانوں کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر 32 کروڑ دولت مند ہندوؤں کا ساتھ دے رہے ہیں اور ہم کو بھی ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے کی ترغیب دلا رہے ہیں؟ مولانا

آپ ہم کو کیوں ہندوؤں کا غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جنہوں نے کانپور، مرزاپور، بنارس، آگرہ وغیرہ مقامات میں خدا کے گھر کی توہین کی،کلام پاک کو جلایا، مسلمان بھائیوں کے خون کی ندیاں بہا دیں اور عصمت مآب بہنوں کی درندوں کی طرح عصمت دری کی۔ معذور بوڑھوں کو لاٹھیوں سے مار مار کر ٹھنڈا کر دیا اور شیر خوار بچوں کو جانوروں کی طرح چھروں سے حلال کر دیا۔ آخر ان کو مارنے کے بعد لوٹ بھی لیا اور ان کے گھروں کو بھی آگ لگا دی۔ آہ افسوس صد ہزار افسوس۔

مولانا کے پٹ جانے کا اندیشہ

یہاں تک تقریر ہونے پائی تھی کہ عوام بے صبر ہو گئے اور جلسے میں حد درجے کا جوش اور بدنظمی پیدا ہو گئی۔ چاروں طرف سے ”کانگرس برباد، مخلوطی ظفر علی مردہ باد“ کے نعروں نے ضمیر فروش خود غرضوں کو خوفزدہ کر دیا اور ہر طرف سے مولانا پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی.... ہر ایک مسلمان پر غیظ وغضب میں ایک دیوانگی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اگر مولانا اپنے ضمیر فروش ہوا خواہوں کے ساتھ چلے نہ جاتے تو خدا جانے ان کی اور ان کا ساتھ دینے والوں کی کیا گت بنتی۔“22

فخر ملّت حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب کی اسلامی خدمات آل انڈیا نیشنل کانگرس اور ان کے احراری ایجنٹوں کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھیں۔ اس لئے انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں آپ کے خطبہ صدارت کے موقع پر شرمناک غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ احرار کانفرنس میں آپ کے خلاف بھی قرارداد پیش کی گئی کہ انہیں مسلم نمائندہ کی حیثیت سے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نہ بنایا جائے۔ یہ قرارداد ابوالکلام آزاد صاحب کے کانگریسی دوست اور سوشلسٹ انقلابی مولوی حسین احمد مدنی دیوبندی نے پیش کی۔23

ان دونوں قراردادوں سے احرار کی تبلیغ کانفرنس کے کانگریسی مقاصد پبلک کے سامنے پہلی بار کُھل کر سامنے آگئے۔ اور ثابت ہو گیا کہ اس خالص سیاسی اجتماع کو ”تبلیغ کانفرنس“ سے موسوم کرنا محض ڈھونگ تھا جس کے پیچھے صرف پنڈت جواہر لال نہرو اور آل انڈیا نیشنل کانگرس کے انتہاپسند اور سوشلسٹ ہندو ممبروں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کارفرما تھی۔ جو ”رام راج“ کے قیام کے راستے میں

جماعت احمدیہ کو سب سے بڑی روک اور سدِّراہ یقین کرتے تھے۔ اس لئے ان کا قطعی فیصلہ تھا کہ احمدیوں کو جلد جلد دوسرے مسلم معاشرے سے کاٹ پھینکنا ضروری ہے تا مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ بے جان ہو کر رہ جائے اور انگریز پر واضح ہو جائے کہ ملک بھر کی واحد پارٹی صرف آل انڈیا نیشنل کانگرس ہے جسے انگریزوں کو اپنا اقتدار سونپ کر ملک چھوڑ دینا ہو گا۔

سر اقبال جیسے سوشلسٹ اور انقلابی شاعر جو صرف اشارہ کے منتظر تھے، یکایک جماعت احمدیہ کے خلاف میدان میں کود پڑے اور احراری مطالبہ کی تائید میں پُر زور مضامین لکھے اور ساتھ ہی اپنے گہرے سوشلسٹ دوست پنڈت نہرو کو بذریعہ مکتوب لکھا کہ احمدی ہندوستان اور اسلام دونوں کے مخالف اور غدار ہیں۔ یہ بالواسطہ طور پر اُن کی مخالف احمدیت ایجی ٹیشن کو زبردست خراج تحسین تھی جس سے انہیں مزید جرات دلانا مقصود تھا کہ آپ اپنی سکیم زور و شور سے جاری رکھیں۔ ہم دل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذو معنی فقرہ کے صاف معنی یہ تھے کہ سوشلزم اسلام ہی کا دوسرا نام ہے مگر احمدی اسے گوارا نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے کانگرسی تصور کے خلاف نبرد آزما ہیں اس لئے وہ ملک کے بھی غدار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی وفات کے بعد 1944ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے جو قرارداد عبد الحامد بدایوانی کی طرف سے پیش کی گئی وہ ردّی کی ٹوکری میں ڈال دی تو احراری لیڈروں کی قائداعظم کے خلاف آتش بغض و عناد شعلے بن کر بھڑک اٹھی اور انھوں نے مسلمانان ہندوستان کو تحریک پاکستان سے برگشتہ کرنے کے لئے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ جناح صاحب قادیانیوں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ [24]

اقبال اور قائداعظم کا بنیادی اختلاف

قائداعظم کے دستِ راست، تحریکِ پاکستان کے صف اوّل کے رہنما اور چوٹی کے سیاستدان جناب غلام مرتضیٰ (جی۔ایم۔سید) قائد اعظم کے قوم پرست خیالات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "وہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کے حامی تھے۔ مذہب کو افراد کے ذاتی عقیدے سے متعلق سمجھتے تھے.... اس کا ثبوت پاکستان بننے کے بعد اُن کی آئین ساز اسمبلی میں کی ہوئی پہلی تقریر سے ملتا ہے۔ اس کے خاص حصے نیچے دیئے جاتے

ہیں.... آپ اس حکومت میں آزاد ہیں۔ اپنے مندروں اور مسجدوں میں جاؤ۔ آپ کے مذہب یا فرقے کا ملک کے کاروبار سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔"[25]

"غور سے دیکھا جائے تو علامہ صاحب متضاد خیالات، عقائد اور نظریات کے مرکب تھے اور ان کا عمل سب سے جداگانہ تھا۔ ایک طرف قادیانی فرقہ کے مسلمانوں کے خلاف سخت مضامین لکھ کر تنگ نظری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک مقام پر متحد کرنا چاہتے تھے۔"[26]

آپ کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ جو عناصر "علاّمہ" کو حکیم الامت، شاعر مشرق وغیرہ القاب سے یاد کرتے، ان کے نام اکیڈیمیاں قائم کر کے اور کتابیں لکھ کر پاکستان بلکہ عالم اسلام میں تشہیر کر رہے ہیں، اُن کے پیچھے مخصوص سیاسی مقاصد ہیں۔ مثلاً عوام کے طبقہ اعلیٰ کے مفاد کی خاطر مذہب کے نام پر گمراہ کرنے کا مواد اسی طریق سے مہیا ہوتا ہے۔"[27]

جی ایم سید نے سیاست میں مذہب کو دخیل کرنے پر سر اقبال کی شدید مذمت کی جس کی تشبیہ یہودیوں کی مملکت اور کمیونسٹ ممالک سے دی ہے نیز لکھا:-

"ایک ہی وطن میں مذہب کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کا وجود ملکی سالمیت واستحکام کے خلاف تھا۔ یہ بین الاقوامی نظریہ کے اساس پر قائم ہوئی قوم تھی۔ اس پر مشکل حالات میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح کمیونسٹ ممالک نے آزادی فکر پر پابندی عائد کر کے عقائد و نظریات پر پہرے بٹھادیئے۔"[28]

حواشی:

[1] "علامہ اقبال کا خطبہ صدارت اجلاس مسلم لیگ الہ آباد 1930ء" صفحہ 13-15 شائع کردہ حکومت مغربی پاکستان۔

[2] خطبہ صدارت صفحہ 2۔

[3] "زندہ رود" جلد سوم صفحہ 385 تا 387۔

[4] مطبوعہ پاکستان ٹائمز 7 مئی 1967ء بحوالہ زندہ رود جلد سوم صفحہ 389۔ 682 از جسٹس جاوید اقبال ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت اول 1984ء۔

[5] اقبال۔ جادو گر ہندی نژاد صفحہ 131 مولفہ عتیق صدیقی ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع اوّل اگست 1980ء۔

[6] تحدیث نعمت طبع دوم صفحہ 294۔295۔

[7] Famous letters and speeches edited by L.F. Rush Brook Williams quondam fellow of all souls colleague p:551-552.

8 میری کہانی حصہ اوّل صفحہ 397-399 ناشر مکتبہ جامعہ اشاعت 1936۔
9 ایضاً صفحہ 20 تا 22۔
10 ایضاً صفحہ 398-399۔
11 "میری کہانی" حصہ دوم صفحہ 332۔
12 "میری کہانی" حصہ دوم صفحہ 334،336،337۔
13 Indian Politics and Government
14 روزنامہ زمیندار لاہور 24 اکتوبر 1934ء کاروان احرار جلد دوم صفحہ 57-58 از جانباز مرزا۔ ناشر مکتبہ تبصرہ لاہور۔ دسمبر 1984ء۔
15 تقاریر مولانا ظفر علی صفحہ 61۔
16 "مولانا ظفر علی خاں" صفحہ 566-567۔
17 "مولانا ظفر علی خاں" صفحہ 271 تالیف پروفیسر ڈاکٹر غلام حسنین۔ ناشر سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ سال اشاعت 1993ء۔
18 افکار و حوادث جلد دوم صفحہ 43-44۔ مرتب محمد حمزہ صاحب فاروقی۔ ناشر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔
19 "افکار حوادث" جلد دوم صفحہ 512 تا 516۔
20 زمیندار لاہور 16 ستمبر 1928ء۔ ("افکار و حوادث" جلد دوم صفحہ 410)۔
21 بحوالہ روزنامہ انقلاب 26 ستمبر 1930ء (بحوالہ "افکار و حوادث" از مولانا عبدالمجید سالک صفحہ 184-185 ناشر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔ اشاعت 1991ء۔
22 "افکار و حوادث" جلد دوم صفحہ 448 تا 454۔
23 کاروان احرار جلد دوم صفحہ 57-58۔
24 تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک صفحہ 244 از چوہدری غلام نبی۔ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور طبع دوم جون 1992ء۔
25 جدید سیاست کے نورتن صفحہ 26-27 (مترجم خادم حسین سومرو) ناشر کلاسیک چوک ریگل دی مال لاہور طبع اول دسمبر 1993ء۔
26 ایضاً صفحہ 110۔
27 ایضاً صفحہ 110-111۔
28 ایضاً صفحہ 107-108۔

بیسویں فصل

اشتراکی روس کے ایجنٹ ملّاؤں کے ذریعہ طوفانِ ارتداد

جہاں برٹش انڈیا میں ابوالکلام آزاد، اقبال اور احرار معصوم مسلمانوں کو سوشلزم کا پرستار بنانے میں سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے وہاں ملّا نور وحیدوف' ملّا سلطان اور دیگر بہت سے دنیا پرست ملّا رُوسی ایجنٹ بن کر بالشویک روس کے مسلمانوں کو مرتد کر رہے تھے۔ یہی وہ دشمنانِ اسلام تھے جنہوں نے سوشلزم کے عین اسلام ہونے کا وسیع پیمانے پر پراپیگنڈا کیا اور ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح اختراع کی۔[1]

چنانچہ کتاب ''روس میں مسلمان قومیں'' کے مؤلف جناب آباد شاہ پوری رقمطراز ہیں:

''بالآخر وہ مناسب وقت آ پہنچا۔ ترکستان کا اسلامی معاشرہ اور اس کی تہذیبی وتمدنی عمارت منہدم کرنے کیلئے متواتر کئی برس سے جو بارود بچھایا جارہا تھا، اس کو آگ لگ چکی تھی۔ اور پھر اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی جو صدیوں سے طوفان اور آندھیوں کا مقابلہ کرتی چلی آرہی تھی۔ ہر طرف افتراق وانتشار برپا ہوگیا۔ فکری ونظریاتی بغاوت نے یقین وایمان کی دنیا تہہ وبالا کر دی اور لوگ اپنے ارتداد کا اعلان کھلے عام کرنے لگے۔ ان میں وہ لوگ پیش پیش تھے جو دینِ متین کے علمبردار، تعلیماتِ اسلامی کے حامل اور دعوتِ دیں کے داعی تھے، جن کا منصب حق وباطل کی کشمکش میں مسلمانوں کی رہنمائی تھی۔ ترکِ اسلام کے اعلانات اشتراکی پریس میں جلی سُرخیوں میں شائع ہورہے تھے۔ ایک عالم نے اپنے اعلانِ ارتداد میں کہا:

''میں علماء اور جاگیرداروں کا فریب خوردہ ہوں۔ میرا نام بابوعابد شریف ہے، میں غازی آباد کی مسجد میں سالہا سال تک اپنے شب گرفتہ محنت کش کسانوں کے دماغ میں خرافات ٹھونستا رہا ہوں۔ اب مجھ پر صداقت آشکار ہوئی ہے۔ امیر علماء کے بیانات پڑھ کر میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ قرآن وحدیث کو یہ لوگ اپنے معاشی مفادات کے لئے استعمال کرتے تھے۔ میں تمام لوگوں اور سوویٹ حکومت کے سامنے باضابطہ حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ اب میں اسلام کا خادم نہیں رہا۔' جس پر نہ تو میرا ایمان ہے نہ یقین، جو عوام کو محض فریب دینے کے لئے گھڑا گیا تھا۔''

علماء کا جب یہ حال تھا تو عام مسلمان کفر والحاد کے اس سیلاب کے آگے کب تک ثابت قدم رہتے۔ تھوڑی ہی مدّت گزری تھی کہ انفرادی ارتداد نے اجتماعی ارتداد کی شکل اختیار کر لی۔ سڈنی اور پیٹر زویب لکھتے ہیں:

"بہت سے علاقوں میں ملّاؤں کی بڑی تعداد نے اپنے مقتدیوں سمیت اسلام ترک کر دیا اور سوویٹ یونین کی سرپرستی میں الحاد و بے دینی کی تبلیغ واشاعت شروع کر دی۔"[2]

سوویٹ نظریاتی مجلہ "سیاسی خود تعلیمی" نے اکتوبر 1969ء کے شمارہ میں روسی ملّاؤں کی اسلام فروشی کا منظر ان الفاظ میں پیش کیا۔

"زیادہ زور اسلام کے اخلاقی احکامات پر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سوشلسٹ سوسائٹی میں انہی احکام پر عمل ہو رہا ہے.... کہا جا رہا ہے کہ آج محمد (ﷺ) کے افکار وخیالات پر ہی عمل ہو رہا ہے۔ انہوں نے ان افکار کا اعلان کیا اور کمیونسٹ اصولوں کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس وقت نوعِ بشر تکنیکی طور پر اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ اب وہ وقت دور نہیں جب سوویٹ عوام وہ فصل کاٹیں گے جو محمد (ﷺ) نے کاشت کی تھی۔ ملّا یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص کمیونزم کی تکمیل کے مقدس فریضے میں شامل ہو کر رضائے الٰہی کو عملی جامہ پہنائے گا وہ جنت میں جائے گا۔"[3]

جناب آباد شاہ پوری صاحب اپنی دوسری کتاب "تُرکستان میں مسلم مزاحمت"[4] کے صفحہ 120 پر رقم طراز ہیں:

"کمیونسٹ فکری وذہنی انتشار اور افراتفری پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ اس کے بغیر وہ کسی سوسائٹی پر کاری ضرب نہیں لگا سکتے۔ جب بھی وہ کسی معاشرے اور ملک کو اپنے چنگل میں گرفتار کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں، سب سے پہلے اس میں ذہنی انتشار اور عملی افراتفری پیدا کرتے ہیں۔ یہاں انہیں مسلمانوں کی حد تک یہ زحمت بھی نہ اٹھانی پڑی۔ انہوں نے انکے اندر قوّتِ فیصلہ سے بہرہ مند، بابصیرت اور متفق علیہ قیادت کے فقدان اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار اور صفوں میں ابتری دونوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ مسلمانوں کی قوت سے پوری طرح باخبر تھے اور جانتے تھے

کہ اگر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو خانہ جنگی بھی طویل ہو جائے گی اور اس سے پیدا ہونے والی ابتری میں انہیں آزادی کا موقع مل جائے گا۔ پھر وہ جس کے ساتھ مل گئے تاریخ کا فیصلہ اس کے پلڑے میں ہو گا۔ انہیں اپنے ساتھ ملا کر قازان سے ترکستان تک ایک ایسی مضبوط حامی قوت مل سکتی تھی جس کے سہارے وہ ان علاقوں میں اپنے آپ کو مستحکم کر سکتے تھے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے اپریل 1917ء کی ساتویں سوشل ڈیموکریٹک کانگرس میں ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں قومیتوں کے حقِ خود ارادیت بلکہ اپنی قسمت آپ منتخب کرنے اور رُوس سے الگ ہو جانے تک کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ تاہم اس وقت حالات اتنے پیچیدہ تھے اور افراتفری، ہنگاموں اور انتشار کا کچھ ایسا عالم تھا کہ یہ آواز اس میں ڈوب کر رہ گئی تھی اور صرف چند لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکی تھی۔ اب پیٹروگراڈ پر بالشویکوں (کمیونسٹوں) نے قبضہ کیا تو اس قرارداد کو باضابطہ سرکاری اعلان کی صورت دے دی۔ اعلان کے الفاظ بڑے دلکش تھے۔ زار شاہی عہد میں مسلمانوں کے دین اور تہذیب و ثقافت اور ان کی مسجدوں کو جس طرح پامال کیا گیا تھا اس کی مذمّت کی گئی تھی۔ زاروں کو غاصب قرار دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ آج سے ان کے دین و ایمان، انکی روایات، ان کے قومی و ثقافتی اداروں کی آزادی اور حرمت کا تحفظ کیا جائے گا۔ وہ پوری آزادی سے اپنی قومی زندگی تعمیر کر سکیں گے۔ انہیں یہ اختیار ہو گا کہ وہ چاہیں تو سوویٹ یونین کے اندر رہیں یا اس سے بالکل آزاد ہو کر اپنی ریاستیں قائم کر لیں۔ اپنے اخلاص کا مظاہرہ کرنے اور حلقۂ دام تزویر کرنے کے لئے اس اعلان کے کچھ روز بعد کمیونسٹوں نے حضرت عثمانؓ کا نسخہء قرآن جو مبیّنہ طور پر پیٹروگراڈ نیشنل لائبریری میں محفوظ تھا مسلمانوں کو دے دیا۔ اگلے مہینے قازان کا ایک تاریخی مینار بھی مسلمانوں کے حوالہ کر دیا۔

اس اعلان اور اقدامات نے دہرا کام کیا۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے اندر پہلے سے پھیلے ہوئے انتشار و افتراق میں اضافہ کر دیا۔ اب تک مسلمان سیاسی اعتبار سے تین گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ روس کی وفاقی ریاست کے اندر داخلی یا علاقائی خود مختاری کا حامی تھا۔ دوسرا وحدانیت پسند تھا اس کے خیال میں وفاقی ریاست مسلمانوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کی راہ میں حائل ہو سکتی تھی۔ ان دونوں گروہوں

کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر ایک تھا یعنی وہ روسی ریاست کے اندر رہنا چاہتے تھے۔ محض زبانی نہیں، تحریری معاہدوں کے ذریعے۔ تیسرا گروہ مکمل آزادی کا علمبردار تھا۔ اب چوتھا گروہ بھی پیدا ہو گیا جو ان اعلانات پر اعتبار کر کے کسی قسم کے مذاکرات اور معاہدے کے بغیر بالشویک حکومت کی حمایت کر رہا تھا۔ قبل ازیں مسلمانوں کے حامی بہت کم اور بڑی حد تک بے مایہ تھے۔ اب اس نئے عنصر کی بدولت بالشویکوں کو مسلمانوں کے اندر قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ یہ عنصر علماء جمعیتی (جمعیت علماء) پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ پہلے روسیوں کے دائیں بازو کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ لیکن اب بالشویکوں کے بچھائے ہوئے دام پر کچھ ایسے لٹو ہو گئے تھے کہ پیشگی ضمانت حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے اور شیر علی لاپن کی سربراہی میں نئی حکومت سے تعاون کی دعوت دینے لگے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلمان ان کی پالیسی اجتماعی طور پر اپنالیں۔ نومبر 1917ء میں وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی تیسری کانفرنس ہوئی۔ اس میں جمعیت علماء کے لیڈر غالب تھے۔ انہوں نے دباؤ بھی ڈالا، تاہم کانفرنس نے نئی اتھارٹی کے خلاف معاندانہ پوزیشن اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جمعیتی الگ ہو گئے۔ مسلمانوں کے باقی تمام سیاسی گروہ مسلم کونسل کے پرچم کے تلے جمع ہو گئے۔

یہ گویا روسیوں اور مسلم وسط ایشیا کے درمیان بحران کا آغاز تھا۔ لاپن نے مخلوط حکومت بنانے اور قدامت پسندوں کو آدھی نشستیں دینے کا مطالبہ کیا۔ مسلم کونسل کے نمائندوں نے مقامی خود مختاری کی تجویز پیش کی۔ روسیوں نے ان مطالبات اور تجویزوں کو مسترد کر دیا۔ لاپن کی خوش گمانیوں کے محل بھی زمین پر آرہے تھے۔ روسیوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ انہیں ان کے مطالبات منظور نہیں، ''مقامی آبادی کا رویہ'' بالشویک حکومت کے بارے میں مشکوک ہے، اس میں کوئی پرولتاری تنظیم بھی نہیں کہ ہم اسے علاقائی حکومت کے بلند ترین شعبوں میں خوش آمدید کہیں۔ تاہم بالشویکوں کے اثرات گہرے بھی ہو چکے تھے اور نسبتاً وسیع بھی۔ اس میں وہ علماء جمعیتی کی جانب سے کسی بھی ردّعمل کا سامنا کر سکتے تھے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نرالی تحریک مسلمانوں میں اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس میں پیش پیش سادہ لوح، بے بصیرت اور لالچی ملّا تھے۔ وہ سوشلزم کو عین اسلام قرار

دے رہے تھے۔ "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح سب سے پہلے ایک داغستانی ملّا ترکوحاجی نے گھڑی۔ شیشان مسلمانوں میں ملّا سلطان، کبردینی ترکوں میں ملّا تخانوف اور دولگا کے تاتاریوں میں ملّا رسولوف اسلامی سوشلزم کا پرچم اٹھائے بالشویکوں کی حمایت کررہے تھے۔

آزادی کے چند سانس

مسلمانوں نے چھ سے آٹھ مہینے مذاکرات میں ضائع کر دیئے تھے۔ اب کہ حالات نے ایک نئی کروٹ لے کر ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ ہر جگہ خود مختاری کا اعلان کر رہے تھے۔ قازقستان نے جولائی 1917ء میں خود مختاری کا اعلان کیا۔ آذربائیجان نے ماورائے قفقاز کے ساتھ ستمبر 1917ء میں وفاقی جمہوریہ قائم کی۔ پھر نو مہینے بعد اختلافات کی بنا پر الگ ہو کر مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ نومبر 1917ء میں جمہوریہ کریمیا وجود میں آگئی۔ 11 دسمبر کو ترکستان نے آزادی کا اعلان کر دیا اور خوقند کو دار الحکومت قرار دیا۔ یہ وہ اقدام تھے جو انہیں فروری 1917ء میں زار شاہی کا تختہ الٹنے کے فوراً بعد الگ الگ نہیں (جیسا کہ اب انہوں نے کیا تھا) متحدہ طور پر کرنا چاہئے تھا۔ اس وقت روسی آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو اپنی نوزائیدہ ریاست کو مستحکم اور بیرونی دنیا سے روابط قائم کر کے اس کے تحفظ کا سامان کرنے کے لئے خاصا وقت مل جاتا۔ لیکن ٹکڑوں میں بٹے، انہوں نے وقت ہاتھ سے کھو دیا۔ اب کہ بالشویک فیصلہ کن قوت بن کر برسر اقتدار آگئے تھے اور ملک پر ان کی گرفت روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ مسلمان علاقوں کی طرف سے آزادی کے اعلانات ان کی دبی اور کچلی ہوئی آرزوئے آزادی کا اظہار تو ضرور تھے لیکن صحیح وقت کے ضیاع کے سائے ان ریاستوں پر پہلے ہی روز منڈلا رہے تھے۔ بالشویکوں نے آٹھ نو ماہ کے عرصے میں مسلمانوں میں ہر جگہ اپنا حامی عنصر پیدا کر لیا تھا جس میں مذہبی رہنما پیش پیش تھے۔ مسلمان علاقوں میں آباد روسی تو ہر حال میں پیٹرو گراڈ کے ساتھ تھے چاہے وہاں کوئی بھی حکمران ہوتا۔ چنانچہ ان دونوں عناصر نے اپنے ہتھکنڈوں سے کہیں بھی استحکام نہ ہونے دیا۔ اور پھر جب روسی فوجوں نے ایک بار پھر ان

ریاستوں کی آزادی کا چراغ گل کرنے کے لئے جارحیت شروع کی تو ان عناصر نے اندر سے نقب لگا کر ان کا ہاتھ بٹایا۔

اس جارحیت کا آغاز جنوری 1918ء سے قازقستان پر حملے سے ہوا۔ 20 مارچ تک سارا قازقستان روسیوں کے چنگل میں کراہ رہا تھا۔ ان ہی دنوں 12 جنوری کو سُرخ روسی فوجیں کریمیا پر حملہ آور ہوئیں اور دو دن کے بعد وہ بھی از سرِ نو غلام بن چکا تھا۔ ترکستان کی آزاد ریاست 14 فروری 1918ء کو ختم ہو گئی۔ مارچ 1918ء میں روسی قازان پر قابض ہو گئے۔ داغستان، شمالی قفقاز، اور باشکیر کی باری اگلے سال کے وسط میں آئی۔ آذربائیجان واحد ریاست تھی جو سوا دو برس زندہ رہی۔ جنوری 1920ء میں روسی فوجوں نے حملہ شروع کیا اور اپریل ختم ہوتے ہوتے یہ آخری ریاست بھی دم توڑ گئی۔ روسیوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو ان کے جذبہ آزادی کی سزا دی۔ لیکن سب سے زیادہ خونریزی خوقند میں کی جہاں انہوں نے قتلِ عام میں چودہ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر خوراک کے ذخائر ضبط کر کے اور غلّے کی درآمد روک کر ہولناک قحط پیدا کر دیا جس میں 25 سے 50 فیصد آبادی ہلاک ہو گئی۔ یہ قتلِ عام اس قدر وحشیانہ تھا کہ روسی رہنما بھی اس انسانی المیّے کے وقوع سے انکار نہ کر سکے....

چوپلان نے مغربی ترکستان کی غلامی کے بارے میں اپنے اشعار میں کہا تھا:

"ہنسنے والے دوسرے ہیں، رونے والا میں ہوں
کھیلنے والے دوسرے ہیں، کراہنے والا میں ہوں
آزادی کی داستان سننے والے دوسرے ہیں
غلامی کے گیت گانے والا میں ہوں
آزاد دوسرے لوگ ہیں، میں تو غلام ہوں
جس کو جانوروں کی قطار میں ہنکایا جا رہا ہے' وہ میں ہوں[5]

سٹالن ازم نے مشرقی ترکستان پر جابرانہ تسلط کے بعد کس طرح مسلمانوں کو آہنی چکی میں

پیسا؟ دل کو دہلا دینے اور خون کے آنسو رلا دینے والے اس سرخ انقلاب کی المناک داستان جناب عیسیٰ یوسف الپتیگن صاحب سابق جنرل سیکرٹری مشرقی ترکستان (47-1948ء) ممبر چینی پارلیمنٹ کے قلم سے درج ذیل کی جاتی ہے:-

"روسیوں نے ایک طرف چینی (مسلم) جنرل ماچنگ (ینگ) کو مغربی ترکستان میں پناہ لینے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرقی ترکستان کی اس قومی حکومت کے سامنے جو کاشغر میں قائم ہوئی تھی لیکن جس کا دار الحکومت اب ینی حصار منتقل ہو گیا تھا، بعض تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز میں ایک تجویز یہ تھی کہ خواجہ نیاز علیحدگی کے خیال سے باز آ جائیں اور قومی حکومت کو ختم کر کے مشرقی ترکستان کی صوبائی حکومت میں صدر کے معاون کا عہدہ قبول کر لیں۔ قومی حکومت کے فوجیوں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ جنرل محمود کی کمان میں کاشغر یار قند اور آق صو کے علاقوں میں آباد کر دیئے جائیں گے اور روس کی قابض فوجیں اور شن سی سای (Shen Shih Tsai) ان فوجیوں سے کچھ نہیں کہیں گے۔ ان تجاویز کو قبول نہ کرنے کی صورت میں یہ دھمکی دی گئی کہ روسی قومی حکومت کو طاقت استعمال کر کے ختم کر دیں گے اور ترکستان کے تمام قومی رہنماؤں کو گرفتار کر کے سزائے موت دیں گے۔

ترکستان کی حکومت کے پاس فوجی ساز وسامان نہ تھا اور تحریکِ آزادی کی حیثیت محض ایک مقامی احتجاج کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کو ابھی بین الاقوامی حیثیت بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ اس مجبوری کے تحت قومی حکومت کے صدر خواجہ حاجی نیاز نے روس کی پیش کردہ شرائط کو تسلیم کر لینا مناسب سمجھا۔ روسیوں کو خواجہ نیاز کی اس خواہش کا جیسے ہی علم ہوا وہ ان کو زبردستی ارومچی لے آئے اور نائب صدر کے عہدہ پر بٹھا دیا۔ جہاں تک جنرل شن سی سای کا تعلق تھا، اس کی حیثیت روسیوں کے تابع ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔

اس طرح مشرقی ترکستان میں روسی تسلط کے دور کا آغاز ہوا۔

حالات بہتر ہو جانے کے بعد روسیوں نے اپنی قابض فوجوں کو مشرقی ترکستان کے بیشتر حصے سے واپس بلا لیا لیکن قومول اور کاشغر میں اپنی فوجوں کو رہنے دیا کیونکہ یہ وہ مقامات تھے جہاں قومی مقاومت کی صلاحیت زیادہ تھی۔

1935ء اور 1937ء کے درمیان روسیوں نے مشیر، انجینئر، فنی ماہر، ڈاکٹر اور اساتذہ کی شکل میں تقریباً چار سو افراد کو مشرقی ترکستان بھیج دیا جن کی حیثیت روسی ایجنٹوں کی تھی۔ ان لوگوں کو فوجی، سول، اقتصادی، ثقافتی اور انتظامی عہدوں پر متعین کیا گیا اور اس طرح ان تمام محکموں اور شعبوں کا انتظام پوری طرح روسیوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ مشیروں کی شکل میں روس کے ان ایجنٹوں کا تقرر، شن کے ساتھ ایک خفیہ معاہدے کے تحت عمل میں آیا تھا جو پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔

جولائی 1935ء میں روس سے آنے والے خصوصی ماہروں نے سب سے پہلے مشرقی ترکستان میں روس کے نمونے پر سیاسی پولیس تشکیل کی۔ پیٹر فلیمنگ نے لکھا ہے:

"طاقتور پولیس اندرونی سیاست کی نگرانِ اعلیٰ تھی۔ یہ (G-P-U) کے نمونے پر تھی اور اسی کی طرح کسی بھی حاکم کے سامنے جواب دہ نہ تھی۔

اس پولیس کے تحت مشرقی ترکستان میں مقامی باشندوں کے خلاف جاسوسی کی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور ترکوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جانے لگے۔ ان طریقوں کا مقصد ایذارسانی کے ذریعے ان جرائم کا تعارف کروانا تھا جو ترکوں کے سر تھوپے جاتے تھے۔ ترکوں پر جھوٹے الزام لگائے جاتے تھے اور پھر ان کا اعتراف کرایا جاتا تھا۔ روسیوں نے ایذارسانی کے ایک سو پچیس اور قتل کرنے کے اٹھائیس مختلف طریقے ایجاد کئے تھے۔ ان میں سے چند یہ تھے۔

۱۔ خواتین کے اعضائے تناسل میں برقی قمقمے داخل کر کے ان میں بجلی کی رو چھوڑنا۔

۲۔ سروں اور پیروں کو الگ الگ رسیوں سے باندھنا اور ان رسیوں کو مخالف سمت میں کھینچنا۔

۳۔ جسم میں سوراخ کر کے اس میں گرہ دار رسی داخل کرنا اور دو دن بعد زخم بھر آنے پر اس رسی کو آری کی طرح چلانا۔

۴۔ فوجی تربیت کے دوران ترکوں کو نشانہ بازی کا ہدف بنانا۔

۵۔ کانوں کے اندر زہریلی گیس داخل کر کے ہلاک کرنا۔ التائی کے ہیرو

شریف خان تورہ کو اسی طرح ایک کان میں شہید کیا گیا۔

روسی ماہرین نے چینیوں کو ایذا رسانی کے ان طریقوں کی تربیت دینے کے لئے تربیتی نصاب بھی جاری کئے جن میں بتایا جاتا تھا کہ ایذا رسانی کے طریقوں کو کس طرح عمل میں لایا جائے۔ سیاسی پولیس کے دفتر میں کس طرح کام کیا جائے اور رازوں کو کس طرح چھپایا جائے اور جرائم کا اعتراف کس طرح کرایا جائے۔

اس مقصد کے لئے ہر ضلع میں کم از کم پانچ سو افراد کی گنجائش کے قید خانے بھی تعمیر کئے گئے۔

روسیوں نے مشرقی ترکستان میں قدم جمالینے کے بعد تطہیر کی مہم شروع کی۔ انہوں نے تین لاکھ افراد کو جن میں خواجہ نیاز بھی شامل تھے قید کر دیا۔ بعد میں ان میں سے کئی ہزار افراد کو شہید کر دیا۔ ان شہداء میں خواجہ نیاز بھی شامل تھے۔ باقی لوگوں کو قید خانوں میں ٹھونس کر غیر انسانی انداز میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ روسیوں نے اس زمانے میں جو مظالم کئے ان کی تفصیل کے لئے پوری ایک کتاب درکار ہے۔

روسیوں کے ان مظالم کے خلاف بطور ردّ عمل 1934ء اور 1937ء کے درمیان برقول میں، 1940ء میں التائی میں اور 1950ء میں پھر برقول میں بڑے پیمانے پر بغاوتیں ہوئیں۔ 1934ء اور 1951ء کے درمیان پاکستان اور ہندوستان کی طرف جو ہجرتیں ہوئیں، ان کا تفصیلی حال میں اپنی خود نوشت میں کروں گا۔ مختصر یہ کہ مغربی ترکستان کے مشہور شاعر چوپلان[6] نے جن روسی مظالم کا اپنے تند و ترش اشعار میں ذکر کیا ہے وہ سب مشرقی ترکستان میں ہوئے۔"

روضہء رسول ﷺ میں نقب زنی

حضرت علّامہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات 1642ء) اپنی شہرہ آفاق کتاب "جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب" میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ واقعہ 557ھ میں واقع ہوا۔ کہتے ہیں کہ سلطان نور الدین سیّد محمود بن زنگی کہ جمال الدین اصفہانی جس کا وزیر تھا۔ اس نے سرورِ انبیاء ﷺ کو تین دفعہ

خواب میں دیکھا۔ آپ دواشخاص جو وہاں کھڑے ہیں ان کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں کے شر سے خلاصی دے۔ سلطان نے فراست سے جان لیا کہ ہونہ ہو آج مدینہ منوّرہ میں کوئی امر غریب پیدا ہوا ہے جس کو پہنچنا چاہئے۔ سلطان اسی وقت آخر شب کو خفیہ طور پر اپنے بیس خواص اور بہت کچھ مال ومتاع ساتھ لے کر مدینہ طیّبہ کو روانہ ہو پڑا۔ سولہ دن کے عرصہ میں شام سے مدینہ تک پہنچ گیا۔ ان دوملعونوں کی کھوج میں آتے ہی لگ گیا۔ اس نے صدقات انعام واکرام کو ان کے حاضر ہونے کا وسیلہ بنایا اور حکم دیا کہ ہر خاص وعام اہل مدینہ میں سے اس سے انعام واکرام حاصل کریں مگر پھر بھی وہ دونا مطبوع اشکال دکھائی تک بھی سلطان کو نہ دیں جو بادشاہ نے خواب میں دیکھی تھیں۔ سلطان نے آخر کار یہ بھی پوچھا کہ آیا کوئی ایسا شخص بھی رہ گیا ہے کہ جس نے اس سے انعام واکرام حاصل نہ کیا ہو؟ لوگوں نے کہا رہا تو ایسا کوئی نہیں مگر دومغربی کہ نہایت صالح، سخی، جوّاد اور عفیف ہیں جو شب وروز اپنی جگہ پر عبادت کرتے رہتے ہیں اور کسی سے اختلاط نہیں رکھتے۔ اپنے حجرے سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ سلطان نے ان کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ حسبُ الحکم وہ لوگ لائے گئے۔ سلطان دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ وہی دو شخص ہیں جن کو سرورِ انبیاء ﷺ نے خواب میں دکھایا ہے۔ پوچھا تم کہاں رہتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ حجرہ شریف کے قریب ایک رباط میں۔ یہ مقام اب بھی روضہ مبارک کی غربی جانب واقع ہے اور ویران پڑی ہے۔ اس کی شباک دیوار مسجد میں رکھی ہے۔ سلطان انہیں وہیں چھوڑ کر اس مکان میں گھس گیا جس کا انہوں نے نشان دیا تھا۔ کہتے ہیں وہیں سلطان نے ایک قرآن پاک کو طاقچہ میں پڑا ہوا پایا۔ کچھ کتابیں وعظ ونصیحت کی کچھ مال ایک طرف ڈھیر لگا ہے جو فقرائے مدینہ پر صرف کیا کرتے تھے اور ان کی خواب گاہ پر ایک چٹائی پڑی ہے۔ سلطان شہید نے اس چٹائی کو اٹھایا تو ایک سرنگ حجرہ مبارک کی طرف کھدی ہوئی دیکھی اور ایک طرف کو ایک کنواں کھدا دیکھا جس میں سرنگ کی مٹی بھرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے پاس چمڑے کے دو تھیلے تھے جن میں مٹی بھر کر بقیع کے ارد گرد رات کو ڈال آتے تھے۔ سخت جھڑکیوں اور کافی سزا کے بعد انہوں نے بتلایا کہ وہ نصرانی ہیں اور نصاریٰ نے انہیں مغربی حجّاج کے لباس

میں کچھ مال دے کر بھیجا تھا کہ مدینہ طیّبہ کو پہنچ کر حجرہ شریفہ میں داخل ہو کر جسمِ اطہر حضرت سید کائنات ﷺ سے نعوذ باللہ گستاخی کریں۔ جب یہ نقب قبر شریف کے قریب پہنچی تھی کافی ابروبار، بجلی کی کڑک ودھماکہ اور زلزلہ عظیم پیدا ہوا تھا۔ اسی رات کی صبح کو سلطانِ سعید پہنچ گیا۔ یہ سن کر سلطان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی اور کافی وقت گریہ وزاری میں گزارا اور حجرہ شریف کی شباک کے نیچے ان ہر دوناپاکوں کی گردنیں مارڈالیں اور شام کے قریب انہیں جلادیا۔ اور حجرہ کے گرد ایک گہری خندق کھودی جو پانی تک پہنچ گئی اور سیسہ پگھلا کر اس میں بھر دیا تاکہ وجود شریف تک پھر کوئی بھی نہ پہنچ سکے۔"[7]

تاریخ اپنے تیئں دہراتی ہے۔ روضہ رسول ﷺ کی نقب زنی کا پہلا واقعہ ظاہری اعتبار سے ہوا اور بیسویں صدی میں آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی آخری عالمگیر شریعت میں سرنگ لگا کر اسے سوشلزم اور بابیت کے نظریاتی بارود سے اڑانے کا ناپاک منصوبہ بنایا گیا جیسا کہ آئندہ سطور میں واضح ہو جائے گا۔

مفسرِ قرآن کے بھیس میں تبلیغ بہائیت

1905ء میں جناب ابوالکلام آزاد صاحب غدر پارٹی میں شامل ہوئے اور ساتھ وہ الحاد کی تاریکیوں میں ڈوب کر اسلام بلکہ مذہب سے ہی یکسر برگشتہ ہوگئے۔ آزاد صاحب نے اپنی خودنوشت میں اسے انکار والحاد اور صدی کے برابر رات سے تعبیر کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ الحادوزندقہ کے اس دور کا آغاز سولہ سترہ برس کی عمر میں یعنی 1904ء۔1905ء میں ہوا جس کے نتیجے میں نہ صرف انہوں نے نمازیں ترک کر دیں بلکہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر وہ ہستی باری تعالیٰ اور اسلام کے دوسرے عقائد ہی سے یکسر منحرف ہوگئے۔ اس عبرتناک تبدیلی کا نقشہ آزاد صاحب کے قلم سے پیش کیا جاتا ہے:

"ایک رات، جو اپنی اذیّت، اپنی کشمکش، اپنے واقعات کے اعتبار سے ایک سال، ایک قرن، بلکہ ایک پوری عمر کے برابر تھی! اس وقت گویا میں آخری فیصلہ کرنے والا تھا۔ ایک مستغرق یقین کی جگہ ایک بے رحم انکار میرے حصے میں آنے والا تھا.... تمام شب کشمکش وتذبذب میں کٹ گئی۔ بڑا سخت مقابلہ رہا، یعنی اپنا تمام سرمایہ

کھو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک آخری خفیف سالگاؤ باقی تھا۔ وہ بھی اتنا قوی نکلا کہ اس کے توڑنے کے لئے ذہن کو اپنی ساری قوت خرچ کر دینی پڑی۔ صبح کے قریب میں نے فیصلہ کر لیا۔ ٹھیک صبح صادق کا وقت تھا۔ میں جب سونے کی کوشش کرنے لگا تو دل میں ایک سخت ناقابلِ دفع یاس وحسرت پیدا ہوئی، ایسے جیسے کسی مایوس وداع کے بعد پیدا ہونی چاہئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ گویا ایک بڑی محبوب متاع جاتی رہی ہے اور پھر واپس نہیں ملے گی.... سورج نکل آیا مگر میں نے نماز نہیں پڑھی۔ دن بھر یہ حالت رہی کہ کبھی ملامت کا احساس جاگ اٹھتا اور کبھی دماغ میں توہمات سے آزادی کا فخر وغرور محسوس ہوتا! اس کے بعد بالالتزام نماز ترک کر دی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد عید آگئی۔ اس میں شرکت ناگریز تھی، چنانچہ دوگانہ عید پڑھا، لیکن پھر اس پر سخت ندامت ہوئی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اس سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔ شک واضراب نے جس طرح انکار والحاد تک ارتقا کیا، اسے مختصراً مگر ترتیب کے ساتھ بیان کرنا چاہئے۔

عقائد کے اذعان ویقین کا خاتمہ ہو گیا

اب پوری طرح شک نے جگہ پکڑ لی اور اپنے فہم ونظر کے مطابق از سرنو مذہب اور علوم کا مطالعہ شروع کیا۔ اس نے ایک دوسری مصیبت پیدا کر دی یعنی خود مذاہب بھی باہم دگر نزاع اور صرف خلاف تعدد نہیں بلکہ خلاف تضاد اور بجائے رفع اختلافات اور دعوت یقین کے خود نفس مذہب کا موجب نزاع وخلاف اس طرح ہو جانا کہ تاریخ جمیعتہ بشریہ میں اس سے بڑھ کر کوئی انسانی نزاع نہیں ملتی۔ یہ قطعی ہے کہ حقیقت وصداقت میں نہ تو تعدّد ہو سکتا ہے نہ اختلاف، اور اگر ایسا ہے تو مختلف ومتضاد صدائیں حقیقت نہیں ہو سکتیں۔

اس سے بھی سخت تر میری مصیبت تھی یعنی ہر دین وتشریع کے متبعین کے داخلی اختلافات اور تعدد وتخرب پر نظر ڈالتا تھا تو اس وقت بجز اختلاف ونزاع کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مذاہب خود مختلف۔ ہر مذہب میں پھر اختلاف ونزاع۔ ان کے فروع شعب میں بھی مزید تفرقہ واشتات، کیونکر نزاع واختلافات کا یہ مکمل سلسلہ حق وصداقت ہو سکتا ہے!

مجھ پر اسلام کا اندرونی اختلاف سب سے زیادہ شاق گزرا تھا اور نفس دین ووحی کے بعد اس سے زیادہ شک وانکار کی طرف لے جانے والی اور کوئی چیز نہ تھی۔ اس بارے میں جس قدر پچھلے اصول وضعیہ ' رفع اختلاف اور وجوہ ترجیح وانتخاب کے لئے پیش نظر رہتے تھے اور موجب اطمینان بھی ہو جاتے تھے، وہ ایک ایک کرکے آئے اور گرد وغبار کی طرح اڑ گئے۔ کوئی بات بھی وزنی اور ٹھہر جانے والی سامنے نہ آئی۔ اس زمانے میں المعتزلہ کی ترتیب کی وجہ سے بکثرت کتب ومقالات کا مطالعہ کر چکا تھا اور کر رہا تھا۔ عقائد وکلام میں بھی نظر نسبتاً بڑھ چکی تھی۔

اور یہ بات سب سے بڑی آفت ہوگئی تھی کہ جس قدر میں آگے بڑھتا تھا، تاریکی بڑھتی جاتی تھی اور روشنی ناپید تھی۔ اسی زمانے میں میں نے ادیانِ مشہورہ کی طرح اسلامی مذاہب کا بھی بقدر امکان مطالعہ کرنا چاہا لیکن اب مطالعہ ونظر ہی اس زہر کی تیزی بڑھا رہا تھا جس کا جام میرے ہاتھ میں تھا!

میرے خیالات کو ترتیب کے ساتھ ان سوالات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) اصحاب ادیان وشرائع کے مبادیات مثلاً وجود باری، بقائے روح اور معاملات معاد، ہم کیونکر اس کا یقین حاصل کر سکتے ہیں اور کیوں ماورائے احساس کے اعتراف پر مجبور ہوں؟

(۲) لیکن اگر حقیقت اثبات میں ہے اور دین وشریعت من جانب اللہ ہے تو اس میں اختلاف وتعدّد کیوں ہے اور کیوں تمام نوع وعرض پر ایک ہی دعوت نہیں بھیجی گئی؟

(۳) پھر ایک مذہب کے مان لینے کے بعد بھی نزاع وکشاکش سے نجات نہیں ملتی کیونکہ پھر وہی یکساں دعاوی کا تزاحم موجود ہے۔ خود اس مذہب کی اصلیت وصداقت، متخالف دعاؤں میں گم ہوگئی ہے اور ایک ایک مذہب کے پیرو بے شمار مذہبوں میں بٹ گئے ہیں۔ اسلام میں سب سے پہلے بڑے بڑے اصولی مذاہب ہیں مثلاً شیعہ، سنی، معتزلی، اہل الظواہر وغیر ذالک۔ پھر ان کی بھی بکثرت فروع وشعب ہیں۔ اصولی، احباری اشعری، حنبلی اور مذاہبِ فقہیہ وکلامیہ۔ ایک ہی دعویٰ اور بے شمار زبانیں۔ کون سا ذریعہ ہے کہ ایک کو مان لیں اور سب کو پسِ پشت ڈال دیں؟

دعاوی یکساں، دلائل تقریباً یکساں، پیش کردہ ثمرات یکساں، جزم واعتقاد یکساں اور قطعی ذریعہ ترجیح مفقود۔ ٹھیک جس طرح ایک مسیحی صرف اپنے ہی کو مستحق نجات سمجھتا ہے اسی طرح برہمن اور اسی طرح ایک مسلمان۔ یقین کیوں کر حاصل کیا جاسکتا ہے ؟اس کے بعد یکایک دوسرا سمندر موجیں مارنے لگتا تھا۔ خود یقین کیا ہے ؟ اور یقین کیونکر حاصل ہو سکتا ہے ؟ خود اس کے وسائل اور براہین میں بھی وہی اختلاف ونزاع موجود۔

خیالات کی بے قیدی ووحشت پھر اچانک ایک دوسری وادی کی طرف رہنمائی کرتی تھی اور ان تمام گوشوں سے ہٹ کر بالکل ایک نئے گوشے میں قدم پہنچ جاتے تھے۔ خود زندگی کیا ہے ؟اور زندگی کا مقصد کیا ہے ؟ کیوں کر وہ یقین حاصل کیا جائے جو زندگی اور زندگی کے مقاصد اسی طرح واضح کر دے جس طرح تمام محسوسات ؟ ایک چیز تو یقینی ہے یعنی وجود کے مان لینے کے بعد (کیونکہ اس طرف سے بھی اطمینان نہ تھا) ہمارے محسوسات قطعی اور یقینی ہیں تو اس طرح ہمارے اندر یقین وعلم کا اگر کوئی واسطہ رکھا گیا ہے تو وہ احساس ہی ہے۔ پھر کیوں اتنی اہم حقیقت محسوسات سے الگ ہو کر آتی ہے اور کیوں محسوسات میں نہیں ہے ؟ صحیح یاد ہے کہ ایک دن میں نے ابن الرّشد کی کشف الادلۃ دیکھی اور مجھے اس درجہ وہ حقیر وناچیز نظر آئی کہ اپنی پچھلی رایوں پر سخت تاسف ہونے لگا۔ ایک زمانے میں اسے علم وحکمت کا سب سے بڑا سرچشمہ سمجھتا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ دنیا کی گمراہی اور تاریکی کا سب سے بڑا سرچشمہ عامۃ الناس کا جہل نہیں بلکہ خواص اہل مذہب کا ادعائے علم وحکمت اور اوہام مذہبی کو نظریات فلسفہ کی طرح ظاہر کرنے کی کوشش۔ میں نے ابن رشد کا استدلال بقائے روح میں پڑھا اور اس کے صرف ایک معنے سمجھ میں آئے یعنی **روح کا وجود ہی نہیں ہے۔**

رفتہ رفتہ دماغ کے عجز نے انکار کی صورت اختیار کرلی اور صاف نظر آنے لگا کہ ادعائے حکمت اور روشن خیالی کے بعد ہم جو کچھ سمجھتے رہے، وہ بھی وہم وجہل تھا اور روز بروز انکار میں جزم وصلابت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اضطراب کی جگہ ایک طرح کا مایوس سکون پیدا ہو گیا۔ گویا مشکل حل ہو گئی' **اور وہ یہی ہے کہ کچھ نہیں ہے....**

میری غذا بالکل کم ہو گئی تھی۔ بھوک جاتی رہی تھی۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں نیند اچاٹ تھی اور اگر آتی تھی تو نہایت ہی وحشت انگیز خوابوں میں کٹتی تھی۔ میں نے اس زمانے میں جو خواب دیکھے، وہ میرے دماغی التہاب کا ٹھیک ٹھیک عکس تھے اور ذہن و خواب کے رشتے کو ٹھیک واضح کرتے ہیں۔

میں نے لق و دق صحرا دیکھا جس میں نہ ایک درخت تھا نہ کہیں سایہ اور نہ کوئی حد وانتہا۔ اچانک ریگستان میں آندھی آئی اور میں اس میں چھپ گیا۔ سمندر دیکھا۔ میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور موجیں مجھے اچھال رہی ہیں۔

سفر حجاز میں ایک شخص حاجی محمد ابراہیم بمبئی کے تاجر جہاز میں سوار تھے۔ ان کو مرگی کا عارضہ تھا۔ ایک دن ڈک میں کھڑے تھے۔ اچانک چکر آیا اور سمندر میں گر گئے۔ مرگی کی بیہوشی اور سمندر! بڑی مصیبتوں سے انہیں نکالا گیا۔ میں نے سمندر میں ان کا ڈوبنا، اچھلنا اور نزع واحتضار کی سی حالت کا چہرے پر طاری ہونا اچھی طرح دیکھا تھا۔ کئی مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ٹھیک اسی جہاز پر سوار ہوں۔ مرگی کا دورہ ہوا اور سمندر میں گر گیا۔ حاجی ابراہیم کو خلاصیوں نے جلد ہی نکال لیا تھا مگر مجھے کوئی نکالنے والا نہیں ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ تیزی کے ساتھ قہر سمندر میں گر رہا ہوں۔ کیا سچ مچ میرے دماغ پر مرگی طاری تھی؟ اور کیا حقیقتاً ایسا نہ تھا کہ سمندر کی موجوں میں، میں غرق ہو رہا تھا؟

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب گویا ذہن اپنی حالت پر قانع ہو گیا ہے اور کاوش اور نامراد طلب و جستجو سے طبیعت تھک کر ایک ہو چکی ہے۔

یہ میری زندگی کا سب زیادہ سے تاریک وقت تھا۔ اس سے بھی بہر حال کاوش و جدوجہد تھی۔ اقتناع نہ تھا، اس لئے نزع تھی۔ موت طاری نہیں ہوئی تھی **لیکن اب وہ طاری ہو گئی اور الحاد وانکار جو بسا اوقات سوفسطائیت کا بھی عنصر اپنے اندر رکھتا تھا۔ ایک مصنوعی طبیعت بن کر تمام افکار وعقائد پر غالب آ گیا۔**"[8]

ایک ایسے شخص کے لئے جو آل انڈیا نیشنل کانگرس کے سوشلسٹ بلاک سے وابستہ ہو چکا ہو، ترکِ اسلام کے بعد اپنی عقیدتوں کا رُخ بابیت و بہائیت کی طرف پھیر دینا ایک طبعی، منطقی اور فطری بات تھی کیونکہ بابیت و بہائیت "پیغمبرِ اشتراکیت" مزدک کی جانشین تھی اور اس کا اسلام اور دیگر

مذاہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ایک بہائی محمد یوسف بجنوری صاحب کا بیان ہے کہ "**ابوالکلام آزاد کے سید محفوظ الحق علمی (بہائی مبلغ) سے گہرے مراسم تھے**۔ ایک دفعہ وہ علمی صاحب سے بہائی کتابیں لے گئے۔ ان کا بیان ہے کہ آزاد، امر بہائی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ سفیر ایران نے ان کے سامنے بہائیوں کو گمراہ کہا جس پر انہوں نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ جناب سفیر آپ کو مفتی کس نے بنایا ہے؟ آپ اپنی سفارت کے فرائض سرانجام دیجئے"۔ 9

ابوالکلام آزاد صاحب نے بیسویں صدی کے تیسرے عشرہ میں "ام الکتاب" کے نام سے سورۃ فاتحہ کی تفسیر لکھی جس میں بہائیت کے مخصوص عقائد کی ترجمانی میں پورازورِ قلم صرف کر دیا۔ بہائی لوگ قرآنی آیت وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ سے قرآن کی منسوخی کا استدلال کرتے ہیں' وہ دنیا ہی کو یوم الدّین کا مصداق تسلیم کرتے ہیں اور قیامت سے مراد فقط بہاء اللہ کا ظہور لیتے ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی اور روز حشر کی جزا سزا کے قائل نہیں۔ آزاد صاحب نے اپنی نام نہاد تفسیر ام الکتاب میں اس بابی اور بہائی مسلک کی بالواسطہ طور پر کھلے لفظوں میں تائید کی۔ نیز لکھا "الدین" اور "الاسلام" سے مراد فقط وہی بنیادی پیغام ہے جو ہمیشہ ہر نبی اور رسول پیش کرتا آیا ہے اور عمل صالح اس پیغام کی اطاعت کا نام اور اسی پر نجات کا دارومدار ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بھی کوئی نئی چیز نہیں لائے تھے اور ایمان اور عمل صالح پر کسی مذہب یا طبقہ یا علاقہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔

اس گمراہ کن تفسیر پر دار العلوم دیوبند کے چوٹی کے عالم محمد یوسف بنوری استاذ جامعہ ڈابھیل (سورت) نے زبردست تنقید کرتے ہوئے لکھا:-

> **"من التفاسير التی الّفت با للغة الهندوستانية تفسير الامام ابی الكلام الذی لا يضاهيه تفسير فی العالم السلامی غير تفسير الامام الحجة المغفور له السيد رشيد رضا، آه ولا ادری هل اراد بتلک الجملة ثناء خرج من جذر قلبه ائتلافا بما قاله ذالک المفسر اوداهن لمصالح يقتضيها العصر و ايّاما كانت فلستُ ادين اللّٰه بشیء منه فأقول ان ابا الكلام احمد الدهلوی رجل وقاد القريحة واسع الطلاع صاحب بيان وبنان فی الأُردوية وعسیٰ ان يكون فريداً فی بدائع الانشاء ومحاسن الخطابة فی**

الاردویۃبعصرہ بل کادیکون مخترعا لبدیع اُسلوبہ، وحیوتہ قبل عشرین عاما کان انفع للقوم من حیوتہ الحاضرۃ ولہ قدم راسخ فی السّعی لأنقاذ الوطن عن مخلب الحکومۃ الاجنبیۃ وسلطۃ الدولۃ البرطانیۃ ولم یأخذہ فیہ خوف الحکومۃ وصولتھا ومن ثم سکت کثیر من علماء الحق فی شانہ وحالہ وفی قلبی لہ منزلۃ من مساعیہ الجمیلۃ فی سبیل حریۃ الوطن وانہ استحثّ فی اوائل امرہ کثیرا من اولی الھمم المتوانیۃ وایقاظ الرقود فی سبیل جھاد الحریۃ باجراء جریدتہ ”الھلال“و”البلاغ“وبخطابتہ الجاذبۃ للقلوب فی المحافل السیاسیۃ، بیدانہ رجل معجب بنفسہٖ برأیہ وفکرتہٖ یرذری با لعلماء بل بأکابر علماء الملّۃ اذا خالفت اقوالھم رأیہ وھواہ فأصبح بحیث ترٰی فیہ شحاً مطاعاً وھویٍ متبعاً واعجابا برأیہ وخروجا عن المسلک القویم العلم الصحیح کان فی اوّل امرہ رجلا صحیح الاعتقاد فیما نعلم منہ ویشھدہ بہٖ آثارہ ومقالاتہ فی جرائدہ ورسائلہ الاانہ لم یکن مقلّداً فی الفروع لاحد من الائمۃ کاھل الحدیث من القاضی الشوکانی والنّواب صدیق حسن خان وغیرھما غیر انہ لم یکتف بھذاالقدر بل اخذہ المو جدۃ علی العلماء الحنفیۃ حتی امام الائمۃ فقیہ الامۃ ابی حنیفۃ رحمہ اللّٰہ فی ”تذکرتہ“فکان ھذا یسیء الأدب مع اکابر الامۃ وسعی لان یکون اماماً متفقاً علی امامتہ فی الھند وامیراًللمسلمین فی امر دینھم ودنیاھم وحاول ان یجعلوہ امام الھند وان یجمعوا علی ذالک ولکن کان فی الھند رجال اولوعلم صحیح واصحاب معرفۃ وتقوی ودیانۃ حقۃ وکان ھو کماقلتُ فی سعۃ من امر دینہٖ حبلۂ علی غاربہ غیر مقیّد فی رأیہ وکان دون ھؤلاء فی العلم والعمل بمراحل فقام علماء دیوبند وصدعوا با لحق بانہ لیس اھلاًلذالک فانھم

تفرسوا فی امامته من المفاسد التی یشکل ان یغلق بابها فیما بعد فلم یفز بما کان یهواه ویتمناه وبالجملة انه کان علی تلک الحالة بُرهة أعلن انّه یؤلّف تفسیراً أفا ستشرفت الیه الاعناق وارتقبه الناس ترقب الهیمان الی الزلال العذب والنمیر البارد حتی یطبع جزء ثم جزء ثم ترجمة القرآن وعلیها فوائد مختصرة ومطولة وسماها "ترجمان القرآن" وبسط القول فی تفسیر الفاتحة فاخذتہٗ بأشتیاق وطالعت منہٗ تفسیر الفاتحة بأسره وعدة مواضع من تفسیر آیات مختلفة متفرقة فانطفأت فی قلبی لوعة الاشتیاق بل تأسفت ووددت ان لو لم یطبع لکان احسن واحسن فانه کان له فی القلب منزلة ورأیت ان الرجل تشعبت به الاهواء فی کل واد ولم ینج من مداحض الاوهام فأحسست ان ذلک الاعجاب بنفسه وبرأیه اورده اوّلاً الی انخلاع ربقة التقلید وانتهی به آخرا الی موارد حائدة عن الصراط السوی۔

وکل یدّعی حبّاً بلیلیٰ
ولیلیٰ لا تقرّ لهم بذاکا

شیءمن هفواته

فممّا حقق ذالک الرجل فی تفسیر "اهدنا الصراط المستقیم" أن کل دین من الادیان فی العالم سواء کان دین النصرانیة او الیهودیة او الصابئیة لو دان بہٖ الرجل فی صورته التی اتیٰ بها شارع ذلک الدین کفیٰ لنجاته یوم القیامة فان اصل هذه الادیان کلها واحد وهو الایمان باللّٰہ والعمل الصالح وشارع کل دین اتی با لتوحید وهدی الی العمل الصالح وانما الشرک واعمال الشرّ نشأت فی اتباع المذاهب من تحزّبهم وتشیّعهم وهو یردّد ذالک فی تفسیره ویدندن حوله بعبارات مختلفة واسالیب شتی

وهو يقول ان القرآن ينادی بأعلیٰ نداء الی ذالک و بزعم ان ذالک الذی فهمته هو مغزی القرآن و غرضه و يستدل لذالک بقوله تعالیٰ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:59) والعمل الصالح ليس عنده الاحكام التكليفية و الشرائع و ليس المدار عليها عنده و يقول ان تلک العبادات و تلک الشرائع ظواهر و رسوم و انها صور و ا جساد و ليست هی حقيقة الدين و لا روحه فكل من انكر الشرائع و الاحكام التكليفية اعتقاداً فيكون عنده مسلماً و لابد و قال فی تفسير قوله إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلاَمُ و فی قوله تعالیٰ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وهُوفِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الخَاسِرِيْنَ ان الاسلام عبار ة عن الوحدة الدينية العامة لا تختصّ بشر ع دُون شر ع فا لملل كلها تدعو الی هذه الو حده العامة و الصدق الكامل علیٰ سو اء فليس الملة الاسلامية عندهٗ مجمو ع الاعتقادات الخاصة و العبادات المخصوصة و هو يقول و ان اختلاف هذه الر سوم و الشر ائع و منالهج التحنث و التعبّد مما لم يكن عنه محيص فليس مما ينكر او يستحق الملام فاو سعوا له صدور كم الضيقة و ذروا ما انتم عليه من التضييق و التحجر فلو تعبد احد با لشريعة المو سوية و أحلّ حلالها و حرّ م حر امها و لم يتمسّک با لشريعة المحمدية و لم يحلّ حلالها و لم يحرّم حر امها بعد ان جاء السلام و نسخ الشر ائع السابقة فذالک الر جل لا محالة مسلم نا ج علی ما تصد ع به اصو له المو ضو عة، و غير ذالک مما موّهه و ز خر فه بأساليب انشائه و حبّر ه بتحبير اته و غرّ الناس بخضر اء دمنته فهو يقعقع بالشنان و جو فه هو اء و يجعجع من غير

طحین و کله هباء، و هذا الذی قلته مغزی عباراته لصّریحة لا یکاد یتأوّل فی شیء منه اللّٰهم الاّ ان یکون للصرائح تأویلات غیر سائغة فأنّه صرح به کفرق الصدیع وضوء النهار ولم یترک لشفرة محزّاً ولا للتأویل مساغا فی البین فهل قصر قلم الرجل عن افصاح مرامہٖ وهو رجل فصیح یقدر علی الصدع بغرضہٖ بلفظ لیس فیه عیّ ولا یشوبه نغض التعمیة و دنس العجمة فکیف یؤثر تعبیراً کم یرد منه ما یتبادر الیه الذهن ویفتقر الی صرفه عما یسرع الیه فکر الناظر مساقاً ومذاقاً ؟ فهل لک لذالک تأویل سبیل ' یشفی الغلیل ویغنی عن القال والقیل ؟ وهو یقول ان الاسلام دعا الناس اهل الدیان کافة الیٰ ان یتمسکوا بعُریٰ ادیانهم منقحة منخولة مما خلطوا به من الباطل واتباع الهویٰ ولم یعزم علیهم ان یدروا أدیانهم ویختاروا دیناً غیرها الی غیر ذالک من التلبیسات والتدلیسات مما یوقع الناس فی ورطة الهلاک وهرة الردیٰ۔

الا تسألون المرأ ماذا یحاولٗ
أنحب فیقضی ام ضلال وباطلٗ
وکل امریء یوماً سیعلم حاله
اذا کشفت عند الاله الخصائل

واهل جریدة "معارف" کتبوا فی الرد علیه مقالة مبسوطة وقابلوا تراجم بعض آیاته وترجمانه بما ترجمه قبل ذالک بعشرین عاماً فی جریدة "الهلال" واوضحوا بما فیهما من الفرق البیّن والاختلاف المبین فلا ادری کیف یکون هذا التفسیر مما لا یضاهیه تفسیر فی العالم۔ نعم لا یضاهیه ولا یوازیه بل لا یدانیه تفسیر فی مثل هذه المخترعات التی لیس علیها سلطان والهفوات التی لم یقم علیها برهان، والعجب ان صاحب

تلک المقالة فی جریدة الفتح الذی یثنی علی تفسیره ویعتقد فیه من المدیح الغالی من رفقاء اعضاء جریدة المعارف وهو علی بصیرة من مقالة المعارف فکیف قال ما قال والی اللّٰہ الاشتکاء فقد بلغ الحزام التبیین وبلغ السکین العظم لاعاصم الیوم الا من رحم، ثم ان ما ذکرته هی اصوله التی علیها أساس تفسیره واما تحویل کثیر من الاٰیات الی ما یهواه والتاویل فیها بما لا یحبّه اللّٰہ ولا یرضاه وما لم ینقل ممن اُنزل علیه القرآن ولا من اصحابه المخاطبین بہ بل ثبت وصح خلاف ما قاله کثیر لیس هذا موضع سرده ولا موضع الرد علیه وانما نقتصر علی تفسیر بعض الآیات ایقاظاً للغافلین وتحذیراً للمغرورین....

بنوری صاحب نے اس کی بعض مثالیں بیان کرنے کے بعد لکھا:

وغیرها من تأویلات الآیات بما لا یتأوّلها ائمة اهل السنة وجماهیر الامة وکل تفسیره مشحون بأمثال هذه التاویلات الرکیکة التی لا نفاذ لها ولا مساغ ومن دابہ الخاص انه لا یلتفت قط فی تفسیر الآیات الی الاحادیث والآثار وینوط الامر علی کتب التاریخ من مورّخی الیونان والفرنسا وغیرهم وان کان مدارها علی الجزاف والخرص ولا یلتفت الی الاحادیث وان کانت فی الباب موجودة وکانت اقویٰ سنداً من تلک الآثار والکتبات التاریخیة التی لیس علیها دلیل وبرهان کما قال جلّ ذکرہ مَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ومن دابہ انه اذا قام رأیاً فی امر فیزعمہٗ امراً قطعیاً بحیث لا یقاومہٗ حدیث مرفوع ولا اثر صحیح ولا درایة صحیحة ومن دابہ انہٗ یعزوا الی المفترین قولاً ضعیفاً فی آیة ویکون هناک اقوال قویة غیره فیردّ علی القول الضعیف ویتمسّک بقول آخر من اقوالهم ویصدع به مستکبراً کانه ابوعذرتہ وابن بجدتہ وان

المفسرين لا خبرة لهم بهٖ وربما يستهزأبهم متمثلاً بقول الشاعر

نزلوا بمكة فی قبائل نوفل
ونزلتُ با البيداء ا بعد منزل
وذی خطل فی القول يحسب انه
مصيب فما يلهم به فهوقائله

وقد شاع له مكتوب فی بعض الجرايد الاردوية وصدع فيه بأنّ الامور التی عليها مدار النجاة لا بد ان يصرح بها القرآن لصلحة واَقِيۡمُوا الصَّلٰوۃَ بل اصرح منها ولا بدأن يأمر بان يصدق به فكلما جاء فی القرآن امر فی غير الامور التی عليها مناط النجاة ولم يكن منتظما فی سلک العقائد فلا يلزم المرء قبوله واعتقاده وقال ومن اعتقادی انه لا ينزل المسيح ابن مريم (عليه السلام) فقيل له فی ذالک كيف نعتقد ذالک وقد صح فی نزوله احاديث وتواترت فما قولک فيها فأجاب "ذكر نزولهٖ فی سلسلة اشراط الساعة وليس مما يدخل فی العقيدة"۔ وياللعجب أليس التصديق بما جاء بهٖ نبينا القرشی محمد ﷺ من العقيدة فاذا جاء رسولنا ﷺ بأمر واخبر بوقوعهٖ وصحّ الاسناد واتصل بهٖ وتواتر عنه شرقاً وغرباً علی ظهر البسيطة فهل نرتقب بعده فی الايمان به والاذعان له لآمر آخر حتی يامرنا صريحاً بقولهٖ وأمنوا بنزول ابن مريم علا انه لا يكفی هذا عنده فی الحديث بل لا بد ان يكون فی القرآن وأمنوا بنزول عيسی ابن مريم۔ أفليس يكفی قولهٗ ﷺ "وكيف انتم اذا نزل فيكم ابن مريم" وایّ صراحة ابين منها وایّ اخبار اصرح منه ومع هذا تواتر معناه (ع) فی طلعة الشمس ما يغنيک عن رجل۔

ولو كان الامر كما زعم فأين الصلوات الخمس صراحة واين مقادير

الزكوة واين مسائل كفارة الصّيام ثم وثم الى ما يشكل استقصائه، أفليس اعتقاد فرضيتها من الامور التى عليها مدار النجاة اوليس يكفر من انكر فريضتها، قال شيخنا امام العصر رحمه اللّٰہ فى رسالتہ "اكفار الملحدين فى ضروريات الدين" واذا علمت هذا فنقول الصلوة فريضة واعتقاد فرضيتها فرض وتحصيل علمها فرض وجحدها كفر وكذا جهلها كفروا السّواک سنة واعتقاد سنيتہ فرض وتحصيل علمه سنة وجحودها كفر وجهله حرمان وتركه عتاب اوعقاب، اه

وانما اطنبت واستهبت فى غير ما كنت أحاوله من اول الأمر اعلاناً بما بدا لى من الكدر فى تفسيره والتدليس البيّن ولم يكن عندى من الدين لو كنت اغمض واضرب عنه صفحاً فان سموم الالحاد قد هبت فى الهند وعمت ارجائها القاصية واصبح اليوم مناط فهم القرآن المجيد على أمثال هذه التفاسير لتعبيراته الرائقة العصرية فقلما سلم منه احد الا رجل اعطاه اللّٰہ علماً صحيحاً اوتزكى نفسه بانفاس الذين لصحبتهم تأثير عظيم فى اصلاح النفوس فثلج صدره بما جاء به النبى عليه السلام ولم يحكّم فيه رأيه الضئيل الواهى وقد شرع احد من علمائ ا لفنجاب (وهو العالم الفاضل ابراهيم السيالكوٹى) من اهل الحديث فى تأليف تفسيرٍ فى الرد على ترجمان القرآن وطبع منه جزء لم اوفق بعدُ لمطالعته واظنّ انه اشيع فى الردّ عليه ويا ليت لو كان ابو الكلام ذا علم صحيح مولعاً با الدين الذى جاء به محمد ﷺ يكاد يعدّ من اعاظم رجال الدورة الحاضرة الذين يتباهى بهم العصر ولكان له فى القلوب مكانة غير ان محبّة الدين اعلق بقلب المؤمن من محبة ابى الكلام فلا بدّ ان تصان الشريعة من الوسخ الذى يحطّ من قدرها عند اولى البصائر الناقدة واصحاب العقول

السلیمۃ وفق اللّٰہ الامۃ کلھا الی الصّواب وھداھم الی سویّ الصراط۔"[10]

ترجمہ:

نیکی زیادہ دیرپا ہوتی ہے خواہ اس پر ایک زمانہ ہی گزر چکا ہو۔

جو تم نے جمع کیا ہے اس میں سب سے بُرا زادِ راہ شر ہے۔

ترجمان القرآن اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ہے جو ابو الکلام احمد دہلوی نے کیا ہے اور اس پر بعض جگہ مختصر اور بعض جگہ تفصیلی نوٹس بھی شامل کئے ہیں۔

ضروری ہے کہ میں اس کتاب کی اصل صورتحال اور جو کچھ اس میں سنت اور اجماع امت کے برخلاف باتیں ہیں ان کی حقیقت کھول دوں۔ مجھے یہ سطور لکھنے پر ایک ہم عصر کی تحریر نے مجبور کیا ہے جو اس نے قاہرہ کی اخبار "الفتح" کے شمارہ نمبر 562 میں شائع کی ہے۔ ضرب المثل ہے کہ یداك اوکتاو فوك نفخ۔ (یہ کہاوت اُس کے لئے بولی جاتی ہے جو پہلے بُرا کام کرلیتا ہے پھر اس سے بَری الذمہ بننے کی کوشش کرتا ہے) مضمون نگار نے اس ترجمہ کے متعلق اپنے مضمون میں اس ترجمہ کی وہ تعریف کی ہے جس کا یہ ترجمہ ہرگز سزاوار نہیں اور جو اس ترجمہ میں عیوب اور نقائص ہیں ان سے صرفِ نظر کیا ہے یا پھر اُسے اِن (علمی) باتوں کا ادراک ہی نہیں۔

ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم ہندوستان کے ایک شخص کی جھوٹی تعریفیں کرکے علماءِ مصر کو دھوکہ اور فریب میں ڈالیں۔ کیونکہ خیر خواہی اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر کی جاتی ہے اور یہ بات درست نہیں کہ ہم ہندوستان کے ایک فرد کی جھوٹی تعریف کریں اور اللہ کی مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اللہ کی ناراضگی خرید لیں۔ ایک شخص کی رضا کے مقابل پر اللہ اور اسکے رسولؐ کی رضامندی کہیں زیادہ اہم اور مقدم ہے۔

میں پہلے بھی اپنے رسالہ "نفحۃ العنبر" میں اس ترجمہ کی بعض ہفوات کی طرف اشارہ کرچکا ہوں جس میں میرا مقصد اللہ کی رضا کا حصول اور علم کے متلاشیوں اور ہندوستان کے عامہ المسلمین تک، جو میرے بھائی ہیں، دینی صداقت پہنچانا تھا۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ بعض لوگ مجھ پر طعن و تشنیع کرنے کے لئے اپنے منہ اور دواتیں کھول دیں گے اور تعصب اور کند ذہنی سے مجھے پر الزام تراشی کریں گے۔ لیکن یہ گزشتہ زمانوں سے ہی لوگوں کا ایک جاری طریق چلا آرہا ہے۔

تم نے ہمیں دودھ اور گوشت والے جانوروں کی کثرت کا طعنہ دیا ہے (جبکہ یہ جانور تجارت کے لئے نہیں بلکہ مہمان نوازی کے لئے ہیں) اور اے صحرا کے باسی یہ

ایسا الزام ہے جو باطل ہے۔

چغلی کرنے والوں نے اُس کو طعنہ دیا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور یہ

ایسا عیب ہے جو باطل ہے۔

میری توفیق صرف اللہ کی مدد سے ہے۔ اس پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں جھکتا ہوں۔

اس ترجمہ کے متعلق مضمون نگار نے لکھا ہے:

"ہندوستانی زبان میں آج تک جس قدر بھی تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی امام ابوالکلام کی اس تفسیر کے ہم پایہ نہیں ہے سوائے سید رشید رضا کی تفسیر کے۔"

مجھے معلوم نہیں کہ آیا یہ تعریفی کلمات واقعی اس مفسر کے بیان سے متاثر ہو کر اس مضمون نگار کے صمیم قلب سے نکلے ہیں یا پھر محض زمانہ کے تقاضا کے پیش نظر بعض مصلحتوں کی خاطر مداہنت اور چاپلوسی کی ہے۔ بہر حال یہی سچی بات کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ابوالکلام دہلوی ایک روشن دماغ، وسیع مطالعہ اور معلومات والا اور اردو میں تقریر و تحریر کا ماہر ہے اور شاید کہ وہ اپنے ہم عصروں میں عمدہ انشاپردازی اور محاسن خطابت کے لحاظ سے یکتا ہو گا بلکہ اپنے اُچھوتے انداز کا موجد بھی ہو گا۔ اسکی بیس (20) سال قبل کی زندگی اسکی آج کی زندگی سے زیادہ نفع رساں تھی اور غیر ملکی یعنی برطانوی حکومت کے پنجہ سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے سلسلہ میں اس نے بڑی مستحکم کوششیں کی تھیں۔ اس معاملہ میں اسے حکومت اور اس کی طاقت کا کبھی خوف نہیں ہوا۔ اس وقت سے کئی علماء حق اسکے کاموں اور اسکی حالت کے بارہ میں کچھ کہنے سے رک گئے ہیں اور خاموش ہیں۔ لیکن حریتِ وطن کے لئے اسکی مساعی جمیلہ کی وجہ سے میرے دل میں اس کی بڑی قدر ہے۔ اپنے آغاز کار میں اس نے کئی پست ہمت لوگوں میں جوشِ عمل پیدا کر دیا تھا اور اپنے دو اخبارات الہلال اور البلاغ جاری کر کے اور سیاسی جلسوں میں اپنی دلوں کو گرویدہ کر لینے والی تقاریر سے سوئے ہوئے لوگوں کو جہادِ آزادی کے لئے بیدار کر دیا تھا۔ لیکن ایک بات ہے کہ یہ شخص اپنے آپ پر بڑا نازاں ہے اور اپنی رائے اور سوچ کو ہی درست سمجھتے ہوئے عام علماء کو بلکہ بڑے بڑے علماء ملت کو بھی اگر وہ اسکی رائے اور خواہش سے اختلاف رکھتے ہوں، معتبر جانتا ہے۔ نتیجۃً اس میں خساست، اتباعِ ہوائے نفس، اپنی رائے پر نازاں ہونے اور درست طریق اور صحیح علم کو چھوڑ دینے کے نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔

جتنا ہم اس کے بارہ میں علم رکھتے ہیں اس کے مطابق یہ شخص اپنے ابتداء کار میں صحیح الاعتقاد

آدمی تھا۔ اس پر اسکی کئی باتیں اور مقالے جو اسکی جرائد ورسائل میں طبع ہوتے رہے گواہ ہیں۔ ہاں وہ کئی اہل حدیث علماء مثلاً قاضی شوکانی اور نواب صدیق حسن خان وغیرہ کی طرح فروع میں کسی امام کا مقلد نہ تھا۔ بلکہ اُس نے صرف اس پر بس نہ کی بلکہ جسارت میں اتنا بڑھ گیا کہ کئی حنفی علماء حتی کہ اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں حضرت امام ابو حنیفہ کی شان میں بھی گستاخی سے نہ رُکا اور وہ اکابر امت کی شان میں گستاخی اور سوئے ادب کرتا رہاہے۔ کوشش اس کی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کا واحد امام بن جائے جس کی امامت پر تمام لوگ متفق ہوں اور لوگوں کے دین و دنیا کے معاملات میں ان کا امیر المسلمین ہو جائے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ لوگ اسے امام الہند بنالیں اور اس پر اتفاق کر لیں لیکن اس کی بد قسمتی یہ کہ ہندوستان میں کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو علم صحیح، معرفت، تقویٰ اور سچی دیانت رکھنے والے ہیں۔ جبکہ یہ شخص ان علماء سے علم و عمل میں کوسوں پیچھے ہے۔

اس شخص کی (اس نفسانی) کوششوں پر علماء دیوبند اٹھے اور انہوں نے یہ حقیقت طشت ازبام کر دی یہ شخص اس مقام کا اہل نہ ہے۔ ان علماء نے اپنی فراست سے بھانپ لیا کہ اگر اس شخص کو امام اور قائد بنالیا گیا تو وہ مفاسد کا دروازہ کھلے گا بعد میں پھر اُس کو بند کرنا بڑا مشکل ہو گا۔

نتیجۃً یہ شخص اپنی خواہش اور تمنا میں قطعاً کامیاب نہ ہو سکا۔ اس بے قدری کی کیفیت میں اس نے کچھ وقت ہی گزارا تھا کہ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ایک تفسیر تالیف کر رہاہے۔ اس پر لوگوں کی نظریں اس پر لگ گئیں اور لوگ اُس کا ایسے انتظار کرنے لگے جیسے پیاسے اونٹ پانی کے لئے متلاشی ہوتے ہیں۔ پھر اُس نے پارہ پارہ کر کے ترجمہ قرآن شائع کر دیا جس میں کئی جگہ مختصر اور طویل حواشی بھی شامل کئے اور اُس کا نام 'ترجمان القرآن' رکھا۔ اس تفسیر میں اس نے سورۃ الفاتحہ پر بڑی تفصیل لکھی ہے۔ میں نے بڑے اشتیاق سے اس تفسیر کو حاصل کیا۔ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر مکمل اور بقیہ تفسیر سے مختلف مقامات سے مختلف آیات کی تفسیر پڑھی ہے۔ مگر میرے دل میں جو شوق کی لَو جلی تھی وہ بالکل بجھ گئی۔ بلکہ مجھے سخت افسوس ہوا اور دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ تفسیر شائع ہی نہ ہوئی ہوتی تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ پہلے میرے دل میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

اس تفسیر میں اس شخص کی سوچ منتشر نظر آتی ہے۔ کبھی کسی وادی میں کبھی کسی وادی میں بھٹکتاہے اور اوہام کے چنگل سے رہائی نہ پاسکاہے اس تفسیر کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوتاہے کہ یہ شخص اپنے آپ پر اور اپنی رائے پر بڑا نازاں ہے اور بزرگوں کی تقلید کا جُوا اس نے یکسر اتار پھینکا ہے۔ اس چیز نے اسے صراط مستقیم سے کہیں دُور جا پھینکا ہے۔

اور ہر ایک لیلیٰ کی محبت کا دعویدار ہے جبکہ لیلیٰ ان کی اس محبت کا اقرار نہیں کرتی۔

اس ترجمہ کی بعض ہفوات

اس شخص نے اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں جس قدر بھی ادیان ہیں خواہ یہودیت و نصرانیت ہو یا مجوسیت ہو۔ اگر کوئی شخص ان ادیان میں سے کسی ایک کو اُس کی اُس صورت میں اختیار کرے جس صورت میں اس دین کے شارع نبی نے اسے پیش کیا تھا۔ تو اس کا یہ عمل روز قیامت اس کی نجات کے لئے کافی ہو گا۔ کیونکہ ان تمام ادیان کی اصل ایک ہی ہے یعنی ایمان باللہ اور عمل صالح۔ ہر دین کا شارع نبی توحید کی تعلیم لایا تھا اور اس نے عمل صالح کی طرف راہنمائی کی تھی۔ شرک اور اعمال شر ان مذاہب کے پیروکاروں کے مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ مؤلف نے یہ مضمون اپنی تفسیر میں کئی جگہ مختلف انداز اور مختلف اسلوبوں میں دہرایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن اس مذکورہ بالا مضمون کو بآواز بلند بیان کر رہا ہے۔ مؤلف بزعم خود خیال کرتا ہے کہ یہی بات سارے قرآن کا خلاصہ اور مغز اور غرض و مقاصد ہے۔ مؤلف نے یہ استدلال اس آیت سے کیا ہے: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَالَّذِينَ هَادُواْ وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (2:63) مؤلف کے نزدیک عمل صالح سے مراد شرعی احکام کی بجا آوری نہیں اور نہ ہی اس کے نزدیک ان شرعی احکام پر مدار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق یہ تمام شرعی احکام محض خول اور جسم ہیں نہ کہ دین کی اصل حقیقت اور روح۔ اس اعتبار سے اس کے خیال میں وہ شخص جو ان شرائع اور ان کے احکام پر اعتقاد رکھنے سے منکر ہو تب بھی اس مؤلف کے نزدیک ایسا شخص مسلم ہو گا۔ مزید یہ کہ اس مؤلف نے آیت اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامَ اور آیت وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامَ۔۔۔۔۔الْخَاسِرِیْنَ۔ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام سے مراد محض وسیع تر وحدتِ دینی ہے۔ اسلام کسی ایک شرع کو چھوڑ کر کسی دوسری شرع سے مختص نہیں کیونکہ تمام مذاہب اسی وحدتِ عامہ اور کامل سچائی کی طرف بلاتے ہیں۔ اس مؤلف کے نزدیک ملت اسلامیہ مخصوص اعتقادات و عبادات کا نام نہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ لوگوں کی ان عادات اور شرائع اور دینی احکام کی بجا آوری کے طریق ایسی چیز ہے جس سے چھٹکارا نہیں اور نہ ہے ایسا امر ہے جس کا انکار کیا جائے یا جس کی بنا پر کسی پیروکار پر ملامت کی جائے۔ اس لئے اسے قارئین! اپنے تنگ اور گھٹے ہوئے

سینوں کو کشادہ کرو اور جس گھٹن اور سنگدلی پر قائم ہو اسے ترک کردو۔ (مؤلف مزید لکھتا ہے کہ) اگر ایک شخص اسلام کے آجانے کے بعد بھی اور گزشتہ شرائع کو منسوخ کردینے کے بعد بھی شریعت محمدیہ سے رُوگردان رہ کر شریعت موسویہ پر کاربند رہے، شریعت موسویہ کے حلال و حرام کی پابندی کرے اور شریعت اسلامیہ کے حلال و حرام کی پابندی نہ بھی کرے۔ تب بھی اس مؤلف کے خود ساختہ اصول کی رُو سے ایسا شخص نہ صرف مسلم ہے بلکہ نجات یافتہ بھی ہے۔ یہ اور اس قسم کی اور کئی باتیں ہیں جو اس نے اپنی چرب زبانی سے اور ملمع سازی سے مختلف اسالیب میں سجا کر پیش کی ہیں اور لوگوں کو اپنی روڑی پر اُگنے والی سبزے سے لوگوں کو دھوکہ دیا ہے۔ یہ شخص اپنی دشمنی کی بنا پر ہتھیاروں کی جھنکار سنا رہا ہے مگر تہی دست ہے۔ یہ وہ ہے جو اس کی واضح عبارتوں کا ماحصل اور مغز ہے۔ ان عبارتوں کی کوئی اور تاویل نہیں کی جاسکتی سوائے اس کے ان کی ایسی تاویلات کی جائیں جن کی گنجائش ہی نہ بنتی ہو۔ پس کیا اس شخص کا قلم اس کے اصل مقصد کو واضح کرنے سے قاصر رہ گیا ہے؟ حالانکہ یہ ایک فصیح و بلیغ شخص ہے جو اپنی غرض کو بخوبی کھول کر بیان کرسکتا ہے۔ جس معیاری بات کی اس شخص سے توقع تھی۔ جبکہ وہ اس سے صادر ہی نہیں ہوئی تو پھر ادنیٰ گھٹیا چیز کو کس طرح ترجیح دے دی جائے؟ (پھر اس مؤلف کو مخاطب کرکے لکھا ہے کہ) کیا تیرے لئے کوئی ایسی تاویل کرنا ممکن ہے جو ہر قسم کے بحث مباحثہ سے خلاصی بخشے اور پیاسے کو سیر کرسکے؟

یہ مؤلف کہتا ہے کہ اسلام تمام ادیان کے پیروکاروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے مسخ شدہ دینوں پر اور جو کچھ لوگوں نے ان دینوں میں جھوٹ اور نفسانی خواہشات کو ملا جلا دیا ہے اس پر قائم رہیں۔ نیز اسلام انہیں ہرگز پابند نہیں کرتا کہ وہ اپنے دینوں کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کریں۔ یہ اور اس قسم کی دیگر شبہات سے پُر اور دھوکہ کی باتیں مؤلف نے اپنی اس تفسیر میں لکھ دی ہیں جو لوگوں کو ہلاکت کے گڑھے میں گرادیں گی۔

کیا تم دونوں نے (اس) انسان سے پوچھ لیا ہے کہ وہ کیا (حاصل کرنا) چاہتا ہے؟
کیا (وہ) موت جو وہ دیا جائے گا یا گمراہی چاہتا ہے اور بے مقصد کام کئے جا رہا ہے۔
اور ہر انسان ایک نہ ایک دن ضرور اپنا حال جان لے گا جب اللہ کے حضور
(اس کے) فضائل و طبائع ظاہر ہو جائیں گے۔

اخبار ”معارف“ والوں نے اس مؤلف کے خیالات کی تردید میں ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے اور بعض آیات کا ترجمہ جو اس نے اس تفسیر ترجمان القرآن میں کیا ہے اس کا موازنہ اسی مؤلف کے آج

سے بیس سال قبل ان آیات کے کئے ہوئے ترجمہ سے کیا ہے جو اس کے اخبار ''الہلال'' میں چھپا تھا اور دونوں تراجم میں جو اختلاف ہے اسے کھول کر بیان کیا ہے۔

اندریں صورت مجھے سمجھ نہیں آئی کہ پھر یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ تفسیر ایسے اعلیٰ پایہ کی ہے کہ دنیا بھر کی تفاسیر میں سے کوئی بھی اس کے ہم پلہ نہیں۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تفسیر اس تفسیر سے اس کی ان بے دلیل گھڑی ہوئی باتوں میں مشابہ نہیں عجیب تر بات یہ ہے کہ وہ شخص جو اس مؤلف کی تفسیر کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ اس تفسیر میں بڑی قابل ستائش باتیں بیان ہوئی ہیں۔ وہ اخبار ''المعارف'' کی مجلس ادارت کا رکن ہے اور اس اخبار المعارف میں جو اس تفسیر کی اصل حقیقت پر مبنی مضمون چھپا تھا وہ شخص اس مضمون سے بھی بخوبی آگاہ ہو گا۔ پھر نجانے اس نے کیسے یہ تعریفی باتیں کہہ دی ہیں۔ یہ معاملہ تو حد سے ہی باہر ہو گیا ہے۔ آج کوئی بچانے والا نہیں۔ ہاں جس پر وہ اللہ رحم کر دے وہی نجات پائے گا۔

میں نے جو اس تفسیر کے متعلق چند باتیں لکھی ہیں یہ وہ اصول (بنیادی امور) ہیں جن پر اس تفسیر کی بنا ہے ورنہ جو اس تفسیر میں کئی آیات کو حسب خواہش نفسانی موڑ توڑ لینے، ایسی تاویل کرنے جس کو نہ اللہ پسند کرتا ہے اور نہ ہی وہ اس (رسولؐ) سے مروی ہیں جس پر قرآن نازل ہوا تھا اور نہ ان صحابہ سے مروی ہیں جو قرآن کے اول مخاطب تھے۔ بہت سی ایسی باتیں جو ثابت شدہ اور صحیح ہیں اس تفسیر میں ان کے بر خلاف لکھا گیا ہے مگر یہاں تفصیلاً ان کا ذکر کرنے کا موقعہ نہیں اور نہ ہی ان باتوں کا رد درج کرنے کا موقعہ ہے۔ تاہم غافلوں کو بیدار کرنے اور دھوکہ خوردوں کو متنبّہ کرنے کے لئے اس کی تفسیر میں سے بعض آیات کی تفسیر درج کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ مفسر آیت كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (2:66) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تم انسان کے مرتبہ سے گرتے ہوئے بندروں کی طرح ذلیل و رسوا ہو جاؤ۔ تم مروت و انسانیت کی محفلوں سے دھتکار کر نکال دیئے جاؤ گے۔

پھر اپنی تفسیر کے صفحہ 261 پر آیت فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا کی تفسیر میں لکھتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تمہاری بزدلی کی وجہ سے تم پر موت ہے یعنی تمہارا دشمن تم پر غالب آجائے گا اور تم دشمن پر فتح و کامرانی کی زندگی سے محروم کر دئے جاؤ گے۔ ثُمَّ اَحْيَاهُمُ اللّٰهُ یعنی پھر اللہ نے ان میں عزم و ہمت اور ثبات قدم کی روح پھونک دی جس کے نتیجہ میں وہ قتال کے لئے مستعد ہو گئے تو اللہ نے انہیں فتح اور نصرت عطا فرمائی۔

اسی طرح آیت اَوۡ کَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَةٍ۔۔ کو بھی ظاہر سے پھیرنے کی کوشش کی ہے لیکن صرف ایک میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ ملاحظہ ہو (ترجمان القرآن صفحہ 269)

اسی طرح آیت فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّیۡرِ۔ کی وہی تفسیر کی ہے جو ابو مسلم اصفہانی معتزلی نے کی ہے جو امام رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔

نیز ابو الکلام اپنی تفسیر کے آخر پر جمہور علما کے اقوال کو رد کر دینے کے قابل چیز قرار دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ 270-271)

اس طرح اس مفسر نے اپنی کتاب کے صفحہ 200 وغیرہ پر آیت وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ کی تفسیر میں تحریف کر کے ایسی ایسی تاویلات لکھی ہیں جو ائمہ اہل سنت اور جمہور علماء امت میں سے کسی نے نہیں کیں۔ اس کی ساری تفسیر ایسی ہی رکیک تاویلات سے بھری پڑی ہے جن کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

اس مفسر کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ کس آیت کی تفسیر کرتے وقت احادیث مبارکہ کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتا بلکہ ان کے بالمقابل یونان اور فرانس کے مؤرخوں کی کتبِ تاریخ پر اعتماد کرتا ہے خواہ ان کی بنا اٹکل اور قیاسات پر ہی ہو۔ حالانکہ احادیث تو مستند ہونے کے اعتبار سے آثارِ قدیمہ اور تاریخی کتبوں سے زیادہ تر مرتبہ پر ہیں کیونکہ ان آثار اور کتبون پر دلیل کوئی نہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ۔ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ۔

اور ایک اس مفسر کی مخصوص عادت یہ ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں اپنی ایک رائے قائم کرلیتا ہے تو پھر اسی کو ایسی قطعی بات خیال کرتا ہے کہ جس کا مقابلہ اس کے خیال میں مرفوع حدیث یا صحیح روایت اور درست درایت بھی نہیں کر سکتی۔

ایک طریق اس مفسر نے یہ اختیار کیا ہے کہ مفسرین کے قوی تر اقوال کو ترک کر کے ان کے کمزور تر اقوال درج کر کے ان کو رَد کرتا ہے۔ پھر (بغیر نام لئے) ان کا کوئی اچھا قول اپنے نام سے لکھ کر اس پر اتراتا ہے اور بسا اوقات یہ شخص ان مفسرین پر استہزا بھی کرتا ہے۔ بقول شاعر

وہ (مخالفین) مکہ میں نوفل قبائل کے ہاں ٹھہرے اور میں نے صحرا میں اُن سے بہت دُور قیام کیا ہے۔

اور لغو اور مہمل کلام کرنے والا گمان کرتا ہے کہ وہ ہی درست ہے پس جو خیال اس کے دل میں آتا ہے تو وہ اُسے کہہ دیتا ہے۔

ایک اردو اخبار میں اس (مفسر) کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ جو امور مدارِ نجات ہیں لازمی ہے کہ قرآن ان کو کھول کر بیان کرتا ہو جیسا کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم بالصراحت آیا ہے بلکہ وہ امور اس سے زیادہ صراحت سے بیان ہونے چاہئیں جو امور مدارِ نجات ہیں ان کے سوا جتنے بھی احکام قرآن میں وارد ہیں جن کو عقائد میں شامل نہیں کیا گیا ان احکام کو ماننا اور ان پر اعتقاد رکھنا لازمی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا اعتقاد ہے مسیح ابن مریم نازل نہیں ہو گا۔ اس پر اُس سے پوچھا گیا کہ ہم تیری بات کیسے مان لیں جبکہ نزول مسیح کے بارہ میں صحیح اور کثیر روایات موجود ہیں؟ تیرا ان احادیث کے متعلق کیا کہنا ہے؟ اس کا جواب اس نے صرف اتنا دیا کہ "نزول مسیح کا ذکر اشراطِ قیامت میں سے ہے اور عقائد میں داخل نہ ہے" یہ کس قدر عجیب بات ہے۔ کیا جو باتیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہیں کیا ان کی تصدیق کرنا جزوِ عقیدہ نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ ایک بات بیان فرماتے ہیں اور اس کے وقوع پذیر ہونے کی خبر دیتے ہیں اور وہ روایت صحیح اور متواتر سند کے ساتھ زمین کے مشرق و مغرب میں پھیل چکی ہو تو کیا اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو گی جس پر ایمان لانا اور کان دھرنا چاہیے؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ ہمیں بالصراحت حکم فرماتے ہیں کہ ابن مریم کے نزول پر ایمان لاؤ۔ لیکن اس مفسر کے نزدیک اس حکم کا صرف حدیث میں وارد ہونا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ قرآن میں بھی صریحاً امنوا بنزول عیسی بن مریم کے الفاظ ہونے ضروری ہیں۔ کیا اس شخص کیلئے یہ ارشاد نبوی کہ "وکیف انتم اذانزل فیکم ابن مریم" کافی نہیں؟ کون سے وضاحت اور خبر اس ارشاد نبویؐ سے بڑھ کر واضح ہو گی؟ وہ ارشاد بھی ایسا کہ پورے تواتر سے ثابت ہے۔

جب سورج طلوع ہو جائے تو پھر کسی اور روشنی کی ضرورت نہیں رہتی۔

اگر (اعتقادات اور نجات کا) معاملہ اسی طرح ہوتا جس طرح کہ یہ شخص (ابوالکلام) خیال کرتا ہے تو بتائے کہ قرآن میں پانچ نمازوں کا، زکوٰۃ کی شرح کا، روزہ کے کفارہ کا کہاں بالصراحت ذکر آیا ہے؟ کیا ان (نماز، زکوٰۃ، روزہ) کی فرضیت کا اعتقاد مدارِ نجات نہیں ہے؟ کیا ان کی فرضیت کے منکر کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا؟ ہمارے بزرگ استاد امام العصر رحمہ اللہ اپنے رسالہ "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" میں لکھتے ہیں:

"جب آپ نے میری ابتدائی بحث سمجھ لی ہے تو اب میں کہتا ہوں کہ ان امور (نماز، زکوٰۃ، روزہ) کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا فرض ہے اور ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض ہے اور ان کا انکار کفر ہے اور ایسا ہی ان سے لاعلم رہنا بھی کفر ہے۔ مسواک کرنا سنت ہے اور اس کے مسنون ہونے پر اعتقاد

رکھنا فرض ہے اور اس کا علم حاصل کرنا سنت ہے۔ اس کا انکار کفر ہے اور اس سے لاعلم رہنا بدنصیبی ہے اور اسے عمداً چھوڑنا باعثِ عتاب وعقاب ہے۔"

اس تفسیر کے متعلق جوبات میں نے صرف ابتدائی کے بعد پوری وضاحت اور تفصیل سے بیان کر دی ہے وہ یہ ہے کہ مجھ پر اس تفسیر میں صرف گدلا پن ہی اور واضح دھوکہ دہی ہی ظاہر ہوئی ہے اور اس تفسیر کا دین سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہے۔ اگر میں اس تفسیر پر دوٹوک تبصرہ نہ کروں بلکہ اس سے صرف نظر اور چشم پوشی کروں تو (اس تفسیر کی وجہ سے) پورے ہندوستان میں کفر والحاد کی آندھی چل پڑے گی اور ہر طرف پھیل جائے گی اور آج سے فہم قرآن کا مدار اس جیسی تفاسیر پر ہو جائے گا۔ بڑا مشکل ہو گا کہ اس کی لپیٹ سے کوئی شخص بچ سکے سوائے اس کے جسے خود اللہ نے علم صحیح عطا کیا ہو اور اسے ان لوگوں کے انفاس قدسیہ کے ذریعہ پاک کیا ہو، جن کی صحبت اصلاح نفوس کی عظیم تاثیر رکھتی ہے۔ اور اس کا دل نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشاد پر مطمئن ہو اور اس معاملہ میں اپنی لولی لنگڑی اور بودی سوچ کو نہ گھسیٹرے۔

ہندوستان کے علماء اہل حدیث میں سے ایک نے اس تفسیر ترجمان القرآن کا رد لکھنا شروع کر دیا ہے اور اس کا ایک جزو چھپ بھی گیا ہے۔ لیکن تاحال میں اس کا مطالعہ نہ کر سکا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس عالم نے اس تفسیر کا رد پوری شرح وبسط سے کیا ہو گا۔

اگر ابوالکلام علم صحیح رکھتا ہوتا اور رسول کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لائے ہوئے دین کی کچھ قدر کرتا ہوتا تو بالکل ممکن تھا کہ عصر حاضر کے ان عظیم لوگوں میں شمار ہوتا جن پر زمانہ فخر کرتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی بڑی قدر ومنزلت ہوتی۔ لیکن کیا جائے کہ مومن کے دل میں سچے دین کی محبت ابوالکلام کی محبت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جاگزیں ہے۔ پس لازمی ہے کہ شریعت کو اس میل کچیل سے محفوظ رکھا جائے جو شریعت کی قدر اصحابِ بصیرت اور عقل سلیم رکھنے والوں کی نظر میں گرا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ساری امت کو درست راستے پر چلنے کی توفیق دے اور انہیں سیدھی راہ کی ہدایت دے۔

وسط1936ء کا واقعہ ہے کہ گیا کے ایک صاحب حکیم سعد اللہ گیاوی نے ابوالکلام آزاد صاحب سے حدیث مجدد کی نسبت سوال کیا جس پر انہوں نے غضبناک ہو کر جواب دیا:

"ہمیں کون سی ضرورت ہے کہ اس لغویت میں پڑیں۔ ہم نہیں جانتے مجدد کیا بلا ہوتی ہے۔"[11]

یہ جواب صرف بابی یا بہائی دے سکتے ہیں۔ کوئی مسلمان بقائمی ہوش وحواس ایسا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث صحاح ستہ کی کتاب ابوداؤد "کتاب الملاحم باب مایذ کر فی قرن المائۃ" میں موجود ہے اور تمام محدثین امت نے اس کی صحت پر اتفاق کیا ہے۔[12] یہی نہیں تیرھویں صدی تک کے مجدّدین کی فہرست اسلامی لٹریچر میں موجود ہے۔[13] ان مجدّدین میں سے بعض نے تو اللہ تعالیٰ کے الہام سے دعویٰ مجدد کیا۔ چنانچہ امام الہند حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

"البسنی اللّٰہ سبحانہٗ خلعۃ المجددیّۃ حین انتھت بی دورۃالحکمۃ.... علّمنی ربی جلّ جلالہ ان القیامۃ مد اقتربت والمھدی تھیاء للخروج۔"[14]

جب مجھ پر دور حکمت کی انتہاء ہوگئی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے خلعتِ مجددیت پہنائی۔ مجھے میرے رب جلّ جلالہ نے یہ بھی علم دیا کہ **قیامت قریب آن پہنچی ہے اور مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔**

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اسی تصنیف لطیف میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وصیت دیگر"

در حدیث **آمدہ است من ادرک منکم عیسیٰ ابن مریم فلیقرء منی السّلام**[15] ایں فقیر آرزوئے تمام دارد کہ اگر ایام حضرت روح اللہ رادر یابد اوّل کسی کہ تبلیغ سلام کند من باشم واگر من آنزانہ دریافتم ہر کسی کہ از اولاد یا اتباع ایں فقیر زمان بہجت نشان آنحضرتؐ دریابد حرص تمام کند در تبلیغ سلام تا کتیبہ آخرہ از کتائب محمدیہ ما باشیم۔"[16]

ترجمہ: ایک اور وصیت

حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے جو عیسیٰ ابن مریم کو پائے اسے میرا سلام پہنچانا۔ اس فقیر کی انتہائی آرزو اور تمنا یہ ہے کہ اگر حضرت روح اللہ کا زمانہ مجھے نصیب ہو تو سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کا سلام پہنچانے کی سعادت مجھے ملے۔ لیکن اگر میں یہ زمانہ نہ پاسکوں تو میری اولاد یا اتباع میں سے جو بھی آں حضرت (مسیح

موعود) کا زمانہ پائے تو وہ میری دلی آرزو کو پورا کرے تا محمدیت کے لشکروں میں سے
آخری لشکر میں بھی شامل ہو سکیں۔

یہ توامت کے بلند پایہ مجدد، محدث اور صاحب کشف والہام بزرگ حضرت سید ولی اللہ شاہ دہلوی کا مسلک تھا مگر ابوالکلام آزاد صاحب نے حکیم سعد اللہ صاحب کے نام مراسلہ کے آخر میں "آمد مسیح" کے بارے میں لکھا - :

"اگر آپ طالب حقیقت ہیں تو ان جھگڑوں میں نہ پڑیئے، **نہ ان خرافات کے بارے میں سوال کیجئے۔**"[17]

آزاد صاحب کا یہ خط مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری نے "اہلحدیث" میں شائع کر دیا اور اس کو زبردست تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اعتراض کیا کہ آزاد صاحب نے اپنے مراسلہ میں احادیث کا کیوں ذکر نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مطبوعہ پرچے کے ساتھ مکتوب کے ذریعہ ان سے وضاحت چاہی جس کا جواب ابوالکلام صاحب نے جن الفاظ میں دیا، اس نے یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب کر دی کہ احراری علماء کے "امام الہند" آنحضرت ﷺ کے باغی ہیں اور ان کی یہ بغاوت بابیت و بہائیت ہی کی پیداوار تھی۔ آزاد صاحب نے لکھا:

"نزول مسیح کی خبر محض آثار قیامت کے سلسلے میں دی گئی ہے۔ **مسلمانوں کی نجات وسعادت کے معاملے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔**"[18]

آزاد صاحب کی سرور کائنات ﷺ سے غداری کا بھانڈا 1927ء میں ہی پھوٹ چکا تھا جبکہ مسلمانان ہند نے حضرت امام جماعت احمدیہ کی قیادت میں "ورتمان" اور "رنگیلا رسول" کی فحش اور گالیوں سے بھری مغلظات کے خلاف ناموسِ رسولِ عربی کی حفاظت کے لئے تحریک اٹھائی۔ ہائیکورٹ پنجاب کے جسٹس دلیپ سنگھ نے فیصلہ کیا کہ یہ تحریرات دفعہ 153 الف کی زد میں نہیں آتیں۔ اس فیصلہ نے ہندوستان کے عشاقِ رسول کو ماہی بے آب کی طرح تڑپا دیا مگر احرار اور ہندو کانگرس کے متفقہ "امام الہند" نے بدقماش آریہ سماجیوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے اس تحریک کو "لغویت" کا نام دیتے ہوئے ایک غیور مسلمان کو خط لکھا:-

"آپ کو معلوم نہیں پچھلے دنوں کسی چیز نے مجھے اتنی اذیت نہیں دی جس قدر آپ کے فدایان رسولؐ کی ان ناقابل برداشت لغویتوں نے۔ **کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا** لطف یہ ہے کہ آپ از راہ جوش ایمانی مجھے بھی

دعوت دیتے ہیں کہ میں حصہ لوں.... اپنا جو فرض اسلامی سمجھتا ہوں اس کے مطابق لوگوں کو بتلاؤں گا کہ **انہوں نے کیسا غلط اور گمراہ کن طریقہ اختیار کیا ہے۔**"

اسی پر بس نہ کرتے ہوئے مزید لکھا:

"مجھے قطعاً اس سے انکار ہے کہ عوام کی یہ ذہنیت بنانے کی کوشش کی کہ کوئی چوہا اچھلا اور انہوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا کہ اسلام کی کشتی ڈوب گئی۔ جہاں کسی آریہ نے کوئی بات کسی جلسے یا اخبار میں کہہ دی اور بس شور مچانا شروع کر دیا کہ اسلام ختم ہو گیا.... آپ نہیں جانتے کہ اس طریقے سے مسلمانوں کی جماعتی ذہنیت کس طرح قتل کی جارہی ہے.... ان میں خفیف الحرکتی، چھچھورا پن اور دوں ہمتی کی تخم ریزی کی جارہی ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے فدائیان رسولؐ کی فداکاریاں.... کیا لغویت ہے اگر کسی ایسی کتاب کے لکھ دینے سے نعوذ باللہ رسولؐ اور امہات المؤمنینؓ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو ان بر خود غلط لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں تو کب سے ناموس کا خاتمہ ہو گیا ہے.... **خدارا اخبار فروشوں کی تقلید اعمیٰ میں اس طرح وارفتہ نہ ہو جاؤ۔**"[19]

اس بیان نے عشاق رسول عربیؐ کو ورطہ ء حیرت میں ڈال دیا کیونکہ یہی کانگرسی امام الہند تھے جنہوں نے اس سے قبل مسٹر گاندھی کی سرپرستی میں تحفظ خلافت، خلاف شریعت اور خلاف قانون تحریک چلائی اور اس ایجی ٹیشن میں انہوں نے نہ صرف لاکھوں مسلمانوں کو دہشت گرد بنا دیا بلکہ ان کو بے خانماں اور برباد کر کے افغانستان کی طرف دھکیل دیا تا ہندو سرمایہ دار ان کی جائیداد پر قابض ہو سکیں۔ یہ ایجی ٹیشن ناموس رسالت کے مقابلہ میں اتنی بھی حیثیت نہ رکھتی تھی جتنی آفتاب کے مقابلہ میں ذرّہ ناچیز کی ہوتی ہے کیونکہ ان کا قطعی یقین تھا کہ سلطان ترکی کی ہرگز "**اسلامی خلافت نہ تھی۔ یہ ایک خودساختہ منصب تھا۔**"[20]

بایں ہمہ انہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کے ذریعہ ایک طرف عامۃ المسلمین سے روپیہ اکٹھا کیا اور دوسری طرف معصوم مسلمانوں کو قانون شکنی کی اشتراکی راہوں پر ڈال دیا۔ انہوں نے کمیٹی کے قیام پر ان الفاظ میں پراپیگنڈا کیا:

"تمام مسلمانوں کو ان ہمدردان ملت کا شکر گذار ہونا چاہئے جنہوں نے آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی.... **خلافت کمیٹی روپیہ جمع کرے گی، ایجی ٹیشن جاری**

رکھے گی۔"[21]

پھر انہوں نے باور کرایا کہ اس ایجی ٹیشن میں برٹش انڈیا کے ہر مسلمان پر اس تحریک میں شمولیت واجب ہے۔ لہٰذا وہ برطانیہ کی خاطر "اسلام سے باغی" نہ ہوں۔ اس ضمن میں یہاں تک کہہ ڈالا:-

"مسلمان ہندوستان کی مسجدوں اور ان کے اندر نماز کو لے کر کیا کریں گے جن کی اجازت دے دینے پر برٹش گورنمنٹ کو ناز ہے۔ جبکہ شریعت کے **وہ احکام** (یعنی عراق اور بیت المقدس پر غیر مسلموں کے قبضہ سے متعلق۔ ناقل) **ان کے سامنے آجائیں گے جن کی تعمیل ہزار نمازوں سے بھی بڑھ کر اور ہزار روزوں سے بھی اشدّ واہم ہے اور جن کی نافرمانی کے بعد نہ تو اُن کی نمازیں ان کے لئے سودمند رہیں گی نہ ان کے روزے ہی نجات دلا سکیں گے۔**[22]

مسلم لٹریچر میں قدیم وجدید آئمہ مضلّین کے بہت سے فتاویٰ محفوظ ہیں مگر ایسا گمراہ کن فتویٰ جو الحاد وزندقہ سے رنگین ہے کسی فرقے یا کسی مفتی نے آج تک نہیں دیا۔ اس لئے کہ نماز اور روزہ اسلام کے پانچ بنیادی احکام میں شامل ہیں جن کی بجا آوری فرض ہے۔ جس کا عرب کے کسی علاقہ پر غیروں کے تسلط یا عدم تسلط سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ نہ آنحضرت ﷺ نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو عرب ممالک کی اندرونی سیاست میں دخل دینے اور اس کی بناء پر اپنے وطن میں بغاوت برپا کرنے کی سند جواز دی ہے۔ یہ خالص "گاندھی اسلام" ہے اور "نہرو سوشلزم" ہے۔ ایسا فتویٰ وہی شخص دے سکتا ہے جس کا پیشہ ہی اپنی مطلب براری کے لئے قرآن کو بازیچہ اطفال بنانا ہو اور یہ جسارت اسلام کے بھیس میں بابی اور بہائی مبلّغ کر سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ بہائیوں کی اصل نماز اپنے معبود بہاء اللہ سے دعا ہے جو ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لئے کسی عبادت گاہ کی ضرورت نہیں اور نہ باجماعت نماز جائز ہے۔[23]

عبادت کے وقت گانے بجانے کا انگریزی باجہ ہر جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ "الاقدس" کے مطابق مسافر، مریض اور بوڑھوں کو نماز بالکل معاف ہے اور جن پر نماز واجب ہے انہیں سورج چڑھتے، ڈھلتے اور غروب کے وقت تین نمازیں پڑھنی پڑتی ہیں اور وہ بھی اس قدر کہ بہاء اللہ کے مدفن کو قبلہ بنا کر کھڑا ہو جائے اور چند منٹوں میں تین رکعتیں ادا کرے جن میں بہاء اللہ کی مقررہ دعائیں پڑھے اور رکوع اور سجدہ کر لے۔[24]

اس پہلو پر مزید تبصرہ کی بجائے یہ بتانا ازبس ضروری ہے بہائیت میں مثالی مبلغ وہی شمار ہوتا ہے

جو اپنا مذہب نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے پوشیدہ رکھے۔ چنانچہ بہاء اللہ نے میرزا حیدر علی اصفہانی کو استنبول کا مبلغ مقرر کیا تو اولین حکم یہ دیا کہ

"استر ذھبک و ذھابک و مذھبک۔"[25]

ترجمہ: اپنی دولت، سفر اور مذھب تینوں چیزوں کو عوام سے چھپا کر رکھنا۔

کانگرسی امام الہند نے اپنے مرشد کے اس تاکیدی فرمان پر اس درجہ سختی اور شدت سے عمل کیا کہ انسان داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اس راز پر ہمیشہ پردہ ڈالے رکھا کہ انہیں کن کن ذرائع سے روپیہ مل رہا ہے۔ انہوں نے حکومت کا تختہ الٹ کر جب کانگرسی سکیم کے مطابق ترکی وغیرہ مسلم ممالک سے گٹھ جوڑ کرنے کے لئے سفر کیا تو کسی کو خبر نہیں ہونے دی۔ بابیت و بہائیت کے سب بنیادی اصولوں کو تفسیر کے نام پر مسلمانوں میں پھیلانے کا حق ادا کر دیا مگر کسی کو شبہ تک نہیں ہونے دیا کہ یہ حضرت بھی در پردہ بہائی مشنری ہیں جو ان کی سیاسی پالیسی کا شاہکار ہے۔ حالانکہ انہی کے ہمعصر "حضرت علامہ سید محفوظ الحق علمی صاحب"(ولادت 1894ء۔ وفات 1978ء)[26] جن سے انہیں بابیت و بہائیت کا "فیض" ملا، نے 1908ء میں میرزا محمود زرقانی کے ذریعہ بہائی دھرم اختیار کیا۔ بعد ازاں بہائی مبلغ کی حیثیت سے داخل احمدیت ہوگئے اور خفیہ طور پر قادیان اور دوسرے مقامات پر بہاء اللہ کی تعلیم پھیلاتے رہے۔[27] لیکن مارچ 1924ء میں جب ان کی انڈر گراؤنڈ سرگرمیوں کا پردہ چاک ہو گیا تو وہ نہایت بے آبروئی سے قادیان کے مقدس گلی کوچوں سے نکل گئے اور آگرہ میں جا کر دم لیا۔ ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علمی صاحب کی اس ذلّت و رسوائی کے تجربہ سے "مولانا آزاد" نے خوب سبق سیکھا۔ تبھی تو وہ زندگی کے آخری سانس تک تقریر و تحریر کے ذریعے مسلمانوں میں بہائیت کے جراثیم بلا روک ٹوک پھیلانے میں سرگرم رہے۔ نہ صرف آزاد بلکہ اقبال کے لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے مفکر یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان حضرات کی ہر بات ذو معنی اور پہلودار ہوتی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے زوال اور زبوں حالی پر آنسو بھی بہائے جس پر ابوالکلام کا "تذکرہ" اور اقبال کا "شکوہ" اور "جواب شکوہ" شاہد ناطق ہیں۔ مگر اس کی غرض محض مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے اور ان میں مقبولیّت اور شہرت پانا ہی نہیں تھا بلکہ اصل مقصد بہائیوں کے اس دعویٰ کو تقویت دینا تھا کہ مسلمانوں کا اسلام کو چھوڑ دینا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اب انہیں کسی نئ

شریعت کی ضرورت ہے۔ وہ خود آنحضرت ﷺ کی خبر کے مطابق ہر اعتبار سے "علماء ھم" میں شامل تھے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ مفکّر علماء سوء کو نشانہ تضحیک بنا کر اپنی تفریح طبع کا سامان کرتے اور عامۃ المسلمین کا بھی دل بہلاتے رہے۔ بھولے بھالے عقیدت مندوں نے ان تابڑ توڑ حملوں کا پُر جوش استقبال کیا اور یقین کیا کہ قرون مظلمہ کی ملّائیت کی باقیات سے تو ہمیں نجات مل رہی ہے لیکن یہ سب نمائش تھی کیونکہ ان کی پوری زندگی ملائیت میں ہی ڈھلی ہوئی تھی اور وہ نہایت سنگدلی سے تکفیر کی شمشیر کا بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔ چنانچہ یہ ابوالکلام آزاد ہی تھے جنہوں نے کانگرس کی خود کاشتہ مجلس احرار کی ہمیشہ سرپرستی کی اور انہیں کانگرس کی طاقت اور سیاست سے مسلح کر کے احمدیت کے پاک جسم میں خنجر گھونپ دیا اور خود پردہ کے پیچھے اپنے گماشتوں کی انسانیت سوز کاروائیوں کا تماشہ کرتے رہے اور جب احمدیوں کو مسلم معاشرہ سے کاٹ پھینکنے کا منصوبہ عروج پر پہنچا تو "علامہ اقبال" جو اسی تاک میں بیٹھے تھے، یکایک میدان میں آ گئے اور کروڑوں احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کا قانونی اور سیاسی حربہ احرار کو تھما دیا اور کارل مارکس، نطشے، سپینسر، گوئٹے، ہیگل، بلکہ ابلیس کے مشیروں سے بھی جو فلسفہ سیکھا تھا، اس کو احمدیوں کے خلاف استعمال کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان تمام حرکتوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ جلّشانہٗ کے آستانے سے ہٹا کر باب، بہاء اللہ اور کارل مارکس کا پجاری بنا دیا جائے اور ان کے قبلہ کا رخ مکہ کی بجائے ماسکو اور عکہ کی طرف ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے 1929ء سے 1974ء تک جماعت احمدیہ پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے اور اسے کچلنے کے لئے عالمگیر سطح پر ہر جائز اور خلاف انسانیت حربہ استعمال کیا گیا۔ لیکن جیسا کہ **خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا، خلافت کی برکت سے سارے خوف امن میں تبدیل ہو گئے اور ہر بڑی سے بڑی سازش خدا تعالیٰ کے آسمانی سلسلہ کی ترقی کو روکنے میں ناکام و نامراد رہی۔**

میں سمجھتا ہوں مستقبل کا مؤرخ جب ماضی کے دریچوں سے انیسویں صدی کے ان واقعات کو جھانک کر قلم اٹھائے گا تو اسے لکھنا پڑے گا کہ یہ محض سچے وعدوں والے خدا کا فضل اور نظام خلافت ہی کی برکت تھی کہ کشتیِ احمدیت مخالفت کے مہیب عالمی طوفانوں کو چیرتی ہوئی پوری شان وشوکت سے ساحل مراد تک پہنچ گئی۔

سر اقبال کی بہائیت سے بے پناہ عقیدت

جناب ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب نے 1995ء میں "اقبال اور امر بہائی" کے عنوان سے ایک

تحقیقی مقالہ شائع کیا تھا۔[28] درج ذیل ضروری اقتباسات وواقعات اسی مقالہ سے ماخوذ ہیں جن کی تردید کی آج تک پاک وہند کے کسی اقبال شناس ادارے یا شخصیت کو جرأت نہیں ہو سکی۔

"1900ء میں ایک امریکن بہائی سڈنی اسپراگ لاہور شہر میں بسلسلہ تبلیغ قیام پذیر رہے۔ 1900ء میں ایران کے معروف بہائی مبلغ اور عالم، مرزا محمود زرقانی (وفات 1927) لاہور تشریف لائے اور1908ء تک یہاں مقیم رہے۔ مرزا صاحب طبیب بھی تھے اس لئے انہوں نے انارکلی میں اپنا مطب قائم کر لیا تھا۔ علامہ اقبال بھی ان دنوں لاہور میں رہتے تھے۔ چنانچہ 1902ء میں پروفیسر پریتم سنگھ (1959ء-1881ء) کے ذریعے علامہ اقبال کی ملاقات مرزا محمود زرقانی سے ہوئی اور پھر یہ دوستی 1925تک قائم رہی۔"[29]

بہائی دوست جناب مہربان اختری (پشاور) کا بیان ہے: "میں 1944 میں لاہور گیا اور وہاں بیڈن روڈ پر ریستوران چلاتا رہا۔ پروفیسر پریتم قیام پاکستان کے بعد سات ماہ تک لاہور میں ہی رہے۔ جناب پروفیسر مجھ سے بیان کیا کرتے کہ وہ کبھی مرزا محمود زرقانی اور کبھی سید محفوظ الحق علمی کے ہمراہ اقبال سے ملاقات کرتے۔ علامہ اقبال بڑے شوق سے اپنا فارسی کلام مرزا محمود زرقانی کو سناتے اور آپ جہاں ضروری ہوتا، اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح مرزا محمود کی دوستی علامہ اقبال سے 1901ء سے لے کر 1925ء تک برقرار رہی۔"

"افسوس ہے کہ تعصب کی وجہ سے کسی ماہر اقبالیات نے ابھی تک اس موضوع پر نہیں لکھا اور ان ملاقاتوں کا ذکر بھی نہیں کیا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ پروفیسر پریتم سنگھ علامہ اقبال کے ہم شہری اور ہم عمر تھے۔ ان کے آپس میں دوستانہ روابط عمر بھر قائم رہے۔ پروفیسر مرحوم برصغیر کے معروف ترین بہائی مبلغ، عالم اور صحافی تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کو امر بہائی کا مفصل تعارف کروایا تھا۔ پروفیسر پریتم سنگھ 1905ء میں ایچی سن کالج میں لیکچرار رہے اور آخری عمر میں دیال سنگھ کالج میں پروفیسر رہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی راقم کے نام اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

"مجھے پروفیسر پریتم سنگھ کا علم ہے۔ میں ان سے ملا ہوں۔ وہ سیرۃً نیک آدمی تھے۔ مگر کٹر بہائی تھے۔ انہوں نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ایک ایرانی لڑکی کو اپنایا

ہوا تھا۔ میں نے اسے بھی دیکھا ہے۔ وہ اکثر علامہ کے ہاں آتے تھے اور لاہور میں ٹمپل روڈ پر رہتے تھے۔ مگر شکل وصورت میں وہ سکھ تھے۔"[30]

"پروفیسر پریتم سنگھ 39 ٹمپل روڈ لاہور سے ایک ہفتہ روزہ انگریزی اخبار "دی بہائی" شائع کرتے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ 7 جنوری 1931 کو شائع ہوا تھا۔ خیال ہے کہ یہ اخبار وہ اپنے دوست علامہ اقبال کو ضرور بھیجا کرتے ہوں گے۔ مرزا محمود زرقانی سے علامہ اقبال کی ملاقات کا حال دیپ چند کھیانڑ ایوں لکھتے ہیں: "مرزا محمود زرقانی کو 1900ء میں حضرت عبدالبہاء نے پنجاب میں امر بہائی کا پیغام دینے کے لئے بھیجا تھا۔ پروفیسر پریتم سنگھ سیالکوٹ کے ایک جج کے بیٹے تھے اور علامہ اقبال کے دوست تھے۔ وہ ایک دن مرزا محمود زرقانی سے ان کے مطب میں ملے تو علامہ اقبال کو بھی اس بارے میں بتایا۔ اس پر علامہ اقبال کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ وہ اس ایرانی عالم وادیب سے ملاقات کریں۔ چنانچہ یہ دونوں دوست مرزا محمود زرقانی کے پاس گئے اور پھر مرزا محمود زرقانی سے 1905ء تک ملاقاتیں ہوتی رہیں۔"[31]

قیامِ لندن کے دوران ترکِ اسلام کا دستاویزی ثبوت

حقیقت یہ ہے کہ لندن پہنچتے ہی بہائی مبلغ مورخ ڈاکٹر ای جی براؤن نے محمد اقبال صاحب کو اسلام سے متنفر کر دیا تھا جس کا دستاویزی ثبوت ان کے قلم کا وہ مکتوب ہے جو انہوں نے لاہور سے 7 ستمبر 1921ء کو لکھا جس میں انکشاف کیا کہ:-

"اس زمانہ میں سب سے زیادہ بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ.... برس ہوئے جب پہلے پہل اس کا احساس ہوا۔ اس وقت میں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔"

اگلا فقرہ نہایت معنی خیز اور مغالطہ آفرینی کا فلسفیانہ شاہکار ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔"[32]

اگر تاریخ کا کوئی ادنیٰ طالبعلم بھی پہلے فقرہ کی روشنی میں اس آخری فقرہ کے لفظ "مسلمان" کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا، اس پر فوراً کھل جائے گا کہ یہ لفظ یقیناً مسلمانوں کی اس قوم پر اطلاق

نہیں پا سکتا جن کے متعلق1906ء میں یورپ نے اس یقین پر قائم کر دیا تھا کہ وہ نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کی علمبر دار اور دشمن زمانہ ہے۔ یقینا اقبال نے چا بکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی اسلوب کو اختیار کیا جو پچھلی صدی میں عیسائی اختیار کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کا موقف تھا کہ حضرت یسوع مسیح ہی خاتم النّبیین ہیں۔ اصل اسلام کلیسا ہے اور حقیقی مسلمان اس کے پیروکار ہیں۔ چنانچہ لدھیانہ کرسچن لٹریچر سوسائٹی نے1900ء میں "مسیح یا محمد" کے زیر عنوان پمفلٹ میں لکھا"یسوع مسیح سب سے برتر اور خاتم المرسلین ہیں۔" اسی طرح اسی سال سوسائٹی نے "سچا اسلام"نامی ٹریکٹ شائع کیا جس کالب لباب یہ تھا کہ عیسائیت ہی اسلام ہے اور مسیحی حقیقی مسلمان ہیں۔ یہ ٹریکٹ پہلی بار چار ہزار کی تعداد میں چھپ کر پورے ملک میں پھیلا دیا گیا۔

بالکل یہی اسلوب اقبال نے یہاں اختیار کیا ہے اور سیاق وسباق کے مطابق یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یورپ کی فضا اور بہائی مبلغ ومورخ مسٹر براؤن کی دستگیری، راہنمائی اور تبلیغ نے اقبال کو"دشمن اسلام" کے چنگل سے بچا کر جس صورت کا مسلمان بنایا ہے، وہ ایک الگ چیز ہے۔ جس کا دوسرا نام "بابی اور بہائی مسلمان" ہے جو اقبال کی نگاہ میں "نسلی امتیاز وملکی قومیت" سے داغدار نہیں بلکہ صوفیاءاسلام کے مخالف اتحاد عالم کا پیامبر اور جامع اور ہمہ گیر ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے مقالہ میں نہایت چا بکدستی سے پہلے مزدکیت کا ذکر کیا ہے جو قرۃ العین طاہرہ کی بدشت کانفرنس کی تقریر کے مطابق بابیّت کی بنیادی اینٹ اور فکر اساس ہے۔ ازاں بعد مسلم صوفیاء کے نظریہ وحدت الوجود کا ذکر کیا ہے تا مسلمانان عالم، باب اور بہاءاللہ کے دعویٰ خدائی کو تصوف کا باب سمجھ لیں اور ان کی نئی شریعت پر جرح قدح کرنے کا خیال تک نہ لائیں۔ یوں عالم اسلام کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے بعد بابیّت اور اور بہائیت کی تمام اسلامی فرقوں پر فوقیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:

> "ایرانی تفکر کے یہ مختلف سلسلے ایران جدید کی اس زبردست مذہبی تحریک سے ایک بار پھر متحد ہو گئے جو بابی یا بہائی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔"[33]

مقالہ کے آخر میں مبلغ بابیت وبہائیت محمد اقبال نے اس جدید مذہب کی تمام ادیان عالم پر برتری کاڈنکے کی چوٹ اعلان کیا۔ تحریر فرماتے ہیں:

> "بعد کے مفکرین میں ہم دیکھتے ہیں کہ نوفلاطونیت سے حقیقی فلاطونیت کی طرف جو حرکت شروع ہوئی تھی۔ اس کو ملاہادی کے فلسفہ نے تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ لیکن خالص تفکر اور خواب آور تصوف کے راستے سے بابی مذہب بری طرح حائل

ہو گیا۔ یہ مذہب ظلم وتعدد کی پروانہ کرکے تمام فلسفیانہ اور مذہبی میلانات کو متحد کرتا اور روح میں اشیاء کی ٹھوس حقیقت کا شعور پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس کی نوعیت بہت ہی جامع اور ہمہ گیر تھی۔"[34]

اقبال کے معاصر علماء اہلسنت نے اقبال کے اس فلسفہ الحادوزندقہ کی بناء پر (جو اسلام سے ارتداد کے بعد باب اور بہاء اللہ اور قرۃ العین کے آستانہ تک پہنچادیتا ہے) واضح لفظوں میں مولوی محمد دیدار علی صاحب خطیب مسجد وزیر خاں اور وسط ہند کے سنّی علماء نے اقبال پر کھلے بندوں فتاویٰ کفر دیئے۔ مولوی دیدار علی کے فتویٰ کا متن اخبار زمیندار 15 اکتوبر 1925ء میں شائع شدہ ہے۔[35]

بالکل یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نماز جنازہ کسی سنّی عالم نے نہیں بلکہ کٹر شیعہ عالم سید علی الحائری نے پڑھائی۔[36]

ماہرین اقبالیات برسوں سے اس پریشان خیالی میں مبتلا ہیں کہ کلام اقبال میں بے حد تضاد ہے۔ حالانکہ اقبال 1906ء سے بہائی وبابی مذہب اختیار کر چکے تھے اور گستاخ رسول قرۃ العین طاہرہ کے اول نمبر کے پرستاروں میں سے تھے۔ یہی ان کا باطنی دین تھا جو اول سے آخر تک قائم رہا جس سے کبھی ان کے قلم سے انکار ثابت نہیں کیا جاتا۔ بایں ہمہ اسلام اور مسلمانوں کی بابت جو کچھ بھی ان کے قلم سے نکلا اس کو بہائیت ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور وہ دین بہائی کے اس بنیادی اصول کی عکاسی کرتا ہے کہ ہر مسلمان، سکھ، ہندو، عیسائی، یہودی، پارسی حتّٰی کہ ہریجن یا دہریہ بھی اپنے اپنے ذاتی خیالات پر رہتے ہوئے بھی خود بخود بہائی بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بہاء اللہ پر ایمان رکھے۔ پس سر اقبال کے حقیقی خدوخال صرف آئینہ بہائیت میں نمایاں ہوسکتے ہیں اور اسلام اور مسلمان کا نام وہ عمر بھر اپنی فلسفیانہ اصطلاح میں استعمال کرتے رہے کہ دونوں چیزیں دشمن زمانہ ہیں۔

علامہ اقبال کیمبرج یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے جہاں 1902ء کے بعد براؤن (متوفّٰی 16 جنوری 1926ء) جیسا معروف مستشرق بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دے رہا تھا۔ براؤن نے بابی اور بہائی دین پر وقیع کام کیا ہے۔ اس نے 1891ء میں امر بہائی کے بانی بہاء اللہ سے عکہ میں ملاقات کی تھی۔ وہ نودن ان کا مہمان رہ چکا تھا۔ اس لئے بعید نہیں کہ علامہ اقبال نے براؤن وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہو۔ علامہ اقبال براؤن کے مداح تھے۔ براؤن کی وفات پر انہوں نے قطعہ تاریخ بھی کہا تھا۔[37]

تا بہ فردوس بریں ماوی گرفت۔ گفت ہاتف "**ذالک الفوز العظیم**"

علامہ اقبال نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ فلسفہ ایران پر قلم بند کیا تھا جس کا اردو ترجمہ ''فلسفہ عجم'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالہ کے لئے انہوں نے براؤن کو لیکشن سے استفادہ کیا۔ جہاں بابی تحریک پر کافی لٹریچر موجود ہے۔

علامہ اقبال نے اس مقالہ میں باب، بہاء اللہ اور ان کی تعلیمات کی تعریف کی ہے۔ این میری شمل لکھتی ہیں۔

> ''اس مقالہ کا آخری حصہ اس تجزیہ پر مشتمل ہے جو اس نے مسٹر فلیپ کی کتاب ''عباس آفندی سوانح و تعلیمات'' مصنّفہ 1902ء سے لیا ہے۔'' اقبال اس کا خود ذکر کرتے ہیں۔ خاص طور سے ''فلسفہ و نفسیات'' والا باب اسی سے ماخوذ ہے۔ ان کا آخری ایام کا فلسفہ امر بہائی کے بنیادی نظریات سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔''38

علامہ اقبال فلسفہ عجم (انگریزی) میں فرماتے ہیں:

> ''لیکن فلسفہ عجم کے سارے مختلف دھارے ایک دفعہ پھر ایران جدید کی اس عظیم دینی تحریک بابی ازم و بہائی ازم میں آکر مل گئے تھے۔ جس کا آغاز سید علی محمد باب (متولد 1819) کے ظہور سے شیعہ فرقے کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن یہ تحریک بڑھتے ہوئے متعصبانہ قتل عام کے باعث اپنے کردار میں کم سے کم اسلامی ہوتی گئی۔''39

مرحوم اسفندیار بختیاری اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ: ''میں نے مار تھاروٹ اور علامہ اقبال کا ہم شہری اور ہم جماعت پروفیسر پریتم سنگھ (دیال سنگھ کالج) کی معیّت میں 22 جون 1930ء کو علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ جناب قرۃ العین طاہرہ کے کلام کا مجموعہ ''تحفہ طاہرہ'' اور ''بہاء اللہ و عصر جدید'' ان کی خدمت میں پیش کی۔ علامہ نے یہ دونوں کتابیں شوق سے قبول کیں اور مطالعہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے اپنے لیکچروں کا مجموعہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' مار تھاروٹ کو پیش کیا تا کہ آئندہ ملاقات میں اس پر گفتگو ہو سکے۔ تین اشخاص پر مشتمل یہی وفد 24 جون کو دوبارہ ان کی خدمت میں پیش ہوا۔ بختیاری لکھتے ہیں کہ: اس مرتبہ اقبال پہلے دن سے زیادہ مسرور نظر آتے تھے۔ آپ نے امریکن خاتون مار تھاروٹ کا بیحد احترام کیا۔ دوران گفتگو علامہ نے بتایا کہ وہ ایک کتاب میں قرۃ العین طاہرہ کا ذکر کریں گے جو زیر تنظیم ہے۔ آج کی ملاقات کے دوران مار تھاروٹ نے علامہ کو بتایا کہ ان خطبات

میں جدید عہد کے مسائل کا حل نہیں ملتا۔اس پر علامہ مسکرا دیئے اور فوراً موضوع گفتگو تبدیل کر لیا۔40

چنانچہ "جاوید نامہ" میں جو 1932ء میں شائع ہوا، آپ نے جناب طاہرہ کو "خاتون عجم" کا لقب دیا اور "تحفہ طاہرہ" میں درج وہ غزل بھی دی جس کا مطلع ہے۔

گر بتو افتدم نظر چہرہ بچہرہ روبرو

شرح دھم غم ترا نکتہ بہ نکتہ موبہ مو

علامہ اقبال جناب قرۃ العین طاہرہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جاوید نامہ کے فلک مشتری پر وہ حسین بن منصور حلاج، غالب اور طاہرہ کو یکجا دکھاتے ہیں۔ وہ "حضرت طاہرہ" کو شجاعت وشہادت اور انقلاب کا سمبل سمجھتے تھے۔ ان تینوں میں صفت مشترک یہ تھی کہ وہ قدیم نظام کے خلاف اور جدید آئین حیات کے علم بردار تھے۔ اقبال تینوں کو "ارواح پاکباز" کا لقب دیتے ہیں۔

پیش خود دیدم سہ روح پاکباز

آتش اندر سینہ شان گیتی گداز

غالب و حلاج و خاتون عجم

شورہا افگندہ در جان حرم

غالب کا پیغام

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم

قضا بگروش رطل گران بگردانیم

طاہرہ کا پیغام

شوق بیحد پردہ ہارا بردرد

کہنگی را از تماشا می برد

آخر از دار و رسن گیرد نصیب

برنگردد زندہ از کوئے حبیب41

یادرہے کہ علامہ اقبال جناب طاہرہ کے مقام وکلام سے بہت پہلے یعنی بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں واقف ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر بانگ درا کی نظم "میں اور تو" ملاحظہ ہو جس کا پہلا شعر ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا

میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوہ آزری

یہ نظم قرۃ العین طاہرہ کی اس مشہور غزل کی بحر میں کہی گئی ہے جس کا بیت الغزل یہ شعر ہے:

تو و ملک وجاہ سکندری من ورسم راہ قلندری

اگر آن نیکوست تودر خوری وگر این بداست مرا سزا

اقبال نے طاہرہ کے الفاظ "سکندری" اور "قلندری" بھی اس نظم میں برتتے ہیں۔ بلکہ نظم کا عنوان بھی طاہرہ کے اس شعر سے لیا ہے:

بگذر ز منزل ماو من بگرنیں بملک فنا وطن

فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشاء[42]

اسی طرح "بال جبرئیل" کی نظم "جبرئیل وابلیس" کا یہ شعر بھی طاہرہ کی غزل کے تتبع میں کہا گیا ہے:

خضر بھی بے دست وپاالیاس بھی بے دست وپا

مرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جوبہ جو[43]

جس زمانے میں بہائی شاعر اور صحافی سید محفوظ الحق علمی لاہور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، علامہ اقبال سے مسلسل ملاقاتیں کرتے رہے۔ ان کی زبانی روایت ہے کہ لاہور ہوٹل کے سامنے روزنامہ "زمیندار" کا دفتر تھا۔ میں زمیندار کے دفتر میں جاتا اور پھر مولانا ظفر علی خان کے ہمراہ علامہ کے پاس چلے جاتے۔ علمی صاحب کی روایت ہے کہ علامہ اکثر کہا کرتے۔ میں باب کو شارع اعظم مانتا ہوں۔[44]

اس زمانے میں پروفیسر پریتم سنگھ بھی علامہ سے برابر ملاقات کرتے رہے۔ اس کے بعد بھی بہائی احباب آپ سے ملتے رہے۔ اقبال بہائی تعلیمات کی طرف اس قدر راغب ہوگئے تھے

کہ 1935ء میں وفات سے تین سال قبل یہ اعلان کر دیا تھا۔ میرے نزدیک قادیانیت سے بہائیت زیادہ ایمان دار ہے۔[45]

علامہ اقبال بنیادی طور پر فلسفی تھے۔ شاعر و مفکر ہونا ان کی ثانوی حیثیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حق کی تلاش و جستجو میں رہے۔ کچھ دیر کے لئے ایک چمکدار پتھر کو ہیرا سمجھ لیا اور پھر اسے پھینک کر اصل ہیرے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور آخر کار ان کو ماننا پڑا کہ امر بہائی حق ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں.... فلسفہ کی روح ہے آزادانہ تحقیق۔ وہ ہر ایسی بات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے جس کی بناء ادعا اور تحکم پر ہو۔ اس کا منصب یہ ہے کہ فکر انسانی نے جو مفروضات بلا جرح و تنقید قبول کر رکھے ہیں، ان کے مخفی گوشوں کا سراغ لگائے۔[46]

جناب بہاء اللہ 16 نومبر 1817ء کو ایران کے پایہ تخت طہران میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ طہران نے آپ کے محل تولد ہونے کی وجہ سے عالم گیر شہرت پائی اور دنیا بھر کے اہل بہاء اس شہر کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جناب بہاء اللہ شہر طہران کی عظمت اور اس کے مستقبل کے بارے میں کتاب "الاقدس" میں اس طرح فرماتے ہیں:

"اے طہران کی زمین! کسی چیز سے مغموم نہ ہو۔ اللہ نے تجھے سب جہانوں کا مطلع فرح بنایا ہے۔ جب خدا چاہے گا تو تیرے تخت کو ایسے وجود سے بابرکت بنائے گا جو عدل کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور خدا کی ان بھیڑوں کو اکٹھا کرے گا جو بھیڑیوں کے ڈر سے پراگندہ ہو گئی ہیں۔ وہ اہل بہاء سے مسرت و شادمانی سے ملے گا۔ وہ خدا کے نزدیک مخلوق کا جوہر ہو گا۔ اس پر ہر گھڑی خدا اور ملکوت الامر والوں کی طرف سے بہاء ہو۔ تو خوش ہو کہ اللہ نے تجھ کو افق نور بنایا۔ کیونکہ تجھ میں مطلع ظہور پیدا ہوا اور تجھے وہ نام دیا گیا جس کے ذریعے سے آفتاب فضل چمک اٹھا اور آسمان وزمین روشن ہو گئے۔ عنقریب تیرے سارے امور میں انقلاب آجائے گا اور تجھ پر جمہور کی حکومت ہو گی۔ تیرا رب جاننے والا اور احاطہ کرنے والا ہے۔ اپنے رب کے فضل پر مطمئن رہ کیونکہ تجھ سے الطاف کی نظریں منقطع نہ ہوں گی۔ اضطراب کے بعد تجھے اطمینان حاصل ہو گا۔ کتاب بدیع میں اسی طرح فیصلہ کیا گیا ہے۔"[47]

اقبال نے طہران کے بارے میں اس بشارت آسمانی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

طہراں ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا

شاید کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

جناب بہاء اللہ نے جس سلطان عادل کے ظہور کا وعدہ فرمایا ہے، اقبال اس کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

می رسد مردی کہ زنجیر غلامی بشکند

دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما48

جناب ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب نے اپنے تحقیقی مقالہ کے اضافہ شدہ دوسرے ایڈیشن میں سید محفوظ الحق علمی صاحب (بہائی لیڈر) کا حسب ذیل بیان بھی شائع کیا:

"1932ء میں بہائی میگزین لاہور سے نکلتا تھا اور کشمیر بلڈنگ میں دفتر تھا جو اس وقت لاہور ہوٹل ہے۔ڈاکٹر اقبال مرحوم میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے اور مولانا ظفر علی صاحب اپنے دفتر اخبار "زمیندار" میں تشریف رکھتے تھے۔ تمام سال میں کافی مرتبہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے پاس جانا ہوا۔ ادھر سے مولانا ظفر علی خان صاحب آجاتے تھے اور کشمیر بلڈنگ سے ہم دونوں ساتھ جاتے تھے اور ساتھ ہی واپس آجاتے تھے۔ اس مجلس میں اکثر امر بہائی پر بھی علمی گفتگو ہوتی تھی۔ڈاکٹر اقبال مرحوم عموماً امری باتوں کی تائید کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے بڑے پُر زور لہجے میں کہا کہ میں سید باب کو شارع اعظم سمجھتا ہوں۔ اس قسم کی باتیں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ اس مجلس میں ایک دن مولانا ظفر علی خان صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: "علمی صاحب! آج ختم نبوت کے بارے میں بہائی نقطۂ نظر کی وضاحت کیجئے۔" میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "قانون قدرت کے مطابق ہر چیز جس کی ابتداء ہے، اس کی انتہا بھی ہے، دور نبوت کا آغاز آدم سے ہوا اور حضرت خاتم ﷺ پر ختم ہو گیا۔ لیکن قانون ارتقاء کے مطابق ایک عظیم دور کا آغاز ہوا۔ اس کی خبر دورِ نبوت بڑی شان سے دیتا رہا تھا۔ اس دور کو قرآن مجید میں "اجل اللہ" اور "الیوم الموعود" کہا گیا ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی دور ہے۔ توحید الٰہی کے زیر سایہ عالم انسانی کی وحدت پورے طور پر قائم ہو گی۔ اس دور کی بشارت

دورِ نبوت نے دی اور جو اپنا کام کر کے ختم ہو گیا۔ اب نبوت کے نام سے کوئی نہیں آئے گا۔ تفصیل سے یہ بیان (اقبال کی موجودگی میں) دیا گیا۔" جناب مولانا ظفر علی خان صاحب نے کہا: "ڈاکٹر صاحب بہائیت تو بڑا علمی سلسلہ ہے!" اس پر ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا: "میں تو آپ سے پہلے ہی کہتا تھا کہ بہائیت ایک مستقل علمی امر ہے۔" اور میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ "جو بات انہوں نے کہی ہے یہ تقریباً وہی ہے جو میں نے اپنے اس قصیدہ میں لکھی ہے جو سیالکوٹ میں پڑھا تھا اور آپ نے اسے دکن ریویو میں شائع کیا تھا"[49] اور ڈاکٹر صاحب نے ایک شعر بھی پڑھا جس میں اس قسم کے خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ نبوت اپنا کام ختم کر چکی اور اب دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔"[50]

بہائی اصول کے عین مطابق سر اقبال کا اخفاء

جیسا کہ میرزا حیدر علی اصفہانی (متوفّٰی 1920ء) نے اپنی کتاب بہجۃ الصدور صفحہ 83 (مطبوعہ بمبئی مارچ 1914ء) میں لکھا ہے۔ بہاء اللہ (1892-1817ء) کی بنیادی ہدایت ہے کہ اپنا مذہب چھپائے رکھو۔ اس بہائی اصول کے مطابق سر اقبال نے اپنا بہائی مذہب چھپائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے جگری دوست اور گہرے رازدان سید محفوظ الحق علمی صاحب مبلغ بہائیت (1978-1894ء) کے اس "تبلیغی کارنامہ" کو مشعل راہ بنایا ہے کہ وہ "باب الحیات" کے اردو ایڈیشن کی اشاعت (1908ء) کے معاً بعد جناب میرزا محمود زرقانی سے متاثر ہو کر خفیہ طور پر بہائی ہوئے۔ بعد ازاں وہ جولائی 1918ء سے مارچ 1924ء تک احمدیت کا لبادہ اوڑھ کر منافقانہ طور پر بہائی خیالات پھیلاتے رہے[51] اور جب تک یہ ناپاک سازش بے نقاب نہیں ہو گئی وہ انڈر گراؤنڈ بہائیت کا پوری گرم جوشی سے پرچار کرتے اور بہائی ہونے والوں کو مخفی رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ انہوں نے تحقیقاتی کمیشن کے سامنے بیان دیا کہ میں بہائی ہوں۔ شریعت جدیدہ کا ظہور ہو چکا ہے۔ رمضان کے اسلامی روزے اب فرض نہیں رہے اور کعبہ کی بجائے عکہ قبلہ ہے۔ علمی صاحب نے بعد میں اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لئے کئی داستانیں وضع کر لیں مگر تحقیقاتی کمیشن کو انہوں نے اصل واقعہ صرف یہی بتایا کہ وہ کہلاتے احمدی رہے مگر خفیہ طور پر بہائیت کی تائید میں تین چار سال سے ایک کتاب لکھنے کی تیاری کر رہے تھے۔[52]

علمی صاحب کی منافقت کا پردہ تو انہی کے ہاتھوں چاک ہو گیا۔ لیکن جناب اقبال کے کمال اخفا کی داد دینا چاہئے کہ وہ عمر بھر روح بہائیت سے سرشار رہنے کے باوجود آخر دم تک مسلم فلاسفر کا لبادہ اوڑھے رہے اور اپنے ذو معنی الفاظ، پہلو دار اصطلاحات اور استعارات و مجازات کے ذریعہ اپنی بہائیت کو چھپانے میں کامیاب ہو گئے۔[53]

سر اقبال کی وفات کے کچھ عرصہ بعد جبکہ پاک وہند میں اقبالیات پر وسیع پیمانہ پر لٹریچر چھپنا شروع ہوا اور سرکاری سطح پر اقبالیات کی اشاعت کی سرپرستی شروع ہو گئی تو بہائی حلقے جو اب تک مصلحتاً خاموش نظر آتے تھے، یکایک میدان میں آ گئے۔ اور بابیت اور بہائیت سے اقبال کی پوشیدہ والہانہ عقیدتوں کی پوری داستان پبلک کے سامنے رکھ دی۔ اقبال فرمایا کرتے تھے

پوچھتے کیا ہو مذہب اقبال

یہ گنہ گار بوترابی ہے[54]

لیکن اب انہیں "پیغمبر گلشن" اور "رسول چمن"[55] بنایا جا چکا تھا اس لئے ان کے پرستاروں کو قرۃالعین طاہرہ کی زلفوں کا اسیر بنا کر بآسانی بہائیت کی چوکھٹ پر سجدہ ریز کیا جا سکتا تھا اور چونکہ سر اقبال 1935ء میں تحریک احمدیت کے مقابل بہائیت کو دیانت دار ہونے کا اعلانیہ سرٹیفکیٹ دے چکے ہیں اس لئے بہائیوں کا ختم نبوت محمدیہ[56] ہی کا نہیں قرآنی شریعت کے خاتمہ کا جشن اقبالیات کی آغوش میں منانے کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔

سر اقبال فرماتے ہیں:

"جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں خیال کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس سے بغاوت کرتی ہے۔"[57]

اقبالیات کے عمیق مطالعہ سے یہ راز طشت ازبام ہو جاتا ہے۔ سر اقبال کی بغاوت کا آغاز 1901ء سے ہوا جبکہ انہوں نے دنیا کو جدید معاشرتی نظام سے متعارف کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ چنانچہ آپ نے "اسرار خودی" کے انگریزی مترجم اور کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نکلسن کے نام 24 فروری 1921ء کو ایک خصوصی مکتوب لکھا۔[58]

"میں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس طویل عرصے نے

مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات وواقعات پر غیر جانبدارنہ حیثیت سے غور کر سکوں۔ میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب وجستجو59 تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عملاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام (یعنی اسلام ناقل) سے قطع تعلق کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات رتبہ ودرجہ رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔"60

اس خط میں انہوں نے آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک سے اب تک کی مسلم مملکتوں کی نسبت یہ رائے دی کہ:-

"اسلام کو جہاں سنانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بے حد مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اصول نشوونمانہ پاسکے جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جابجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔"61

سر اقبال جیسے قادر الکلام اور فلسفی شاعر نے خود ہی اپنی باطنی بغاوت کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت روایات میں کھوگئی
یہ امت خرافات میں کھوگئی62

ماہر اقبالیات خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے لیکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور کی تحقیق یہ ہے کہ:-

"اقبال کہتا ہے کہ مرد کامل نہ صرف مادی دنیا پر حاوی ہو کر اسے جذب کر لیتا ہے بلکہ وہ تو ربّانی صفات کا اکتساب کر کے خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے۔"63

یہ تخیل سراسر بہائیت کی پیداوار ہے جس سے ہم آہنگ ہو کر سر اقبال نے یہ نظریہ پیش کیا:-

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات میں جذبہ الوہیت جاری وساری ہے.... اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل واعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں جلوہ گر ہو گی۔"[64]

بہائی مورخ مسٹر ایڈورڈ۔جی۔ براؤن(Mr. Edward. G. Brown) نے تاریخ ادبیات فارس (A Literary History of Persia) کی چوتھی جلد کے صفحہ 430پر ڈاکٹر سر اقبال کی تالیف مابعد الطبیعات کے حوالہ سے ان کے نظریہ مذہب بابی سے کلی طور پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔[65]

مسٹر براؤن کے الفاظ یہ ہیں:

"Matu'l-'Arshiyya and the Masha'ir. Shaykh Muhammad Iqbal is therefore probably right when he says that "the Philosophy of Sadra is the source of the metaphysics of early Babaiism," and that "the origin of the philosophy of this wonderful sect must be sought in the Shi'a sect of the Shaykhis, the founder of which, Shaykh Ahmad, was an enthusiastic student of Mulla Sadra's philosophy, on which he had written several commentaries."

مذہب اقبال اور تحریک احمدیت کا بنیادی فرق

در حقیقت مذہب اقبال کا روح رواں جدید معاشرتی نظام ہے جو امر بہائی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس تحریک احمدیت کی بنیاد ہی اس الہامی نظریہ پر ہے کہ:-

"اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ فِیْ الْقُرْآنِ۔ لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ"

یہ الہام حضرت مسیح موعود بانی سلسلہ احمدیہ پر1883ء میں نازل ہوا۔ جسے آپ نے اپنی پہلی شہرہ آفاق کتاب "براہین احمدیہ"(صفحہ 511-513) میں شائع فرمادیا اور اس کا ترجمہ اپنے قلم سے یہ لکھا کہ

"تمام خیر اور بھلائی قرآن میں ہے۔ بجز اس کے اور کسی جگہ سے بھلائی نہیں مِل سکتی اور قرآنی حقائق صرف انہیں لوگوں پر کھلتے ہیں جن کو خدائے تعالیٰ اپنے

ہاتھ سے صاف اور پاک کرتا ہے۔“

اسی کتاب میں آپ نے دس ہزار روپیہ کا انعامی اشتہار دیتے ہوئے اعلان فرمایا کہ

”اگر کوئی شخص ایک ذرّہ کا ہزارم حصہ بھی قرآن شریف کی تعلیم میں کچھ نقص نکال سکے یا بمقابلہ اس کے اپنی کسی کتاب کی ایک ذرہ بھر کوئی ایسی خوبی ثابت کرسکے جو قرآنی تعلیم کے برخلاف ہو اور اس سے بہتر ہو تو ہم سزائے موت بھی قبول کرنے کو طیار ہیں۔“66

نیز تحدّی کے ساتھ فرمایا:

”آج صفحہ دنیا میں وہ شے جس کا نام توحید ہے۔بجز امتِ آنحضرت ﷺ کے اور کسی فرقہ میں نہیں پائی جاتی اور بجز قرآن شریف کے اور کسی کتاب کا نشان نہیں ملتا کہ جو کروڑہا مخلوقات کو وحدانیت الٰہی پر قائم کرتی ہو اور کمال تعظیم سے اس سچے خدا کی طرف رہبر ہو ہر یک قوم نے اپنا اپنا مصنوعی خدا بنا لیا اور مسلمانوں کا وہی خدا ہے جو قدیم سے لازوال اور غیر مبدل اور اپنی ازلی صفات میں ایسا ہی ہے جو پہلے تھا۔“67

حضرت اقدسؑ نے اس کتاب کے حصہ سوم کے صفحہ 206 پر قرآن کو ناقص سمجھنے والوں (برہمو سماجیوں، بابیوں اور بہائیوں) کو کھلا چیلنج دیا۔

”جس حالت میں تیرہ سو برس سے قرآن شریف بآواز بلند دعویٰ کر رہا ہے کہ تمام دینی صداقتیں اس میں بھری پڑی ہیں۔ تو پھر یہ کیسا خبث طینت ہے کہ امتحان کے بغیر ایسی عالیشان کتاب کو ناقص خیال کیا جائے۔ اور یہ کس قسم کا مکابرہ ہے کہ نہ قرآن شریف کے بیان کو قبول کریں اور نہ اسکے دعویٰ کو توڑ کر دکھلائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے لبوں پر تو ضرور کبھی کبھی خدا کا ذکر آجاتا ہے۔ مگر ان کے دل دنیا کی گندگی سے بھرے ہوئے ہیں۔... گھر میں بیٹھ کر اس کامل کتاب کو ناقص بیان کرتے ہیں۔ جس نے بوضاحت تمام فرمادیا۔ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ۔ الجزو نمبر ٦۔ یعنے آج میں نے اس کتاب کے نازل کرنے سے علم دین کو مرتبہ کمال تک پہنچادیا۔ اور اپنی تمام نعمتیں ایمانداروں پر پوری کردیں۔ اے حضرات کیا تمہیں کچھ بھی خدا کا خوف نہیں؟ کیا تم ہمیشہ اسی طرح جیتے

رہو گے؟ کیا ایک دن خدا کے حضور میں اس جھوٹے منہ پر لعنتیں نہیں پڑیں گی؟
اگر آپ لوگ کوئی بھاری صداقت لئے بیٹھے ہیں جس کی نسبت تمہارا یہ خیال ہے کہ
ہم نے کمال جانفشانی اور عرق ریزی اور موشگافی سے اس کو پیدا کیا ہے اور جو تمہارے
گمانِ باطل میں قرآن شریف اس صداقت کے بیان کرنے سے قاصر ہے تو تمہیں
قسم ہے کہ سب کاروبار چھوڑ کر وہ صداقت ہمارے روبرو پیش کرو۔ تا، ہم تم کو قرآن
شریف میں سے نکال کر دکھلا دیں۔ مگر پھر مسلمان ہونے پر مستعد رہو اور اگر اب
بھی آپ لوگ.... مناظرہ کا سیدھا راستہ اختیار نہ کریں۔ تو بجز اس کے اور کیا کہیں کہ
لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْن۔"

حضرت اقدس مسیح موعودؑ نے یہ انعامی چیلنج اس زمانہ میں دیا جبکہ باب[68] اپنی جعلی شریعت "البیان" کو بالکل ادھورا چھوڑ کر ناکامی اور نامرادی میں قتل ہو چکا تھا اور اس کے وصی میرزا یحیٰ[69] صبح ازل اور میرزا حسین علی[70] (باب کی طرف سے بہاء اللہ سے ملقب) دونوں نے البیان کو منسوخ قرار دے دیا اور قلمی نسخے خود بابیوں نے تلف کر دیئے۔ اس طرح باب اور قرۃ العین طاہرہ نے 1863ء میں تنسیخ قرآن کی جو انتقامی سازش کی تھی، اپنے منطقی انجام تک پہنچی اور مذہب کو بازیچہ اطفال بنانے والے سب کردار بالکل بے نقاب ہو گئے۔

علاوہ ازیں ذلت و رسوائی کا غیبی سامان یہ بھی ہوا کہ باب کے دونوں جانشینوں نے ایک دوسرے کا حریف بن کر اپنی اپنی شریعتیں خود تصنیف کر لیں۔ چنانچہ صبح ازل نے **المستیقظ** لکھی اور بہاء اللہ نے **الاقدس**۔[71] باب کے یہ نام لیوا زندگی بھر ایک دوسرے کو دجال کہتے رہے اور کسی کو مرتے دم تک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا چیلنج قبول کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بہاء اللہ کی وفات کے بعد 1892ء میں اس کا بڑا بیٹا عبدالبہا عباس آفندی جانشین قرار پایا اور 1921ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ اسی شخص کے زمانہ میں ڈاکٹر سر اقبال بہائیت کی دہلیز تک پہنچے۔ حضرت مصلح موعود نے 1917ء میں عبدالبہاء اور دوسرے مذہبی لیڈروں کو للکارا کہ اسلام ہی زندہ مذہب ہے۔ کوئی دوسرا مذہب اس کے مقابل نہیں ٹھہر سکتا کوئی نہیں جو قبولیت دعا کا نشان دکھلا سکے۔[72] مگر کسی نے مرد میدان بننے کی جرأت نہیں کی کجا یہ کہ حضرت مسیح موعود کا چیلنج قبول کر سکتا۔

الغرض حضرت مسیح موعودؑ نے قرآن مجید کی حقانیت سے متعلق 1883ء میں جو فیصلہ کن چیلنج دیا اسے حضرت مسیح موعودؑ کے یوم وصال 26 مئی 1908ء تک کوئی بابی یا بہائی لیڈر قبول نہیں کر سکا۔

بایں ہمہ حضرت اقدس نے اپنی آخری سانس تک جہاد القرآن کا سلسلہ پوری قوت و شوکت کے ساتھ جاری رکھا۔ چنانچہ فرمایا:

"مجھ پر کھلا کہ اس مبارک لفظ میں زبردست پیشگوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہی قرآن یعنی پڑھنے کے لائق کتاب ہے اورایک زمانہ میں تواور بھی زیادہ پڑھنے کے قابل کتاب ہوگی جبکہ اور کتابیں بھی پڑھنے میں اس کے ساتھ شریک کی جائیں گی، اس وقت اسلام کی عزت بچانے کے لئے اور بطلان کا استیصال کرنے کے لئے یہی ایک کتاب پڑھنے کے قابل ہوگی.... اس وقت قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لوتو تمہاری فتح ہے۔اس نور کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہ سکے گی۔"73

حضور کی پُر معارف کتاب "چشمہ معرفت" اس موضوع پر تھی جو15 مئی 1908ء کو شائع ہوئی۔اس کتاب نے پوری تحدّی کے ساتھ اعلان کیا۔

"ایسے زمانے میں نئی شریعت نازل ہوتی ہے۔ جبکہ نوع انسان پہلے زمانہ کی نسبت بدعقیدگی اور بدعملی میں بہت ترقی کر جائے اور پہلی کتاب میں ان کے لئے کافی ہدایتیں نہ ہوں لیکن یہ امر ثابت شدہ ہے کہ قرآن شریف نے دین کے کامل کرنے کا حق ادا کردیا ہے۔ جیساکہ وہ خود فرماتا ہے۔ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا (المائدہ:4ناقل) یعنی آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔اور میں اسلام کو تمہارا دین مقرر کر کے خوش ہوا۔ سو **قرآن شریف کے بعد کسی کتاب کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں کیونکہ جس قدر انسان کی حاجت تھی وہ سب کچھ قرآن شریف بیان کرچکاہے۔** اب صرف مکالمات الٰہیہ کا دروازہ کھلا ہے اوروہ بھی خود بخود نہیں بلکہ سچے اور پاک مکالمات جو صریح اور کھلے طور پر نصرت الٰہی کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اور بہت سے امور غیبیہ پر مشتمل ہوتے ہیں وہ بعد تزکیہ نفس **محض پیروی قرآن شریف اور اتباع آنحضرت ﷺ سے حاصل ہوتے ہیں۔**"74

اسی پر بس نہیں حضورؑ نے اپنے وصال (26 مئی 1908ء) سے صرف چند روز قبل یہ پیشگوئی فرمائی۔

"میرا بڑا حصہ عمر کا مختلف قوموں کی کتابوں کے دیکھنے میں گزرا ہے۔ مگر میں

سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے کسی دوسرے مذہب کی تعلیم کو خواہ اس کا عقائد کا حصہ اور خواہ اخلاقی حصہ اور خواہ تدبیر منزلی اور سیاست مدنی کا حصہ اور خواہ اعمال صالحہ کی تقسیم کا حصہ ہو، قرآن شریف کے بیان کے ہم پہلو نہیں پایا۔ اور یہ قول میرا اس لئے نہیں کہ میں ایک مسلمان شخص ہوں۔ بلکہ سچائی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں گواہی دوں اور یہ میری گواہی بے وقت نہیں۔ بلکہ ایسے وقت میں جب کہ دنیا میں مذاہب کی کشتی شروع ہے۔ مجھے خبر دی گئی ہے کہ اس کشتی میں آخر اسلام کو فتح ہے۔ میں زمین کی باتیں نہیں کہتا۔ کیونکہ میں زمین سے نہیں ہوں۔ بلکہ میں وہی کہتا ہوں جو خدا نے میرے منہ میں ڈالا ہے۔ زمین کے لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ شاید انجام کار عیسائی مذہب دنیا میں پھیل جائے یا بدھ مذہب دنیا پر حاوی ہو جائے۔ مگر وہ اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ یاد رہے کہ زمین پر کوئی بات ظہور میں نہیں آتی جب تک وہ بات آسمان پر قرار نہ پائے۔ سو آسمان کا خدا مجھے بتلاتا ہے کہ آخر اسلام کا مذہب دلوں کو فتح کرے گا۔"[75]

پھر اپنے آخری مکتوب 23 مئی 1908ء میں یہ تحریر کر کے بالخصوص بابیوں اور بہائیوں پر اتمام حجت کر دی کہ

"میری گردن اس جوئے کے نیچے ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا اور کسی کو مجال نہیں کہ ایک نقطہ یا ایک شوشہ قرآن شریف کا منسوخ کر سکے۔"[76]

سر اقبال صاحب سیدنا حضرت مسیح موعود کے وصال کے بعد تیس سال تک بقید حیات رہے۔ لیکن اپنی تمام تر دماغی صلاحتوں کو بروئے کار لانے کے بعد حضرت مسیح موعودؑ کے 1883ء کے چیلنج کے جواب میں ایک حرف تک نہ کہہ سکے۔ اور نہ قرآن مجید کے کسی ایک حکم کی بھی نشان دہی کرنے میں کامیاب ہو سکے جسے عصر حاضر میں بدلنے کی ضرورت ہو اور ان کے جدید معاشرتی نظام کی بنیاد بن سکے۔ یہ ہے قرآن کی علمبردار تحریک احمدیت کے مقابل مذہب اقبال کا اصل اور حقیقی چہرہ جس کو اقبال کے پرستار نہاں در نہاں مصلحتوں کے باعث آج تک دبیز پردوں میں چھپائے بیٹھے ہیں۔

حواشی:

1 "روس میں مسلمان قومیں" صفحہ 100۔

2 Dawn Over Samarkand op. cit. p. 181 بحوالہ "روس میں مسلمان قومیں" صفحہ ۴۱۲۔۴۱۳۔

3 بحوالہ "روس میں مسلمان قومیں "صفحہ 413۔

4 ناشر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور طبع دوم ستمبر 1986ء۔

5 مشرقی ترکستان صفحہ ۹۲ تا۹۷ تالیف عیسٰی یوسف الپتیکن، ترجمہ و تلخیص اور حواشی جناب ثروت صولت صاحب، ناشر اسلامک پبلیکیشنز، شاہ عالم مارکیٹ لاہور اشاعت اول مئی ۱۹۸۷ء۔

6 ازبکستان کا شاعر عبدالحمید سلیمان (1898ء تا 1938ء) جو چوپلان (ستارہ صبح) کے تخلص سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ ازبکستان کا ممتاز شاعر، ناول نگار اور ڈرامہ نگار تھا۔ 1938ء میں قوم پرستی کے الزام اور اشتراکیت دشمنی کے جرم میں پھانسی دے دی گئی اور اس کی کتابوں کو سوویت یونین میں شائع کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

7 "تاریخ مدینہ "ترجمہ جذب القلوب صفحہ ۱۲۶۔۱۲۸ مترجم مولوی محمد صادق صاحب بہاولپوری۔ ناشر نوری بک ڈپو لاہور طبع اول ۱۹۸۸ء۔

8 "خود نوشت "صفحہ ۲۹۰ تا ۲۹۶، از ابوالکلام آزاد، ناشر ارشد بک سیلرز۔ علّامہ اقبال روڈ، میر پور آزاد کشمیر۔

9 رسالہ بہائی میگزین کراچی جنوری فروری ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۸۔۱۹۔

10 مقدمہ "تتمہ البیان لمشکلات القرآن "مشمولہ کتاب "مشکلات القرآن "مؤلفہ محمد انور شاہ کشمیری ناشر مطبوعات المجلس العلمی۔ مطبع جمال پریس دہلی۔

11 "تبرکات آزاد "صفحہ ۱۸۵ مرتب غلام رسول مہر ناشر کتاب منزل لاہور۔ جولائی ۱۹۵۹ء۔

12 حجج الکرامۃ (نواب صدیق حسن خاں) صفحہ 133۔

13 ایضاً صفحہ 135 تا 139۔

14 "ÀیÀÇáÇáãÇÊیÇáÊÝÀ" جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ ناشر اکاڈمی شاہ ولی اللہ حیدر آباد۔ پاکستان۔

15 مستدرک للحاکم عن انسؓ ایضاً مسند احمد بن حنبل۔

16 "ÀیÀÇáÇáãÇÊیÇáÊÝÀ" جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ ناشر اکاڈمی شاہ ولی اللہ حیدر آباد۔ پاکستان۔

17 تبرکاتِ آزاد صفحہ ۱۸۶۔

18 تبرکات آزاد صفحہ ۱۹۲۔

19 تبرکات آزاد صفحہ ۵۶ تا ۵۸۔

20 تبرکات آزاد صفحہ ۵۵۔

21 مسئلہ خلافت صفحہ ۱۹۴ ناشر خیابان عرفان کچہری روڈ لاہور۔

22 مسئلہ خلافت صفحہ ۱۸۰ (ابوالکلام آزاد)

23 دروس الدیانۃ درس نمبر ۱۹۔

24 ایضاً درس نمبر ۱۷۔ ادعیۃ محبوب ۸۱ تا ۸۴۔

25 ÇáÕÏæÑÃÌÀÈ صفحہ ۸۳ (از میرزا حیدر علی اصفہانی) مطبوعہ ۱۹۱۴ء۔

26 قبر گلستان جاوید لاہور میں ہے۔

27 تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "بہائی میگزین کا علمی نمبر "مطبوعہ ہفت روزہ بدر قادیان ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۵۔۶۔

28 ناشر ادبیات پوسٹ بکس نمبر 9 مظفر آباد آزاد کشمیر۔

29 صفحہ نمبر 6-5۔

30 صفحہ نمبر 7 خط عبداللہ چغتائی بنام مولف 16 مئی 1976ء۔

31 ایضاً بحوالہ امار ٹلز انگریزی صفحہ 114 مطبوعہ نئی دہلی 1988ء۔
32 مکاتیب اقبال جلد دوم صفحہ 271-270۔ مرتب سید مظفر حسین برنی ناشر اردو اکادمی دہلی۔ طبع دوم 1992ء۔
33 فلسفہ عجم (ترجمہ اردو) 431 مترجم میر حسن الدین بی اے، ایل ایل بی عثمانیہ۔ ناشر نفیس اکیڈمی کراچی۔
34 ایضاً صفحہ 245۔
35 بحوالہ "ذکر اقبال" صفحہ 129 از مولانا عبد المجید سالک ناشر بزم اقبال کلب روڈ لاہور اشاعت جون 1955ء۔
36 "اردو جامع انسائیکلوپیڈیا" جلد دوم صفحہ 109 ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور چیئر مین ایس اے رحمان۔ (مدیر اعلیٰ حامد علی خاں برادر مولوی ظفر علی خاں آف "زمیندار")
37 باقیات اقبال صفحہ 493 مرتب سید عبد الواحد معینی صاحب ایم اے ناشر آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور۔
38 دی بہائی فیتھ اینڈ اسلام۔ این میری شمل کینیڈا 1988ء۔
39 ڈویلپمنٹ آف میٹافزکس ان پرشیا (اقبال) اشاعت سوم لاہور 1964ء۔
40 صفحہ 22-21۔ بحوالہ نجم دری ترجمہ صابر آفاقی مطبوعہ کراچی 1964ء۔
41 صفحہ 23۔ بحوالہ جاید نامہ (اقبال)۔
42 صفحہ 23 بحوالہ "قرۃ العین طاہرہ" اشاعت سوم کراچی 1986ء۔
43 بحوالہ کلیات اقبال اردو صفحہ 122 مطبوعہ لاہور۔
44 زبانی روایت سید محفوظ الحق صاحب علمی۔ بہائی مبلغ۔
45 روزنامہ زمیندار 5 مئی 1935ء۔ (لاہور)
46 "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" صفحہ 1 مطبوعہ لاہور۔
47 الاقدس آیت 5۔ 102- مطبوعہ بمبئی۔
48 زبور عجم (اقبال)
49 مولف نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔
50 صفحہ 144-143 بحوالہ "بہائی میگزین" لاہور جولائی 1968ئ۔ (جدید ایڈیشن کی تاریخ اشاعت 14 اگست 1999ء)۔
51 تفصیل کیلئے دیکھئے مولف کا مقالہ مطبوعہ بدر قادیان 10 ستمبر 1980۔ اس مقالہ میں بہائی میگزین کراچی کے شمارہ جنوری فروری 1980 (علمی نمبر) پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مستند دستاویزی شواہد کی روسے ثابت کیا گیا ہے کہ نہ صرف حضرت مسیح موعود اور اکابر جماعت احمدیہ کی تاریخ بلکہ علمی صاحب سے متعلق اصل واقعات کو شرمناک حد تک مسخ کر ڈالا ہے۔
52 الفضل 29-25 اپریل 1924ء صفحہ 8-6۔
53 علامہ کا شعر ہے   فلسفہ و شعر کی اور حقیقت کیا ہے   حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو
54 باقیات اقبال صفحہ 573۔ مرتب سید عبد الواحد معینی ایم اے۔ ناشر آئینہ ادب۔ چوک مینار، انار کلی لاہور۔ بار سوم 1978ء۔
55 جناب عبد الکریم ثمر کا شعر ہے: وہی پیغمبر گلشن وہی رسول چمن   کلی کلی پہ نمایاں اسی کا حسن و جمال   رسالہ قندیل 24 اپریل 1955ء۔
56 مسلمانوں کا ایک کثیر طبقہ نبی اور رسول میں فرق کرتا ہے۔ ان کے نزدیک نبی وہ ہے جو پہلی شریعت ہی کا علمبر دار ہو اور رسول کے لئے نئی شریعت کا لانا ضروری ہے۔ اہل بہاء نے اسی غیر قرآنی نظریہ کو بنیاد بنا کر یہ عقیدہ اختراع کر لیا کہ آیت خاتم النبیین کے مطابق نبوت ختم ہو گئی مگر رسالت جاری ہے۔
57 مکتوب بنام اسلم جیراج پوری 17 مئی 1919ء۔ اقبال نامہ و کلیات مکتوبات اقبال جلد 2 صفحہ 94۔

58 اصل خط انگریزی میں تھا جس کا پہلا اردو ترجمہ جناب چراغ حسن حسرت نے کیا اور وہی اقبال نامہ میں شامل ہے۔

59 فارسی کلام: اسرار ورموز۔ پیام مشرق۔ زبور عجم۔ جاوید نامہ۔ پس چہ باید کرد۔ ارمغان حجاز۔

60 اقبال نامہ حصہ اول صفحہ 472۔ مکتوب بنام ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی ناشر شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور 1945ء۔

61 ایضاً صفحہ 471-470۔

62 "باقیات اقبال" صفحہ 493۔ بار سوم 1978ء۔ ناشر آئینہ ادب چوک انار کلی لاہور۔ اقبال نے حضرت حافظ شیرازی پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا:

نغمہ چنگش دلیل انحطاط — ہاتف او جبرئیل انحطاط

بے نیاز از محفل حافظ گذر — الحذر از گوسفنداں الحذر (ایضاً صفحہ 603)

63 رسالہ پیغام حق (اقبال نمبر)

64 مکتوب بنام ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی۔ یہاں یہ بتانا از بس ضروری ہے کہ بزرگان امت میں جن میں حضرت شاہ ولی اللہ جیسے اکابر صوفیاء بھی شامل ہیں، بروز کی اصطلاح صدیوں سے مروج چلی آرہی ہے جس کا ماخذ آیت "وآخرین منھم" (الجمعہ) ہے مگر سر اقبال کے نزدیک "یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے" (اقبال نامہ حصہ اول صفحہ 420-419)

65 رسالہ "پیغام حق" (اقبال نمبر) جنوری تا مارچ 1946ئ۔ صفحہ 181۔ مقام اشاعت ظفر منزل تاجپورہ لاہور۔

66 براہین احمدیہ حصہ دوم، حصہ سوم طبع اول صفحہ 269۔ حاشیہ در حاشیہ مطبوعہ سفیر ہند پریس 1880ء۔

67 ایضاً صفحہ 115۔

68 ولادت 1819ء۔ قتل 1850ء۔

69 وفات 1912ء۔

70 ولادت 1817ء۔ وفات 1892ء۔

71 الاقدس 1891-1890ء میں بمبئی سے پہلی بار خفیہ طور پر چھپی اور مدتوں تک بصیغہ راز رکھی گئی۔

72 الفضل 23 اگست 1917ء۔

73 الحکم 17 اکتوبر 1900ء صفحہ 5۔

74 صفحہ 72۔

75 "پیغام صلح" صفحہ 63-62 (آخری تالیف)

76 ہندو اخبار عام مورخہ 26 مئی 1908ء صفحہ 7۔ بحوالہ مجموعہ اشتہارات حضرت مسیح موعود جلد سوم صفحہ 597۔ الناشر الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ۔ جون 1975ء۔

اکیسویں فصل

مذہبی لیڈروں کی سیاست کاذکر حدیث میں

یہ حیرت انگیز امر اسلام کی صداقت کا چمکتا ہوا نشان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صدیوں قبل یہ خبر دی کہ آپ کی امت پر ایک ایسازمانہ آئے گا جب اس پر آفات و مصائب کا بادل چھاجائے گا اور وہ اپنی رہنمائی کے لئے اپنے مذہبی لیڈروں کے پاس جائیں گے مگر ان کی سیاست و قیادت جنگل کے ان جانوروں سے مشابہ ہو گی جو دوسروں کے اشارہ پر رقص کرتے اور نقالی کرسکتے ہیں یا وہ نجاست خور ہیں۔ اپنے حلیف پر جارحانہ حملہ کرتے ہیں اور اپنی بھوک مٹانے کے لئے اپنے بچوں ہی کو چٹ کر جاتے ہیں اور کھیت کو ویران اور برباد کر دینا ان کی ناپاک سرشت اور خصلت میں داخل ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اس پُراسرار حدیث کے الفاظ یہ تھے۔

"تکون فی امتی فزعة فیصیر الناس الی علماءھم فاذاھم قردة و خنازیر"[1]

یعنی میری امت پر ایک زمانہ اضطراب اور انتشار کا آئے گا۔ لوگ اپنے علماء (دینی رہنما) کے پاس بغرض راہ نمائی جائیں گے تو وہ انہیں بندروں اور سؤروں کی طرح پائیں گے۔

آنحضرت ﷺ کے اس بلیغ استعارہ کی حقیقت برٹش انڈیا کے آخری دور میں خوب بے نقاب ہو گئی جب کہ قائداعظم محمد علی جناح نے کانگرس کے کٹھ پتلی راشٹرپتی کو شوبوائے[2] کانام دیا اور انجمن حزب الاحناف لاہور کے بانی اور مسجد وزیر خاں کے خطیب ابو محمد سید دیدار علی شاہ[3] نے اقبال صاحب کے صریح طور پر کافر و فاسق ہونے کا فتویٰ دیا۔ جس کا مکمل متن ان کے فرزند جناب جسٹس جاوید اقبال صاحب نے اپنی کتاب "زندہ رود" جلد2 صفحہ 289-290 پر ہمیشہ کے لئے ریکارڈ کر دیا ہے۔

سر اقبال کے جن اشعار پر فتویٰ دیا گیا، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

"شاعر مشرق" سورج کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو

زائیدگان نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری

آزادِ قید اول وآخر ضیاء تری

موازنہ مذاہب کے سکالرز جانتے ہیں کہ ارض وسماء کے انادی (ازلی) ہونے کا عقیدہ صرف آریہ دھرم کی میتھالوجی کا جزو لاینفک نہیں بلکہ کارل مارکس اور دوسرے سوشلسٹ لیڈر جو پکے دہریہ تھے، بلا استثناء اسی خیال کے علمبردار رہے اور اسی بناء پر انہوں نے مذہب کو افیون قرار دے کر اسے صفحہ ہستی سے نابود کرنے میں اپنی تمام تر صلاحتیں اور قوتیں وقف کر دیں۔ بابیت چونکہ قدیم وجدید اشتراکیت ہی کے امتزاج کا نام ہے اس لئے سر اقبال نے بابیوں اور بہایوں کی ہم نوائی میں اسلامی تصور قیامت پر فریب کی پھبتی کسی اور نہایت بے باکی اور بے حجابی سے اعلان کیا۔

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شئ میں ہے ہماری کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

"علامہ" اس فتویٰ پر اظہار ندامت کرنے کی بجائے اور بھی زیادہ شوخ ہو گئے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہا۔

عیاں ستارے، ہویدا فلک، زمیں پیدا
تری خدائی تو پیدا ہے تو نہیں پیدا[4]

مشہور بابی وبہائی مورّخ ڈاکٹر ای جی براؤن[5] (Adward Dranville Brown) کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا جو ان کی بابیت وبہائیت سے شیفتگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

نازش اہل کمال ای جی براؤن
فیض اودر مغرب ومشرق عجم
مغرب اندر ماتم اوسینہ چاک
از فراق اودل مشرق دونیم
تابہ فردوس بریں ماؤی گرفت
گفت ہاتف ذالک الفوز العظیم[6]

اسی طرح بابی وبہائی کسی مسیح ومہدی کی آمد کے قائل نہیں۔

بدائع الآثار جلد1 (سفر نامہ عبد البہاء) صفحہ 23 میں لکھا ہے:-

"دوستان غرب عرض کردند در خصوص غذا باحباء امریکہ دستورالعمل عنایت شود۔ فرمودند ما مداخلہ در طعام جسمانی آنہا نمے کنیم"

عبدالبہاء سے بعض یورپین دوستوں نے عرض کیا کہ کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق امریکن دوستوں کے لئے کوئی دستورالعمل عنایت کیا جائے تو عبدالبہاء نے فرمایا کہ ہم ان لوگوں کے جسمانی کھانے پینے میں کوئی دخل نہیں دیتے (یعنی ہر شخص جو چاہے کھائے اور جو چاہے پیئے)

اقدس میں بہاء اللہ نے لکھا ہے کہ "ã˜Ê Õáæ ÇáÔÚÑ ÈØáےáÇ" کہ اے اہل بہاء نمازوں میں شعر پڑھنا تمہاری نماز کو نہیں توڑے گا۔ یہی نہیں بہائیوں کے عبادت خانہ جسے وہ "مشرق الاذکار" سے موسوم کرتے ہیں، گانے بجانے کا سامان رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ بدائع الآثار جلد1 صفحہ 352 میں لکھا ہے کہ عبدالبہاء نے یہ ہدایت دی کہ "از لوازم مشرق الاذکار داخل مشرق الاذکار از غنون وغرفات خواہد بود" یعنی مشرق الاذکار کے لوازم میں یہ بھی ہے کہ مشرق الاذکار میں اونچی جگہیں بنائی جائیں جن پر گانے بجانے کا سامان انگریزی باجہ وغیرہ بھی رکھا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالبہاء کے سفر یورپ وامریکہ میں پیانو وغیرہ سے خوب کام لیا جاتا تھا اور فن موسیقی کے ماہر لائے جاتے اور راگ ورنگ کی محفلیں برپا ہوتیں۔[7]

اس کے مطابق علامہ مشرق راگ ورنگ کو اپنا دین وایمان سمجھتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں:

لوگ کہتے ہیں مجھے راگ کو چھوڑو اقبال

راگ ہے دین مرا۔ راگ ہے ایمان مرا[8]

اس باب میں ابوالکلام آزاد بھی اقبال کے ہم مشرب تھے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ:-

"اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ فقہاء نے سدّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا، نہ کہ باب تشریع سے"[9]

بلاشبہ اقبال "علامہ" بھی تھے اور "شاعر مشرق" بھی مگر ان کی شاعری کی روح بابیت واشتراکیت میں مضمر تھی جو آخری عمر میں نقطۂ معراج تک پہنچ گئی۔ باقی جو دوسرے رنگا رنگ کے مضامین ان کے شعری کلام میں پائے جاتے ہیں، وہ اس قرآنی آیت کی تصویر ہیں۔ اَنَّـھُمۡ فِیۡ کُلِّ وَادٍ

يَّهِيۡمُوۡنَ۔ وَ اَنَّـهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ۔ (الشعراء:226-227) یعنی شاعر لوگ قافیہ اور ردیف کے پیچھے ہر یک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں یعنی وہ کسی حقانی صداقت کے پابند نہیں رہتے اور جو کچھ کہتے ہیں، وہ کرتے نہیں۔

اقبال نے کھلے بندوں عملاً تسلیم کیا کہ وہ اس نظریہ قرآن کے چلتے پھرتے پیکر ہیں ان کے قول اور عمل میں واضح تضاد ہے۔ جس کی تلقین دوسروں کو کرتے ہیں خود اس پر کبھی عمل پیرا نہیں ہوتے چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

(بانگ درا)

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس "اقبال جرم" کی تفصیل بھی عبرت ناک ہے جو اقبال صاحب ہی کے فصیح و بلیغ اسلوب میں ہی حیطۂ تحریر میں لائی جاسکتی ہے۔ "علامہ" اپنی زندگی کے شام و سحر کا حاصل ان فخریہ الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا
عامل روزہ ہے تو، اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوہ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز

درِ حُکّام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے، وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریکِ تگ و تاز
؏ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

منافقت خدا کی نظر میں کفر سے بھی زیادہ مبغوض ہے۔ چنانچہ اللہ جلّشانہ کا فرمان مبارک ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَاتَفْعَلُوْنَ۔ (الصف:4)

اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔

کتاب اللہ کے اس واضح فیصلہ کے باوجود جو لوگ خدائی احکام کے کسی باغی کی اتباع کرتے ہیں، ان پر قرآن کی یہ آیت چسپاں ہوتی ہے کہ:-

وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ (الشعراء :225)

شاعروں کی پیروی تو وہی کرتے ہیں کہ جو گمراہ ہیں۔

یہ ہے ربِّ محمد کا سرٹیفکیٹ ان احراری علماء اور ممبران اسمبلی 1974ء کو جنہوں نے سر اقبال جیسے بابی اور اشترا کی شاعر کے بیان پر اپنے مطالبہ اقلیت کی بنیاد رکھی۔

حضرت مسیح موعودؑ آیت وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ (شعراء:225) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”شاعر تو اگر مر بھی جاویں تو صداقت اور راستی وضرورتِ حقہ کا اپنے کلام میں التزام نہ کر سکیں۔ وہ تو بغیر فضول گوئی کے بول ہی نہیں سکتے اور ان کی ساری کَل فضول اور جھوٹ پر ہی چلتی ہے۔ اگر جھوٹ نہیں یا فضول گوئی نہیں تو پھر شعر بھی نہیں۔ اگر تم ان کا فقرہ فقرہ تلاش کرو کہ کس قدر حقائق ودقائق ان میں جمع ہیں۔ کس قدر راستی اور صداقت کا التزام ہے۔ کس قدر حق اور حکمت پر قیام ہے۔ کس ضرورتِ حقہ سے وہ باتیں ان کے مونہہ سے نکلی ہیں اور کیا کیا اسرار بیمثل ومانند ان میں لپٹے ہوئے ہیں تو تمہیں معلوم ہو کہ ان تمام خوبیوں میں سے کوئی بھی خوبی ان کی مردہ عبارات میں پائی نہیں جاتی۔ ان کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جس طرف قافیہ ردیف ملتا نظر آیا اسی طرف جھک گئے اور جو مضمون دل کو اچھا لگا وہی جھک ماری۔ نہ حق اور حکمت کی پابندی ہے اور نہ فضول گوئی سے پرہیز ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ اس کلام کے بولنے کے لئے کونسی سخت ضرورت درپیش ہے اور اس کے ترک کرنے میں کونسا سخت نقصان عائدِ حال ہے۔ ناحق بے فائدہ فقرہ سے فقرہ ملاتے ہیں۔ سر کی جگہ پاؤں، پاؤں کی جگہ سر لگاتے ہیں۔ سراب کی طرح چمک تو بہت ہے پر حقیقت دیکھو تو خاک بھی نہیں۔ شعبدہ باز کی طرح صرف کھیل ہی کھیل۔ اصلیّت دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نادار، ناطاقت اور ناتواں اور گئے گزرے ہیں۔ آنکھیں اندھی اور اس پر عشوہ گری۔ ان کی نسبت نہایت ہی نرمی کیجئے تو یہ کہیئے کہ وہ سب ضعیف اور ہیچ ہونے کی وجہ سے عنکبوت کی طرح ہیں اور ان کے اشعار بیتِ عنکبوت ہیں۔ ان کی نسبت خداوند کریم نے خوب فرمایا ہے.... یعنی شاعروں کے پیچھے وہی لوگ چلتے ہیں جنہوں نے حق اور حکمت کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ شاعر تو وہ لوگ ہیں جو قافیہ اور ردیف اور مضمون کی تلاش میں ہر ایک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ حقانی باتوں پر ان کا قدم نہیں جمتا اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ سو ظالم لوگ جو خدا کے حقانی کلام کو شاعروں کے کلام سے تشبیہ دیتے ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہو گا کہ کس طرف پھریں گے۔“

(براہین احمدیہ صفحہ 391-393 حاشیہ)

اس قرآنی پیشگوئی کے مطابق وہ وقت دور نہیں جبکہ خالص قرآنی زاویہ نگاہ سے اقبالیات کا جائزہ لیا جائے گا اور کوئی ماہرِ قرآن، شاعر مشرق کے بابی اور اشتراکی "جواہر پاروں" ہی کا نہیں ان کے مکمل اردو اور فارسی کلام کا تجزیہ کرے گا اور کُل دنیا پر کھل جائے گا کہ یہ کلام محض شاعرانہ تخیلات کا ملغوبہ ہے جس کا ایک ایک شعر "فِیْ کُلِّ وَادٍیَّھِیْمُوْنَ" کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

حواشی:

[1] الحکیم۔ عن ابی امامہ۔ بحوالہ کنز العمال جلد 14 صفحہ 280۔ ناشر موسستہ الرسالہ بیروت سال اشاعت 1405ھ مطابق 1985ء (طبع پنجم)

[2] "خطبات قائد اعظم" صفحہ 313 مولفہ جناب سید رئیس احمد جعفری۔ ناشر مقبول اکیڈمی لاہور اشاعت 1991ء۔

[3] وفات 22 رجب 1354ھ مطابق 20 اکتوبر 1935ء مدفن اندرون دہلی دروازہ دار العلوم حزب الاحناف لاہور۔

[4] "باقیات اقبال" صفحہ 440 مرتب سید عبد الواحد معینی ایم اے آکسن۔ ترمیم واضافہ محمد عبد اللہ قریشی۔ ناشر ائینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور۔

[5] وفات 6 جنوری 1926ء۔

[6] ایضاً صفحہ 493۔ پروفیسر براؤن نے بابی مورخ مرزا جانی کاشانی کی کتاب نقطۃ الکاف کا دیباچہ لکھا ہے۔

[7] بدائع الآثار۔ جلد 1۔ صفحہ 192۔

[8] باقیات اقبال صفحہ 504۔

[9] "غبار خاطر" صفحہ 337-336 پبلشر مکتبہ احرار لاہور۔

بائیسویں فصل

تحریک پاکستان کانگرس اور احرار کی شدید مخالفت

جیسا کہ اپنے مقام پر مفصل روشنی ڈالی جاچکی ہے۔جماعت احمدیہ برٹش انڈیا میں واحد مذہبی جماعت تھی جس نے اپنے امام ہمام کی قیادت میں مارچ 1940ء کی تحریک پاکستان میں قائداعظم کے دوش بدوش مثالی اور بھرپور حصہ لیا۔ اس کے مقابل آل انڈیا کانگرس اور احراری دیوبندی علماء نے مطالبہ پاکستان کی آخر دم تک ڈٹ کر مخالفت کی اور اس کے خلاف زہرافشانی، اشتعال انگیزی اور بدزبانی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

”کانگرس کے سدھائے ہوئے مسلمان کارندے“

قائداعظم محمد علی جناح نے 1945ء میں ملکی انتخاب سے قبل ہی مسلمانان ہند کو پیغام دیتے ہوئے انتباہ کر دیا تھا کہ:-

> ”مجھے معلوم ہے کہ ہمارے خلاف بعض طاقتیں کام کر رہی ہیں اور کانگرس ارادہ کئے بیٹھی ہے کہ ہماری صفوں کو ان مسلمانوں کی امداد سے پریشان کر دیا جائے جو ہمارے ساتھ نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ مسلمان ہمارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ یہ مسلمان ہمارے خلاف مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے کام میں بطور کارندے استعمال کئے جارہے ہیں۔ یہ مسلمان سدھائے ہوئے پرندے ہیں۔ یہ صرف شکل وصورت کے اعتبار سے ہی مسلمان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگرس کے پاس دولت کے وسیع خزانے ہیں۔ ان کے پاس مضبوط تنظیم اور پریس ہے مگر حق ہمارے ساتھ ہے۔“[1]

احرار کے ”امیر شریعت“ نے پسرور میں تقریر کرتے ہوئے کہا

> ”کسی ماں نے ایسا بیٹا نہیں جنا جو پاکستان کی پ بھی بنا سکے۔“[2]

جالندھر کے ایک مسلم لیگی ممبر جناب سید عبدالقدیر صاحب کی چشم دید شہادت ہے کہ:-

> ”سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجلس احرار کے نامور خطیب اور اپنی پُرسوز خوش الحانی کی بناء پر ہر دلعزیز تھے۔ ان کا نام ہی کسی جلسہ میں تل بھر جگہ نہ بچنے کی ضمانت تھا۔

یہ باون یا ترپین سال پہلے کی بات ہے۔ غالباً 1943ء میں جالندھر میں مجلس احرار کے جلسے کا اعلان ہوا۔ جلسہ گاہ کھچا کھچ بھری تھی اور عطاء اللہ شاہ بخاری بول رہے تھے۔ موضوع پاکستان تھا اور انہوں نے اپنے زور خطابت میں کہا کہ "ہمارے دکھوں اور مصائب کا علاج پاکستان نہیں اور پاکستان نہیں بنے گا۔" قوم بیدار ہو چکی تھی اور ہم جیسے پندرہ سولہ لڑکوں میں پاکستان کا خون سرایت کر چکا تھا۔ ہم میں سے احسان محسن (مرحوم) غصے میں چلایا "آپ جھوٹ بول رہے ہیں"۔ کارکنان احرار ہماری طرف لپکے مگر شاہ صاحب نے انہیں خاموش کروا دیا اور یوں گویا ہوئے "ہاں میں جھوٹا ہوں اس لئے کہ میں حافظ قرآن ہوں۔ میں جھوٹا ہوں کہ میری بیوی حافظ قرآن ہے۔ میں جھوٹا ہوں کہ میری بیٹی حافظ قرآن ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ پاکستان نہیں بنے گا، ہرگز نہیں بنے گا۔ اگر یہ بن پایا اور میں زندہ رہا تو میرے منہ پر آکر تھوک دینا اور میں زندہ نہ ہوا تو میری قبر پر آکر پیشاب کر دینا۔" اس کے بعد احراری کارکنوں نے ہم پر طعن وملامت کی اور ہمارے سمیت بہت سے اور نوجوان جلسے سے اٹھ آئے۔ یہ آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا واقعہ ہے۔"[3]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت احرار نے پاکستان، قائد اعظم اور مسلم لیگی مسلمانوں کو گالیاں دینے کے گزشتہ تمام ریکارڈ مات کر دیئے۔ ان کے ملت اسلامیہ کے خلاف سیاہ جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کا اپنا اعتراف ہے کہ:-

"میں نے قائد اعظم کے بوٹ پر اپنی داڑھی رکھی، پر وہ نہ پسیجے۔"[4]

یہ تو احراری لیڈروں کی تحریک پاکستان سے شرمناک نفرت وحقارت اور بغض وعناد کا عالم تھا۔ خود بانئ احرار ابوالکلام آزاد صاحب کے مشتعل جذبات اس باب میں نہ صرف احرار کے مقابل بلکہ متعصب ترین ہندوؤں سے بھی ہزار قدم آگے تھے اور آتش فشاں کی طرح ان کے دل ودماغ لاوا اگلتے رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پاکستان کا نام ہی سرے سے قرآن واسلام کے خلاف ہے جو میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ البتہ وہ یہودی ریاست کے حامی ہیں کیونکہ مسلم ممالک تو موجود ہیں مگر ان مظلوموں اور مسکینوں کے پاس سر چھپانے کو کوئی وطن موجود نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"I must confess that the very term Pakistan goes against my grain. It suggests that some portions of the world

are pure while others are impure. Such a division of territories into pure and impure is un-Islamic and a repudiation of the very spirit of Islam. Islam recognizes no such division and the Prophet says, "God has made the whole world a mosque for me."

Further, it seems that the scheme of Pakistan is a symbol of defeatism and has been built up on the analogy of the Jewish demand for a national home. It is a confession that Indian Muslims cannot hold their own in India as a whole and would be content to withdraw to a corner specially reserved for them.

One can sympathise with the aspiration of the Jews for such a national home, as they are scattered all over the world and cannot in any region have any effective voice in the administration. The condition of Indian Muslims is quite otherwise. Over 90 millions in number they are in quantity a sufficiently important element in Indian life to influence decisively all questions of administration and policy. Nature has further helped them by concentrating them in certain areas."[5]

”مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میرے حلق سے نہیں اترتا، اس سے یہ خیال پیدا کیا جاتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے، بلکہ اسلام سے انحراف ہے۔ اسلام کسی ایسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

”خدانے ساری زمین کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔“

”اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردہ ذہنیت کی علامت ہے اور اس کا خیال اسی طرح پیدا ہوا ہے، جیسے یہودیوں میں قومی وطن کا خیال۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ

ہندوستانی مسلمان، ہندوستان میں اپنی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی ہیں کہ ایک کونے میں ،جو ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو، سمٹ کر بیٹھ جائیں۔"

"یہودیوں کی اس آرزو سے ہمدردی کی جاسکتی ہے کہ ان کا ایک قومی وطن ہو، کیونکہ وہ پوری دنیا میں منتشر ہیں اور کسی ایک علاقے میں بھی وہ حکومت کے انتظامات پر اثر نہیں ڈال سکتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نو کروڑ سے اوپر ہے اور کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے وہ ہندوستانی زندگی کا اتنا اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن حد تک اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت نے ان کو چند مخصوص علاقوں میں بڑی تعداد میں یکجا بھی کر دیا ہے اور اس طرح انہیں تقویت پہنچائی ہے۔"[6]

آزاد صاحب کی لفظ "پاکستان" سے عداوت دراصل اس شدید دشمنی کا فطری نتیجہ تھا جو غدر پارٹی میں شمولیت کے زمانہ ہی سے ان کے سینہ میں مسلمانان ہند خصوصاً بنگالی مسلمانوں کے خلاف سلگ رہی تھی۔ جو آخری عمر میں شعلہ جوالہ بن چکی تھی۔ جس کا دستاویزی ثبوت ان کی آخری کتاب "انڈیا ونز فریڈم" (India Wins Freedom) ہے جس میں انہوں نے صاف طور پر ان خیالات کا اظہار کیا کہ 1906ء سے مسلمانان ہند خصوصاً بنگالی مسلمان انگریزوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور ان کے اشاروں پر رقص کر رہے ہیں۔[7]

یہی نہیں آزاد صاحب بابی و بہائی نظریات کے پیکر تھے اس لئے نہ صرف کروڑوں مسلمان ان کے معتوب تھے بلکہ وہ اسلام کی روحانی قوت ہی سے منکر تھے۔ چنانچہ انہوں نے "انڈیا ونز فریڈم" میں لکھا:-

"History has however proved that after the first few decades, or at most after the first century, Islam was not able to unite all the Muslim countries into one State on the basis of Islam alone."[8]

حواشی:

[1] اخبار انقلاب لاہور۔ 18 اکتوبر 1945ء صفحہ 8۔

[2] روزنامہ جدید نظام استقلال نمبر 1950ء۔ بحوالہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت اردو فسادات پنجاب 1953ء صفحہ 274۔

[3] روزنامہ خبریں، 30 جون 1996ء۔

[4] احراری ترجمان "آزاد" لاہور۔ 14 نومبر 1949ء۔ بحوالہ چند معروضات از جناب اصغر بھٹی بی اے علیگ ایل ایل بی ایڈووکیٹ سرگودھا۔ ممبر پنجاب پراونشل مسلم لیگ کونسل اشاعت 1952ء۔ پاکستان پرنٹنگ پریس ایبٹ روڈ لاہور۔

[5] "India Wins Freedom", Orient Longmans, Bombay, Calcutta, Madras, New Delhi. Printed in India by V.N. Bhattacharya, M.A. at the Inland Printing Works 60/3 Dharamsala Street, Calcutta 13. صفحہ 143-142 طبع 1959ء۔

[6] اردو ترجمہ صفحہ 217 تا 219 (محمد مجیب صاحب) ناشر مکتبہ رشیدیہ۔ پاکستان چوک کراچی 742۔ اشاعت 1991ء۔

[7] انگریزی ایڈیشن 1959ء۔ مطبوعہ کلکتہ صفحہ 4۔

[8] ایضاً صفحہ 207۔

تئیسویں فصل

ایک ممتاز برطانوی افسر کا انکشاف

برٹش انڈیا کے ایک ممتاز برطانوی افسر سر جارج کننگھم (Sir George Cunningham) کی مطبوعہ ڈائری مورخہ 21 ستمبر 1947ء سے یہ انکشاف منظر عام پر آچکا ہے کہ 1945ء میں پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے جنرل سر فرینک میسروی کو بتادیا تھا کہ ہمارا اصل منصوبہ یہ ہے کہ وہ جناح (قائد اعظم) کو ان کا پاکستان بالآخر دے دیں گے۔ پھر بتدریج پاکستان کے معاشی اور دوسرے ذرائع سے ایسے حالات پیدا کر دیں گے جن میں پاکستان کا قائم رہنا بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ اس وقت پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کو جھک کر ہمارے سامنے آنا ہو گا اور یہ درخواست کرنا ہو گی کہ ہمیں دوبارہ ہندوستان میں شامل ہونے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔[1]

اسی منصوبہ کی روشنی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سکیم 3 جون 1947ء کی توثیق کرتے ہوئے حسب ذیل قرارداد منظور کی کہ جغرافیائی حالات نے، پہاڑوں نے اور سمندروں نے ہندوستان کو ویسا ہی بنایا ہے جیسا کہ وہ اس وقت ہے اور کوئی انسانی طاقت نہ تو اس صورت وہیئت کو تبدیل کر سکتی ہے اور نہ ہی اس آخری صورت کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

> "آل انڈیا کانگرس کمیٹی اس بات پر پورا پورا یقین رکھتی ہے کہ موجودہ جذباتی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کا مسئلہ اس حقیقی تناظر میں دیکھا جائے گا اور دو قوموں کے مصنوعی نظریئے کو تمام لوگ ساقط اور ترک کر دیں گے۔"[2]

برصغیر کی تاریخ سے ثابت ہے کہ نہرو حکومت نے پہلے روز ہی سے اس سازش پر کام کرنا شروع کر دیا۔ جس کا مستند دستاویزی ثبوت یہ ہے کہ قیام پاکستان پر ابھی صرف ڈیڑھ ماہ ہوئے تھے کہ فیلڈ مارشل آکنلک (Auchinleck) نے لنڈن میں اپنے افسران بالا کو ایک خفیہ پیغام میں لکھا کہ

> "اس امر کی تصدیق میں میرے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ موجودہ انڈین کابینہ اپنی ہر ممکن کوشش اور طاقت کے ذریعہ پاکستان کی مملکت کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہونے سے روکنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ میری اس رائے سے میرے تمام سینئر افسر بھی متفق ہیں بلکہ اس کی تائید ہر وہ ذمہ دار برٹش افسر کر رہا ہے جو حالات سے ذرا بھی آگاہ ہے۔"[3]

حد یہ ہے کہ ہندوستان کے پہلے سفیر جناب سری پرکاش نے گورنر جنرل پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کے دوران صاف صاف کہہ ڈالا کہ میں پاکستان کو ایک علیحدہ ملک ہرگز نہ سمجھوں گا۔ میری نظر میں تو وہ وطن کا ایک ٹکڑا ہے جو سیاسی مصلحتوں سے ایک آزاد ریاست بنا دیا گیا ہے اور میں ہمیشہ اس کو ایسا ہی سمجھوں گا۔[4]

حواشی:

[1] سر جارج کننگھم ڈائری 1948-47ء صفحہ 12۔ بحوالہ(Pakistan-The Formative Phase (1857-1948 مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لنڈن(1968ء)

[2] Vide V.P. Menon "The Transfer of Power in India" P. 384. (Calcutta, 1957)

[3] ترجمہ(John Connell, "Auchinleck" P.912 (London 1959

[4] "پاکستان"(مصنف سری پرکاش) صفحہ 74۔ اردوایڈیشن مترجم محمد حمایت الحسن صاحب ناشر تخلیقات ٹمپل روڈ لاہور۔ سال اشاعت اگست 1993ء۔

چوبیسویں فصل

احرار لیڈر کی پنڈت نہرو سے خفیہ ملاقات سے فسادات پنجاب 1953ء تک

برّصغیر کے نڈر صحافی دیوان سنگھ مفتون نے اپنے اخبار ریاست دہلی کے 10 دسمبر 1956ء کے شمارہ میں یہ بیان شائع کیا کہ:-

"مسٹر جناح کے انتقال کے بعد پاکستان کے ایک بہت بڑی پوزیشن کے ذمہ دار احراری لیڈر دہلی آئے اور یہاں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے۔ ان احرار لیڈر نے پنڈت نہرو سے کہا کہ پاکستان کے مسلمان اب ملک کی تقسیم کی غلطی کو محسوس کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کو ہندوستان میں مدغم کر دیا جائے تا کہ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان تباہ نہ ہوں **اور اگر پنڈت نہرو جماعت احرار اور دوسرے اس خیال کے حلقوں کی امداد کے لئے تیار ہوں تو پاکستان کو ہندوستان میں مدغم کیا جاسکتا ہے۔"**

اس خفیہ ملاقات کے بعد جماعت احمدیہ کے خلاف احراری پراپیگنڈا یکایک تیز ہو گیا جسے دیکھ کر دہلی کے مشہور مذہبی راہ نما جناب خواجہ حسن نظامی نے واضح طور پر اپنے ایک بیان میں کہا:-

"قادیانیوں کے خلاف تقریر کرنے والے بھارت کے ایجنٹ اور ہندو کے تنخواہ دار ہیں۔"[1]

احراری لیڈروں نے قیام پاکستان کے بعد 1953ء میں مطالبہ اقلیت کے نام پر جس طرح احمدیوں اور پاکستان دونوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے فسادات برپا کئے، اس کی تفصیلات میں فاضل جج صاحبان نے اپنی رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء میں احراری تاریخ پر بلیغ روشنی ڈالی ہے۔ یہی نہیں بلکہ چوہدری فضل الٰہی صاحب کا (جو 7 ستمبر 1974ء کی قرارداد اسمبلی کے وقت پاکستان کے صدر مملکت تھے) یہ انکشاف درج کر کے احراری مطالبہ کے حقیقی عالمی پس منظر کا مشاہداتی ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ فاضل جج صاحبان فرماتے ہیں:-

"مسٹر فضل الٰہی نے تو ایک وقت پر یہ اشارہ بھی کیا تھا کہ مسٹر دولتانہ کی اس سیاست بازی کا مقصد صرف داخلی نہ تھا بلکہ بین الاقوامی سیاسیات سے بھی متعلق تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو اقتدار کی کرسی سے اتار پھینکیں، خود اپنی

قیادت میں ایک مرکزی حکومت قائم کریں اور پاکستان کو ایک کمیونسٹ مملکت بنادیں۔"[2]

فاضل جج صاحبان تحقیقاتی عدالت (فسادات پنجاب 1953ء) تحریر فرماتے ہیں۔

"احرار کے رویے کے متعلق ہم نرم الفاظ استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کا طرز عمل بطور خاص مکروہ اور قابلِ نفرین تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے ایک دنیاوی مقصد کے لئے ایک مذہبی مسئلے کو استعمال کر کے اس مسئلے کی توہین کی اور اپنے ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے عوام کے مذہبی جذبات وحسیّات سے فائدہ اٹھایا۔ اس بات پر صرف احرار ہی یقین رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں مخلص تھے کیونکہ ان کی گزشتہ تاریخ اس قدر واضح طور پر غیر مستقل رہی ہے کہ کوئی احمق ہی ان کے دعوائے مذہبیّت سے دھوکا کھاسکتا ہے۔ خواجہ ناظم الدین نے ان کو دشمنان پاکستان قرار دیا اور وہ اپنی گزشتہ سرگرمیوں کی وجہ سے اسی لقب کے مستحق تھے۔ ان کے بعد کے رویے سے یہ واضح ہو گیا کہ نئی مملکت کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کے مخالف ثابت ہوئے۔ جو پارٹی پاکستان اور مسلم لیگ اور اس کے تمام لیڈروں کی مخالف اور کانگرس کی محض ایک کنیز تھی، اس کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے گزشتہ نظریات کو ترک کر دیتی اور قیام پاکستان پر جو اس کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود وجود میں آ گیا تھا، راتوں رات اپنے عقائد کو بدل کر اس مملکت میں اسلام کی واحد اجارہ دار بن بیٹھی جس کے قیام کے خلاف اس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا تھا۔ کیا احرار پر اپنے نصب العین کا انکشاف تقسیم کے بعد ہی ہوا تھا؟ پاکستان کے لئے اسلامی مملکت کا جو نعرہ وہ لگا رہے تھے۔ وہ اس وقت کہاں تھے جب وہ ان جماعتوں اور ان لوگوں کے خلاف برسرپیکار تھے جو مسلمانوں کے لئے صرف ایک وطن کا مطالبہ کر رہے تھے.... **پاکستان میں احرار کا سا ماضی رکھنے والی جماعت بھی اگر ایک بظاہر معقول مذہبی شاخسانہ کھڑا کر دے تو وہ حکومت کا تختہ الٹ سکتی ہے۔"**[3]

ختم پاکستان کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے نئی جدوجہد

احرار لیڈروں کی اکثریت 1953ء کی ایجی ٹیشن سے قبل ہی عوامی لیگ میں شامل ہو چکی تھی اور اینٹی پاکستان تخریبی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ اب 1953ء کی ایجی ٹیشن میں ملک کے استحکام

اور یکجہتی کو بھاری نقصان پہنچانے کے بعد وہ اپنے منصوبہ ختم پاکستان کی تکمیل میں پہلے سے زیادہ زور شور سے منہمک ہوگئے جس نے پورے پاکستان میں تشویش واضطراب کی لہر دوڑا دی جیسا کہ کتاب "پاکستان میں وفاقیت کی سیاست" کے درج ذیل اقتباس سے بخوبی پتہ چل سکتا ہے:۔

"ہندوستان کی تقسیم کے خلاف بھارت کے انتہا پسند عناصر کے احساسات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اکثر یہ الزامات لگائے گئے کہ ہندوستانی ایجنٹ اور سازشی مشرقی پاکستان میں سرگرم ہیں تاکہ ملک کی سیاسی وحدت کو تباہ کیا جاسکے۔ مارننگ نیوز کا مورخہ 4 فروری 1957ء کا اداریہ اس ضمن میں اشارہ کرتا ہے جس میں کہا گیا:

"کلکتہ سے موصولہ مصدقہ اطلاعات کے مطابق بھارت نے ایک زوردار مہم شروع کی ہے تاکہ پاکستان کو ختم کر کے اس کو دوبارہ بھارت کے ساتھ متحد کیا جاسکے۔ ایک سیاسی جماعت شری آروبندوسیوک سنگھ (Sri Aurobindo Sevak Sangha) جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا سیاسی پروگرام شری آروبند کی تعلیمات پر مبنی ہے، وہ بھارت کے عام انتخابات میں ایک پروگرام کے تحت حصہ لے رہی ہے جس کا پہلا آئٹم یہ ہے "بدقسمتی سے ہوجانے والی تقسیم کا خاتمہ اور ہندوستان کا دوبارہ اتحاد" اس کے انتخابی منشور میں جسے کثرت سے تقسیم کیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض پاکستانی اخبارات کو بھی بھیجا گیا ہے، دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں بھی ایک پارٹی ایسی ہے جو ہندوستان کے از سر نو اتحاد کے لئے کام کر رہی ہے اور اس پارٹی کی طاقت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔"[4]

"ڈان" نے بھی اپنے اداریے میں عوامی لیگ میں بھارتی ایجنٹ اور تخریبی عناصر کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا جو پاکستان کی قومی وحدت کو تباہ کرنے کے لئے کام کر رہے تھے۔[5]

حواشی:

[1] احراری ترجمان اخبار آزاد لاہور 28 جون 1950ء۔

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت صفحہ 304۔

[3] "رپورٹ تحقیقاتی عدالت" صفحہ 277 تا 279۔

[4] لیمبرٹ آر ڈی صفحہ 56۔ ڈان کراچی 6 اپریل 1957ء بحوالہ "پاکستان میں وفاقیت کی سیاست" صفحہ 104-103 مترجم سید راشد علی۔ تالیف مہر النساء علی۔ ناشر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس اشاعت 1996ء۔

[5] ایضاً

پچیسویں فصل

پاکستان کا پہلا متفقہ آئین

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے فروری 1948ء کے ایک نشری پیغام میں جو آپ نے امریکی عوام کے نام دیا دنیا بھر کے سامنے آئین پاکستان کا بھی تصور پیش کر دیا۔ چنانچہ فرمایا:-

"پاکستان آئین ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخر کار شکل کیا ہو گی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری طرز کا آئین ہو گا۔ جس میں اسلام کے بنیادی اصول متشکل ہوں گے۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی میں قابل عمل ہیں، جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کی مثالیّت نے ہمیں جمہوریت کا درس دیا ہے۔ اس نے انسانی مساوات، عدل اور ہر شخص سے منصفانہ برتاؤ سکھایا ہے۔ ہم ان درخشاں روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کا آئندہ آئین بنانے والے کی حیثیت میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا پورا احساس ہے۔ **بہر حال پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہو گا جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کے طور پر حکومت کریں گے۔** ہمارے ہاں بہت سے غیر مسلم ہیں -ہندو، عیسائی اور پارسی- لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ وہ بھی تمام دوسرے شہریوں کی طرح یکساں حقوق اور مراعات سے بہرہ ور ہوں گے اور پاکستان کے معاملات میں کماحقہٗ کردار ادا کریں گے۔"[1]

دستور1956ء کا عوامی خیر مقدم

چودھری محمد علی صاحب وزیر اعظم پاکستان کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے قائد اعظم کے دست و بازو ہونے کی حیثیت سے آپ ہی کے فرمودات کی روشنی میں پہلا متفقہ آئین دیا۔ جس کے نتیجہ میں پاکستان "جمہوریہ اسلامیہ" بن گئی اور صدر ریاست نو آبادیاتی کے گورنر جنرل کی بجائے صدر پاکستان قرار پائے۔ اسلامی جمہوریہ کا دستور ایک تاریخی دستاویز تھی جسے قائد اعظم کے پاکستان نے دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندوں کے ذریعہ 29 فروری 1956ء بمطابق 17 رجب 1375ھ کو اختیار کیا۔ اسے قانونی حیثیت دی اور اپنا دستور گردانا اور جو 23 مارچ 1956ء کو ملک کے دونوں

حصوں میں نافذ کر دیا گیا۔ اس دستور کا ملک بھر میں جس جذبہ اور جوش و خروش کے ساتھ سیاسی پارٹیوں اور عوام نے خیر مقدم کیا، وہ ایک دیدنی منظر تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ احراری لیڈر شورش کاشمیری نے لکھا:-

"ہمارے لئے یہ امر انتہائی مذمت کا باعث تھا کہ ہم نوسال کی مدت میں بھی دستور بنا نہ سکے جو کچھ وہ بوجوہ غارت ہو تا رہا۔ بحمد اللہ اب چوہدری محمد علی کی مساعی مشکور سے پاکستان 23 مارچ کو جمہوریہ اسلامیہ کی شکل اختیار کرے گا.... ناانصافی ہو گی اگر ہم اس پر چودھری محمد علی صاحب کو مبارکباد نہ دیں۔"[2]

جماعت اسلامی کے ترجمان ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور نے اپریل 1956ء کو خصوصی اداریہ سپرد قلم کیا کہ:-

"دستور کا خیر مقدم جس جذبہ وجوش کے ساتھ عوام نے کیا ہے اور "یوم جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" کی تقریب جس دلی ذوق وشوق سے منائی ہے، اس کا انہیں فی الواقع حق پہنچتا تھا۔ "یوم آزادی" کی سرکاری تقریب کے مقابلے میں یہ تقریب صحیح معنوں میں عوامی تھی اور اسی وجہ سے اس کا معیار اور پیمانہ زیادہ اونچا رہا۔ پاکستان کی ایک ایک مسجد میں اسلام اور پاکستان اور ملّت کی سربلندی کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ دستور کے موضوع پر جامع مساجد میں خطبات دیئے گئے۔ جلسوں میں اسلامی نظام پر تقریریں کی گئیں۔ شکرانہ کے نوافل پڑھے گئے۔ غریبوں کو کھانے کھلائے گئے اور مختلف اسالیب سے لوگوں نے اپنے جذباتِ مسرت کا اظہار کیا۔

یہ فی الواقع ایک حقیقی مسرت کا موقع تھا۔ ہماری سیاسی و قومی تاریخ میں ایک بڑا دن 14 اگست 1947ء کا تھا اور اب دوسرا بڑا دن 23 مارچ 1956ء کا دن قرار پایا ہے۔ اُس دن ہمارے جغرافیے میں ایک تبدیلی واقع ہوئی تھی اور اس دن سے ہماری تاریخ میں تغیر آرہا ہے۔ اُس دن زمین کی لوح پر نئی لکیریں کھینچی گئی تھیں اور اِس دن ہماری زندگی کے نامہ تقدیر پر نئے نقوش نمودار ہو رہے ہیں۔ اُس دن ملّی زندگی کا محض نیا قالب کھڑا کیا گیا تھا اور اس دن اس قالب میں اصول و مقصد کی روح پھونکی جارہی ہے۔"

اس کے بعد دستور کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:-

"آزاد ہونے کے باوجود آٹھ برس کی لمبی مدت تک ہمارا اپنا کوئی دستور نہ تھا اور ہم ایک غیر قوم کے متروکہ دستور کے تحت.... کام چلا رہے تھے۔ زندگی کے لئے کوئی نظریہ نہ تھا۔ عمل کے لئے نصب العین کی کوئی منزل نہ تھی۔ منزل تک لے جانے والا راستہ معین نہ تھا۔ تعمیر کا کوئی نقشہ طے نہ تھا۔ گویا ہم اندھیرے میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ اب ہمارے ہاتھوں میں اپنا بنایا ہوا ایک دستور ہے۔ اس دستور میں ایک ملّی نصب العین طے کر دیا گیا۔ اس نصب العین کے اصولی تقاضے متعین کر دیئے گئے ہیں اور بہ حیثیت ایک مسلم ملت کے ہم نے مطلوبہ تبدیلیوں کو اس دستوری نقشے میں سامنے رکھ لیا ہے۔ اب ہم خدا خدا کر کے دنیا کی آزاد اقوام سے آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔

ہماری آزادی اور ہماری حاکمیت 22 مارچ 1956ء کے نیم شب تک ملکہ برطانیہ کی نمائندگی کرنے والے "فردِ واحد" کے پاس رہن تھی اور اب 23 مارچ سے اس کا فکِ رہن عمل میں آیا ہے۔ اس سے قبل 1935ء کے ایکٹ کے رُو سے سرے سے ہمارا کوئی شہری حق نہ تھا۔ اب پہلی مرتبہ ہم دستوری حیثیت سے کچھ نہ کچھ شہری حقوق کے مالک ہوئے ہیں اور ایک آزاد ریاست کے شہریوں کے مرتبے کو پہنچے ہیں۔

گومگو کا ہشت سالہ دور جس میں ایسے مواقع پیدا ہوئے کہ آمریت اپنے ڈراؤنے چہرے کے ساتھ قومی زندگی کے دروازے سے آکر جھانکتی رہی، اس دستور کے نفاذ کے ساتھ ختم ہو گیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دستور میں خدا کی حاکمیت کے اقرار کے ساتھ یہ بنیادی اصول مان لیا گیا ہے کہ قانون سازی کا اساسی سرچشمہ اور معیارِ فیصلہ کتاب وسنت کی شریعت ہو گی۔ یہ اسلامی رجحان کی ایک کھلی کھلی فتح ہے۔ الحاد پسند مغرب زدہ عناصر پر باوجود یکہ اس اصول کو عمل میں لانے کے لئے جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے، وہ حد درجہ ناقص اور ڈھیلا ڈھالا ہے تاہم ایک مسلمان قوم کے اندر اس اصول کے طے پا جانے کے بعد کسی طاقت کی یہ مجال نہیں ہو سکتی کہ وہ کتاب وسنت کے خلاف قانون سازی کرتی چلی جائے۔

یہ چند ایسے کھلے کھلے وجوہ ہیں جنہوں نے 23 مارچ کی تقریب پر عوام کے دلوں میں ایک نئی روح دوڑا دی ہے۔"

1956ء کے دستور میں صدر مملکت کے لئے مسلمان کا ہونا ضروری قرار دیا گیا مگر اس کے لئے کوئی حلف نامہ مسلمان ہونے کا شامل قانون نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ قائد اعظم محمد علی جناح نے فرقہ پرست ملاؤں کو شکست دے کر ہی ہر کلمہ گو مسلمان کو تحریک پاکستان کے جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کلمہ طیبہ ہی کی برکت سے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ لہٰذا اس کے دستور میں کلمہ کے سوا مسلم کی کوئی دستوری پہچان قرار نہیں دی جاسکتی تھی۔ جناب اعجاز حسین بٹالوی (تحریک پاکستان کے نامور راہنما) تحریر فرماتے ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ جناح مسلمانوں کا سب سے پہلا سیکولر لیڈر تھا جس نے ہماری سیاست کو پیشہ ور مولویوں کے پنجے سے نجات دلائی اور ہم کو کانسٹی ٹیوشن، وحدانی حکومت، قانون پارلیمنٹری جمہوریت اور اکثریت واقلیت کے مسائل پر دور حاضر کے جدید تقاضوں سے غور کرنا سکھایا۔“[3]

احراری ایجی ٹیشن جو انہوں نے بظاہر آئین میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے نعرہ سے شروع کی تھی، دراصل پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے خاتمہ اور اکھنڈ بھارت بنانے کی سوچی سمجھی سازش تھی جو بری طرح ناکام ہوئی۔ اس لئے احرار لیڈروں کی اکثریت نے نہرو ایجنڈا پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مشرقی پاکستان کا رخ کیا اور ان کی اکثریت حسین شہید سہروردی صاحب کی عوامی لیگ میں شامل ہو گئی تا مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان دشمنانِ پاکستان نے جن نفرتوں کا بیج بو دیا تھا ،ان کی آبیاری کر کے اسے تناور درخت بنا دیں۔ بنگلہ دیش کے سابق صدر اور وزیر خارجہ جناب کھنڈ کر مشتاق احمد صاحب کا بیان ہے:

”اس وقت کے مشرقی پاکستان اور آج کے بنگلہ دیش میں اور اس وقت کے مغربی پاکستان اور آج کے پاکستان میں متعدد چھوٹے چھوٹے مسائل نے سنگین اہمیت اختیار کر لی دونوں خطوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا۔ ان کے مابین انڈر سٹینڈنگ اور ہم آہنگی نہ تھی۔ بہت سے عناصر نے جن کا مفاد وابستہ تھا ان اختلافات کو ہوا دی۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہو گی کہ ایسے مسائل بھی اٹھائے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ تک کہا گیا کہ **مشرقی پاکستان کے مسلمان صحیح معنوں میں سچے مسلمان نہیں ہیں گویا ہمیں مسلمان ہونے کے لئے بھی سرٹیفکیٹ درکار تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمیں مغربی پاکستان کے لیڈروں سے فتویٰ**

حاصل کرنا ضروری تھا۔"[4]

الغرض ان دشمنان پاکستان کی گھناؤنی سازشیں شب وروز جاری رہیں یہاں تک کہ پاکستان کا مشرقی بازو کٹ گیا اور پاکستانی فوج نے ہندوستانی کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح پنڈت نہرو کے ایجنڈے کا پہلا مرحلہ ان کے ایجنٹوں کے ہاتھوں کامیاب ہو گیا۔ احراری لیڈر شیخ حسام الدین تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ "بنگال پاکستان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تیس سال نکال سکے گا" اور ان غداروں نے ایسا کر کے دکھا دیا۔[5]

حواشی:

[1] "ظہور پاکستان" صفحہ 451 از چوہدری محمد علی صاحب سابق وزیر اعظم پاکستان۔ ناشر مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور 1972ء۔

[2] ہفت روزہ چٹان لاہور۔ 5 مارچ 1956ء صفحہ 3۔

[3] ہماری قومی جدوجہد حصہ اوّل تا چہارم صفحہ 63۔ ناشر سنگ میل پبلیکیشنز لاہور اشاعت 1995ء۔

[4] "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور اپریل 1986 صفحہ 25۔

[5] "تحریک کشمیر سے تحریک ختم نبوت تک" صفحہ 141-140 (چوہدری غلام نبی صاحب)

چھبیسویں فصل

1973ء کا آئین اور کانگرسی ملاّؤں کا شب خون

سقوط ڈھاکہ کے قومی المیہ پر ہر محب وطن پاکستانی خون کے آنسو رو رہا تھا مگر احرار بچے کھچے ملک میں بھی فتنہ فساد پھیلانے کی سکیمیں تیار کرنے میں لگ گئے۔ خصوصاً اس لئے کہ 1953ء کی احراری ایجی ٹیشن کے خلاف مشرقی پاکستان نے وسیع پیمانہ پر مخالفت کی تھی اور اس کے ممبران اسمبلی، محترم سیاسی وسماجی شخصیات اور بنگالی پریس نے احراری مطالبہ کو پیوند خاک کر دیا تھا۔ لیکن ان کی انڈر گراؤنڈ سازشوں اور منصوبوں سے یہ مشرقی بازو پاکستان سے کٹ کر ہندوستان کی جھولی میں جا چکا تھا اور مغربی پاکستان اسمبلی سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلوا کر بقیہ ملک کو تباہی کے دہانے تک پہنچانا اب زیادہ مشکل نہ رہا تھا۔

چنانچہ اِدھر مشرقی پاکستان میں افواج پاکستان نے ہتھیار ڈالے اُدھر ان سنگ دلوں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے جماعت احمدیہ کے خلاف وسیع پیمانے پر پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اسی اثناء میں پاکستان کی برسراقتدار پیپلز پارٹی نے 2 فروری 1973ء کو ملک کا نیا آئینی مسودہ پیش کر دیا۔

احرار نے جو قائداعظم اور آپ کے تصور آئین کے ازلی دشمن تھے اور اسی موقع کی تاک میں بیٹھے تھے، خم ٹھونک کر میدان مخالفت میں آ گئے اور اپوزیشن کے تمام ممبروں سے جو سبھی مخالف احمدیت تھے، دیکھتے ہی دیکھتے کمال چالاکی اور عیاری ومکاری سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کے دیوبندی ممبر مولوی مفتی محمود نے نمایاں رول ادا کیا۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ "ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں"[1] اخبار "نوائے وقت" (30 جنوری 1986 صفحہ 11) کے رپورٹر کے مطابق ان کے الفاظ یہ تھے کہ

"خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے۔"

مفتی صاحب کے بیٹے اور سیاسی جانشین مولوی فضل الرحمن صاحب نے اپنی پاکستان دشمنی میں اپنے باپ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے اور ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہاں تک گوہر افشانی کر چکے ہیں:

> "جہاں تک پاکستان کی اساسیت کا سوال ہے تو یہ فراڈ اعظم تھا جو اسلام کے نام پر کھیلا گیا۔ پاکستان کا وجود اسلام کے لئے قطعاً نہ تھا بلکہ مغربی سیاست کو بچانے کے لئے اس کے غلط ہاتھوں کے ذریعہ وجود میں لایا گیا۔ **یہ سب فراڈ اسلام کے نام پر کھیلا گیا۔**"[2]

جسٹس کیانی اور جسٹس منیر نے اپنی رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب 1953ء میں احرار کی نسبت لکھا:

”اسلام ان کے نزدیک ایک حربے کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ کسی سیاسی مخالف کو پریشان کرنے کے لئے جب چاہتے بالائے طاق رکھ دیتے۔۔۔۔جب وہ لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے تو ان کی واحد مصلحت اسلام تھی جس کا اجارہ انہیں خدا کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک لیگ اسلام کی طرف سے محض بے پرواہی نہ تھی بلکہ دشمن اسلام تھی۔ **ان کے نزدیک قائداعظم کافراعظم تھے۔**۔۔۔ملاپ لاہور نے اپنی اشاعت مورخہ 27دسمبر1945ء میں احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر شائع کی جو انہوں نے علی پور کی احرار کانفرنس میں کی تھی۔ اس تقریر میں امیر شریعت نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ مسلم لیگ کے لیڈر۔۔۔۔ جس مملکت کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں وہ پاکستان نہیں خاکستان ہے۔ اس رہبر محترم نے پسرور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب تک کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی پ بھی بنا سکے (حوالہ استقلال نمبر روزنامہ جدید نظام1950ء) فسادات (1953ء) کے دوران احراری لیڈر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے لاہور میں جو تقریریں کیں ان میں سے ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ پاکستان ایک بازاری عورت ہے جس کو احرار نے مجبوراً قبول کیا ہے۔“[3]

بالکل یہی عقیدہ مفتی محمود صاحب کے دست راست مولوی غلام غوث ہزاروی کا تھا جنہوں نے ایک بیان میں برملا کہا:

”ہم نے اس طرح پاکستان کو قبول کیا ہے کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کو بھگا کر لے جائے۔ والدین پسند تو نہیں کرتے لیکن بیٹے کی غلطی کو تسلیم کر لیں۔“[4]

مسودہ میں حلف کا اضافہ

مفتی محمود صاحب اور مولوی غلام غوث ہزاروی اور ان کے ہم نوا ممبران اسمبلی نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر زور دیا کہ مسودہ میں صدر اور وزیراعظم کے مسلمان ہونے کی شرط کا معاملہ طے ہو چکا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آئین پاکستان میں ان کا حلف نامہ بھی تجویز کیا جائے جس میں ان کا اقرار ہو کہ ہم مسلمان ہیں اور ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ مسٹر بھٹو جنوبی ایشیا کے ہیرو بننے کے خواب

دیکھ رہے تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ پہلے زینہ کے طور پر وہ اوّلین کارنامہ سیاست متفقہ آئین کی صورت میں انجام دیں۔ انہوں نے اس مطالبہ کے سامنے بھی گھٹنے ٹیک دیئے اور صدر اور وزیر اعظم کے لئے درج ذیل الفاظ میں حلف شامل آئین کر لیا گیا۔

"میں ایک مسلمان ہوں اور قادر مطلق کی توحید، اللہ تعالیٰ کے صحیفوں، قرآن کریم جو ان صحیفوں میں آخری ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور ان کے نبی آخر الزمان ہونے اور ان کے بعد کسی اور نبی کے نہ ہونے، روز حساب اور قرآن کریم وسنت کی تمام تعلیمات ومقتضیات پر مکمل ایمان رکھتا ہوں۔ "[5]

اب مسودہ آئین بالاتفاق پاس ہو گیا۔ 12 اپریل 1973ء کو صدر مملکت چوہدری فضل الٰہی صاحب نے اس کی توثیق کر دی اور اسے 14 اگست 1973ء کو نافذ کر دیا گیا۔

چور دروازے سے غیر مسلم قرار دینے کی شاطرانہ چال

یہ حلف نامہ در پردہ چور دروازے سے خدا کی پاک اور حقیقی مسلمان جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دینے کی شاطرانہ چال تھی جس کے معاً بعد پاکستان دشمن ملاؤں نے مطالبہ کیا کہ اس حلف نامہ کی بنیاد پر "مسلم" کی ایسی تعریف کی جائے جس سے پاکستان کے احمدی باقی مسلمانوں سے یکسر کاٹ دیئے جائیں۔ ساتھ ہی بھٹو صاحب کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر یہ سراسر جھوٹا اور مفتریانہ پراپیگنڈا وسیع پیمانے پر شروع کر دیا کہ

"مرزائی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ "[6]

حتّٰی کہ شورش کاشمیری صاحب نے چنیوٹ میں ایک اشتعال انگیز تقریر میں یہاں تک کہہ ڈالا:

"اگر بھٹو کی ایک انگلی کا خون بھی بہایا گیا تو میں سب سے پہلے اپنی جان کی قربانی دوں گا اور بھٹو کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لیا جائے گا۔ "[7]

اس پراپیگنڈا کے صرف دو ایک ماہ کے بعد مسلم سربراہان مملکت کی لاہور میں کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں احرار نے جماعت احمدیہ کے خلاف شر انگیز عربی اور اردو پمفلٹ شائع کئے اور پھر سعودی عرب نے رابطہ عالم اسلامی سے احمدیوں کے غیر مسلم ہونے کا فتویٰ لے کر تمام مسلمان ملکوں میں پھیلا دیا۔

اس ماحول میں احرار نے اپنے ناپاک منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پاکستان میں ملک گیر شورش برپا کرنے کا سٹیج تیار کر لیا جو شورش کاشمیری صاحب اور مولوی تاج محمود صاحب ایڈیٹر "لولاک" فیصل آباد کا رہین منت تھا۔

چنانچہ اخبار لولاک نے 8 مئی 1987ء صفحہ 91 میں مولوی تاج محمود صاحب کو "محافظ ختم نبوت" قرار دیتے ہوئے لکھا:

> "**1974ء کی تحریک ختم نبوت کی بنیادی حکمت عملی دراصل آغا شورش اور مولانا تاج محمود ہی کی متعین کردہ تھی**.... مولانا نے ستمبر 1974ء کے قادیانی فیصلے سے کئی ماہ قبل احباب کو پورے یقین کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ اس دفعہ تحریک کامیاب ہو جائے گی۔"

مولوی تاج محمود نے اس کامیابی کا فوری سبب یہ بتایا کہ "مولوی منظور احمد سندھی .... ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے لئے خاص طور پر مدینہ سے تشریف لائے ہیں۔"

حواشی:

[1] رسالہ-"چٹان" لاہور 8 ستمبر 1975ء صفحہ 5۔

[2] ہفت روزہ "زندگی" لاہور 22 تا 28 جنوری 1994ء۔

[3] رپورٹ اردو ایڈیشن صفحہ 275-272۔

[4] اخبار "نوائے وقت" 30 جنوری 1986ء صفحہ 11۔

[5] آئین پاکستان 1973ء صفحہ 169-168 از جناب صفدر محمود صاحب اشاعت دوم 1974-ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشر چوک انار کلی لاہور۔

[6] "لولاک" فیصل آباد 14 ستمبر 1973ء صفحہ 1۔

[7] روزنامہ "امروز" 30 دسمبر 1973ء صفحہ 2 کالم 5۔

ستائیسویں فصل

طلبہ نشتر کالج کاڈرامہ۔ بھٹو حکومت اور سوشلسٹ ملّا

جب سٹیج تیار ہو چکاتو مجوزہ سکیم کے عین مطابق نشتر کالج کے طلبہ کے ذریعہ ربوہ اسٹیشن پر ڈرامہ رچایا گیا جسے خونریز تصادم کانام دے کر چند گھنٹوں کے اندر اندر مختلف سیاسی عناصر خصوصاً صحافی مولوی تاج محمود کے سگنل پر لائل پور (فیصل آباد) اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ اگلے ہی روز اخبارات نے ضرب خفیف کے ایک معمولی واقعہ کو میدان جنگ کے رنگ میں پیش کر کے ملک بھر میں آگ لگادی اور مظلوم احمدی اپنے ہی پیارے وطن میں (جس کے لئے انہوں نے تقسیم ہند سے قبل بے پناہ قربانیاں دی تھیں) ایک ملک گیر خونی کربلا سے دوچار ہو گئے۔ بھٹو حکومت نے پاکستان کے مظلوم احمدیوں کی امداد کرنے اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بجائے فسادیوں کو کھلی چھٹی دے دی۔ اور ساتھ ہی ڈپلومیسی اور منافقت کی یہ دوغلی پالیسی اختیار کی کہ ایک طرف اس نے ممالک عالم پر اپنی جمہوریت نوازی کا سکہ بٹھانے کے لئے یہ اعلان کیا کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بارہ میں خود کوئی فیصلہ نہیں کرے گی بلکہ اسے قومی اسمبلی پر چھوڑ دے گی۔ دوسری طرف عیاری و مکاری سے کام لیتے ہوئے احراری ملّاؤں کے ہم عقیدہ و مسلک ہونے کے واضح بیانات دیئے اور ظلم و ستم کی حد یہ کہ اس نے اسمبلی میں اس مسئلہ کے حل کیلئے جو "رہبر کمیٹی" قائم کی، اس کے فرائض میں ختم نبوت سے متعلق جماعت احمدیہ کے عقیدہ کی قرآن و سنت کو روشنی میں چھان بین کرنے کی بجائے پہلے از خود فرض کر لیا کہ احمدی واقعی منکر ختم نبوت ہیں۔ اور پھر رہبر کمیٹی کے فرائض میں صرف یہ بات شامل کی کہ وہ منکرین ختم نبوت کی دستوری اور آئینی حیثیت متعین کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں 30جون 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی کا جو پہلا اجلاس ہوا اسکی رپورٹ پاکستانی پریس نے حسب ذیل الفاظ میں شائع کی۔

پاکستان اسمبلی کا اجلاس30جون1974ء

"اسمبلی کا اجلاس ساڑھے 12 بجے دوبارہ شروع ہوا تو وزیر قانون مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ کی طرف سے پیش کردہ منکرین ختم نبوت کی اسلام میں حیثیت کے تعین کے بارے میں ایک تحریک اور اپوزیشن کی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور

اس مقصد کے لئے آئین میں ترمیم کرنے کی قرارداد متفقہ طور پر منظور کرلی گئی۔
قرارداد اور تحریک کی منظوری کے وقت وزیر اعظم بھٹو بھی ایوان میں موجود رہے۔
قرارداد اور تحریک، ایوان کی رائے کے مطابق تمام ممبروں پر مشتمل ایک خاص کمیٹی کے سپرد کردی گئی۔ اس کمیٹی کے اجلاس کے لئے چالیس ممبروں کا کورم ضروری قرار دیا گیا۔ ان میں دس ارکان حکومت کی مخالف جماعتوں سے ہوں گے۔"

سرکاری تحریک کا متن

"یہ ایوان سارے ایوان پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی قائم کرتا ہے.... جس کے چیئرمین اس ایوان کے سپیکر ہوں گے اور یہ خصوصی کمیٹی حسب ذیل فرائض سرانجام دے گی۔

(1) ان لوگوں کی حیثیت متعین کی جائے جو آنحضور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وَآلہٖ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔"[1]

ان الفاظ سے یہ حقیقت پورے طور پر بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ بھٹو حکومت اور اپوزیشن ممبر دونوں ہی کمیٹی کی تشکیل سے قبل احمدیوں کو منکر ختم نبوت سمجھتے تھے۔ اور اس خصوصی کمیٹی کا مقصد احمدیوں کو سزا دینے کے لئے قانونی جواز کا سہارا ڈھونڈنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر حکومت اور اپوزیشن دونوں ہی جماعت احمدیہ کی مخالفت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں تھے اور دونوں ہی متحد ہوکر اپنے اپنے سیاسی مفادات کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہی اور صرف یہی وجہ ہے کہ رہبر کمیٹی نے حضرت امام جماعت احمدیہ سیدنا خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے بہت سے سیاسی اور معاشرتی سوالات کئے **مگر ختم نبوت کی حقیقت کے متعلق ایک سوال بھی نہیں پوچھا!**

جنگ زرگری

اس صورتحال کی وضاحت حضرت امام شمس الدین ابن الجوزی بغدادی رحمتہ اللہ علیہ (متوفّٰی 1200ء) کے بیان کردہ ایک دلچسپ واقعہ سے خوب ہوجاتی ہے۔ علامہ یکتائے روزگار، کثیر التصانیف اور علم حدیث کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے اپنی تصنیف "کتاب الاذکیا" میں علی بن محسن سے روایت کی ہے کہ ان کے والد نے بتایا کہ ہمیں بغداد کے بہت سے اکابر سے معلوم ہوا کہ بغداد کے پل کی دوسری جانب دونابینا گداگر تھے۔ ان میں سے ایک تو امیر المومنین سیدنا علیؓ کے نام کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہے اور دوسرا حضرت معاویہ کے نام پر بھیک مانگتا ہے۔ بہت لوگ ان کے

گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی بھیک کے ٹکڑوں کو جمع کرتے رہتے ہیں۔ جب لوٹتے ہیں تو ان ٹکڑوں کو برابر بانٹ لیتے ہیں اور اس حیلہ سے لوگوں سے وصول کرتے رہتے اور ان کے اموال پر ڈاکہ ڈالتے رہتے ہیں۔[2] اسی امر کو اردو لغت میں جنگ زرگری کہتے ہیں۔ چنانچہ مولوی سید احمد دہلوی نے اپنی مشہور عالم اردو لغت "فرہنگ آصفیہ" میں جنگ زرگری کی تشریح میں لکھا ہے۔ جھوٹ موٹ کی لڑائی۔ وہ مصلحت کی لڑائی جو دشمن کو دھوکہ دینے کے واسطے بغیر از عداوت لڑیں۔ سازشی لڑائی جس طرح پتنگ بازی میں غوطم چارہ یا کشتی میں کمالہ ہوتا ہے۔"

1974ء کی شورش کا بھی بالکل یہی حال تھا۔ احراری ملّا 1953ء کی طرح (بقول مودودی صاحب) تحفظ ختم نبوت کا سہرا صرف اپنے سر پر باندھنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف مسٹر بھٹو وزیر اعظم اور ان کی پارٹی اسے اپنا فقید المثال کارنامہ ظاہر کر کے اگلے انتخابات جیتنا چاہتی تھی جیسا کہ ان کے وزیر مذہبی امور جناب کوثر نیازی کا بیان ہے کہ

"مسٹر بھٹو احمدی مسئلے پر قومی اسمبلی کا فیصلہ کرانے کے بعد انتخابات کے نقطہ نظر ہی سے سوچ رہے تھے۔"[3]

خالص اس سیاسی مصلحت کی بناء پر بھٹو صاحب نے آئین میں شامل صدر اور وزیر اعظم کے لئے مجوزہ حلف کے ایک حصہ کو دستوری الفاظ میں ڈھال لیا اور اسمبلی میں احمدیوں کے ناٹ مسلم ہونے کی قرارداد پاس کرا لی گئی۔ تاہم جناب بھٹو صاحب نے اپنی جمہوریت پسندانہ پالیسی کی دھاک بٹھانے کے لئے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ یہ فیصلہ محض ان معنوں میں مذہبی ہے کہ یہ پاکستان کی مسلم اکثریت کا فیصلہ ہے جو عوام کی امنگوں کے مطابق کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ ہم سوشلزم کے اقتصادی اصولوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔"[4]

اس وضاحت سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ مسٹر بھٹو وزیر اعظم پاکستان اور ان کی حکومت نے 7 ستمبر کی قرارداد کا سارا ڈرامہ سوشلزم کے اصول کی تعمیل میں رچایا تھا جس کا اسلام اور قرآن و سنت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اگرچہ بھٹو صاحب نے سوشلزم کو "مساوات محمدی" کا نام دے رکھا تھا مگر یہ محض فراڈ تھا جیسا کہ انہی دنوں روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے اپنے اداریہ میں لکھا:-

"شمالی علاقوں کے حالیہ دورے کے دوران مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ ہمارے اسلامی سوشلزم کا مطلب "مساوات محمدیؐ" ہے۔ پارٹی کے جو کارکن یا لیڈر اس

مطلب کو نہیں سمجھ سکے، میں انہیں تربیت دوں گا۔

اب (خورشید حسن) میر صاحب فرماتے ہیں کہ اصطلاحوں کا جھگڑا پارٹی میں انتشار پیدا کرنے کے لئے کھڑا کیا جارہا ہے۔ ہمارا نصب العین بالکل واضح ہے۔

ایک اسلامی ملک میں سوشلزم اور وہ بھی "مساواتِ محمدیؐ" کے نام پر۔ اب اس تضاد کو مسٹر بھٹو ہی دور کرسکتے ہیں۔ سوشلزم چین، روس، یوگوسلاویہ اور روسی سامراج کے زیرِ نگین مشرقی یورپ کے ممالک میں رائج ہے۔ سوشلزم صرف اقتصادی نظام نہیں۔ اسلام کی طرح مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کے لوازمات میں ایک مخصوص "سنگل پارٹی" نظام حکومت بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ "مساواتِ محمدیؐ" کے نام پر نافذ نہیں ہو سکتا۔ "مساواتِ محمدیؐ" کے نام پر تو "اسلامی مساوات" کا نفاذ ہی ممکن ہے۔ چیئرمین بھٹو کو اب یہ ابہام فوراً دُور کر دینا چاہیئے کہ ان کا اور ان کی پارٹی کا نصب العین کیا ہے؟ لوگ انہیں جانتے ہیں۔ میر صاحب کو نہیں۔ ہم سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اسلام نہ سرمایہ داروں کا مذہب ہے نہ ان کے ایجنٹوں کا ہے۔"[5]

پاکستان کو سوشلسٹ ملک بنانے کا اعلان

وزیر اعظم بھٹو صاحب نے ایوان سے 7 ستمبر کی قرارداد منظور کراتے ہی قومی اسمبلی کو بتایا کہ نوے سالہ مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ اب ہم اپنی پارٹی کے بنیادی اصول کے مطابق پاکستان کو سوشلسٹ ملک بنانے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

"ہمارا دوسرا اصول یہ ہے کہ جمہوریت ہماری پالیسی ہے۔ چنانچہ ہمارے لئے فقط یہی درست راستہ تھا کہ ہم اس مسئلہ کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں پیش کرتے۔ اس کے ساتھ ہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم اپنی پارٹی کے اس اصول کی بھی پوری طرح پابندی کریں گے کہ **پاکستان کی معیشت کی بنیاد سوشلزم پر ہو۔ ہم سوشلسٹ اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں۔**"[6]

آئینی اغراض کی قانونی اصطلاح

جناب بھٹو صاحب نے نئی قرارداد کو جمہوریت کی ٹکسال میں ڈھالتے ہوئے ان الفاظ کا اضافہ کرایا تھا کہ احمدی آئین و دستور کی اغراض کے لئے "ناٹ مسلم" ہیں۔

دراصل ”آئینی ودستوری اغراض“کی اصطلاح دنیا کے کانسٹی ٹیوشنز میں مروّج ہے۔ جس کا نمونہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور مجریہ 25مارچ 1987ء میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس میں دفعہ 251(1) کے تحت لکھا ہے:

”پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اور یوم آغاز سے پندرہ برس کے اندر اندر اس کو سرکاری ودیگر اغراض کے لئے استعمال کرنے کے انتظامات کئے جائیں گے۔

(2) شق (1) کے تابع انگریزی زبان اس وقت تک سرکاری اغراض کے لئے استعمال کی جاسکے گی جب تک کہ اس کے اردو سے تبدیل کرنے کے انتظامات نہ ہو جائیں۔“[7]

پھر باب پنجم میں زیر دفعہ 262 لکھا ہے۔

”دستور کی اغراض کے لئے کسی مدت کا شمار گریگری نظام تقویم کے مطابق کیاجائے گا۔“[8]

بالکل اس اصطلاح میں احمدی، اسمبلی پاکستان میں محض قانون وآئین کی اغراض کے لئے ”ناٹ مسلم“ قرار پائے جس کا مذہب اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ محض جمہوری اور سیاسی اور آئینی فیصلہ تھا جس کا مقصود صرف یہ تھا کہ اگر پاکستانی احمدی پارلیمنٹ میں اکثریت بھی حاصل کرلیں تو وہ صدر اور وزیر اعظم نہیں بن سکیں گے کیونکہ 1973ء کے آئین میں مشمولہ ”حلف نامہ“ ان کے لئے روک ہو گا۔

قرارداد کا مقصد احرار لیڈروں کی نظر میں

یہ ایسی واضح بات تھی کہ احرار لیڈروں نے 1973ء کے آئین میں صدر اور وزیر اعظم کے حلف ناموں کے اضافہ پر بعض عام جلسوں میں خود بتائی اور اس پر جشن مسرت مناتے ہوئے مسٹر بھٹو وزیر اعظم کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ بطور نمونہ ایک خبر ملاحظہ ہو۔

”قادیانی اب کبھی اقتدار اعلیٰ پر قابض نہیں ہوسکتے“

مجلس تحفظ ختم نبوت کھرڑیانوالہ کے زیر اہتمام چک نمبر 100رڑ کا میں 14اگست کو ایک جلسہ عام ہوا جس سے مجلس تحفظ ختم نبوت لائل پور کے مبلغ مولانا اللہ وسایا نے خطاب کرتے ہوئے موجودہ آئین میں ختم نبوت کے عقیدہ کو صدر اور وزیر اعظم کے حلف اور مسلمان کی تعریف میں شامل کرنے پر مسرت کا اظہار کیا اور اسے نیک شگون قرار دیا۔ مولانا نے مفتی اعظم، مفتی محمود، مولانا نورانی، وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور صدر مملکت چوہدری فضل الٰہی کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ملک

کو ایسا آئین دیا ہے جس میں ختم نبوت کے مسئلہ کو کسی حد تک حل کرنے کے لئے قدم اٹھایا گیا ہے۔ آپ نے کہا کہ اب آئین کی رو سے **کوئی منکر ختم نبوت نہ ملک کا صدر بن سکتا ہے نہ وزیر اعظم۔ اس شق سے قادیانیوں کے اقتدار (میں) آنے کی تمام آرزوؤں پر پانی پھر گیا ہے۔**"[9]

بالکل یہی نقطہ نگاہ مشہور دیوبندی محمد تقی عثمانی صاحب سابق جسٹس شریعت بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان کا ہے۔ چنانچہ آپ 1973ء کے متفقہ آئین کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"دفعہ نمبر 44 ذیلی فقرہ نمبر 2 میں پچھلے تمام دساتیر کی طرح صدر مملکت کے لئے مسلمان ہونے کو لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 94 ذیلی فقرہ نمبر 2 وزیر اعظم کے لئے بھی مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ شرط بھی پہلی بار پاکستان کے دستور میں شامل کی گئی ہے اور اس کا اضافہ، خیر مقدم اور مبارک باد کے لائق ہے۔

تیسرے شیڈول میں صدر اور وزیر اعظم دونوں عہدوں کے حلف نامہ میں مسلمان ہونے کے اقرار کے ساتھ یہ الفاظ بھی شامل ہیں:

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ایک مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے ایک ہونے پر، اللہ کی کتابوں پر، قرآن پر جو، ان میں سے آخری کتاب ہے۔ آخری نبیؐ ہونے کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اور اس بات پر کہ آپؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہو سکتا، یوم حساب پر اور قرآن و سنت کی تمام تعلیمات اور ضروریات پر ایمان رکھتا ہوں۔"

ان جملوں میں ایک صحیح العقیدہ مسلمان کی پوری تعریف آگئی ہے۔ دستور میں اس تعریف کی شمولیت اس لئے ضروری تھی کہ اس کے بغیر کوئی بھی شخص، خواہ کتنے کافرانہ عقائد رکھتا ہو، مسلمانوں جیسا نام رکھ کر اسلامی مملکت کے ان اہم ترین عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا۔ حلف نامہ میں مسلمان کی یہ تعریف شامل ہونے کے بعد یہ خطرہ کم ہو گیا ہے اور جب تک کوئی شخص کھلی منافقت سے کام نہ لے، کسی کافرانہ عقیدے کے ساتھ صدارت یا وزارت عظمیٰ کے منصب تک نہیں پہنچ سکتا۔ بنیادی اسلامی عقائد کی توضیح کا یہ اعزاز بھی پاکستان کے اس دستور کو پہلی بار حاصل ہوا ہے

اور پچھلے کسی دستور میں یہ توضیح موجود نہیں تھی۔"10

بھٹو حکومت اور احرار کا متحدہ محاذ مخالفت

ثابت ہوا کہ یہ جنگ زرگری تھی جس میں مسٹر بھٹو آئین 1973ء کی تشکیل کے وقت سے عقیدۃً احراری ملّاؤں کے سوفیصدی ہم نوا تھے اور احمدیوں کو منکر ختم نبوت یقین کرتے تھے اور جماعت احمدیہ کو اپنے اقتدار کا سیاسی حریف سمجھ کر اسے کچل دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 7 ستمبر 1974ء کی قرارداد اسمبلی اور ان کی وضاحتی تقریر کے صرف چند ہفتہ بعد، پہلے سے زیادہ وسیع پیمانے پر قتل وغارت اور دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا گیا جس پر پاکستان کے قدیم اور جری صحافی جناب ثاقب زیروی تڑپ اٹھے اور آپ نے اپنے رسالہ "لاہور" (10 مارچ 1975ء) کے خصوصی اداریہ میں بھٹو صاحب کی اسمبلی میں وضاحتی تقریر کے الفاظ دے کر لکھا:

"اربابِ اختیار واقتدار کی مصلحت اندیشیاں یا شومئ استحکام پاکستان کہ ابھی اس تقریر دلپذیر کی گونج وطن عزیز کی فضاؤں میں سنائی دے ہی رہی تھی کہ پنجاب کے ایک ڈویژنل صدر مقام سرگودھا میں اس کی روح کا وہ مذاق اڑایا گیا اور وہ ذلیل ترین بے حرمتی کی گئی کہ شرافت وانصاف آج تک اس غارت گری اور اس تہذیب سوزی کی کوئی موثر اور قابل یقین تاویل نہیں کر پائے۔ یعنی تقریر کے بعد ٹھیک اٹھائیسویں دن 5 اکتوبر 1974ء کو ایک فتنہ ساز کی خود تراشیدہ خراشوں پر اشتعال دلا کر جماعتِ احمدیہ کے ارکان کے 34 مکان اور گیارہ دوکانیں دن دہاڑے لوٹی، اجاڑی اور جلا کر راکھ بنادی گئیں۔ آگ اور خون کی یہ ہولی (جس کا اعتراف دبے الفاظ میں خود انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب نے بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ 9) پوری دیدہ دلیری، ڈھٹائی بلکہ بے حیائی سے نظم ونسق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کی کھیلی گئی اور اس دن کھیلی گئی جس دن پنجاب کے سب سے بڑے وزیر اور ان کے معتمد ترین وزیر صغیر بھی وہاں موجود تھے اور جب ڈویژن کی پولیس کا بیشتر حصہ بھی ان کے جلوس کی شوکت کو دوبالا کرنے اور ان کے جلسہ کی رونق بڑھانے کے لئے شہر میں موجود تھا۔ پاکستان کے اس معزز ومحب وطن طبقے کے ارکان کی املاک اور اثاثوں کو دن کے آٹھ بجے سے لے کر شام کے چار بجے تک نظم ونسق کے تمام ذمہ داروں کی موجودگی میں لوٹنے کے بعد جلا کر راکھ بنا دیا گیا۔ لیکن

نہ وزیر اعلیٰ کو اپنے فرائض یاد آئے۔
نہ اس ڈویژن کے نمائندہ وزیر کے کانوں پر کوئی جوں رینگی۔
نہ کمشنر ،ڈی آئی جی، ڈپٹی کمشنر اور ایس پی صاحبان ہی کو اپنی ذمہ داریاں یادآئیں۔ اور
نہ حکومتی پارٹی یا کسی اپوزیشن پارٹی ہی کو وزیر اعظم کی یقین دہانی کی لاج رکھنے کا خیال آیا۔
یہ مکان اور دکانیں سارادن جلتی رہیں اور عوام کے مسلح پاسبان اس خونی ڈرامے کو دیکھ کر صرف ہنستے اور قہقہے ہی لگاتے رہے۔ فائر بریگیڈ اگر چند گھنٹوں کے بعد آئے بھی تو معتوبین کی املاک کو بچانے کے لئے نہیں بلکہ ادھر ادھر کے مکانوں اور دوکانوں کی حفاظت کے لئے۔ جلائی جانے والی ان دوکانوں میں ایک ایسا بُک ڈپو بھی تھا جس میں ہزاروں نسخے قرآن پاک کے تھے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان پر رحم کرے۔ ان بربریت کے ماتوں کو خدائے برحق کے پاکیزہ و منزہ کلام کو جلا کر خاکستر بنا دینے میں بھی کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔"

احرار نے اسمبلی کی خالص سیاسی اور دستوری قرار داد کی آڑ میں دنیا بھر میں یہ پُرزور پراپیگنڈہ کیا کہ احمدی دائرہ اسلام سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے دوسرے مسلم ممالک بھی انہیں غیر مسلم بلکہ مرتد اقلیت قرار دیں تا یہ "فتنہ" صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے اور واقعات گواہ ہیں کہ مسٹر بھٹو اور ان کی حکومت نے اس ناپاک سازش کی تکمیل میں تحریک پاکستان کے دشمن احراری عناصر کی دل کھول کر امداد اور پشت پناہی کی۔ بہت سے احمدیوں کو ملاؤں کی خوشنودی اور انتخاب جیتنے کی خاطر ظالمانہ طور پر ان کی ملازمتوں سے نکال باہر کیا اور ان پر قافیہ حیات تنگ کر کے پاکستان سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ بے شمار احمدیوں کو جیل خانوں میں ٹھونس دیا گیا اور کئی عُشّاق رسول عربی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم محض احمدی ہونے کے جرم میں نہایت بے دردی سے شہید کر دیئے گئے مگر حکومت نے ہر قاتل کو "غازی ختم نبوت" سمجھتے ہوئے قتل وغارت کی کھلی چھٹی دے دی اور کسی ایک کو بھی گرفتار کر کے سزا نہیں دلوائی۔ اسی پر بس نہیں اس نے ربوہ کے غریب احمدیوں کی 19 ایکڑ زمین غصب کر کے اپنے محبوب طائفہ کے حوالہ کر دی تا وہ اپنی مسجد ضرار اور احراری کالونی کے ذریعہ مرکز احمدیت کو فتنہ وفساد کا مستقل اڈہ بنالیں۔

احرار کا اپنے محافظ ختم نبوت کی بارگاہ میں ہدیہ عقیدت کا عملی مظاہرہ

احرار لیڈر اسمبلی کی کارروائی سے قبل بھٹو صاحب کے بوٹ اپنی داڑھیوں سے صاف کرنے کی پیشکش کر چکے تھے۔ چنانچہ اب جو اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کر لی تو انہوں نے شورش کاشمیری کی تحریک پر ملک بھر میں جشن منایا اور بھٹو صاحب کو الیکشن میں ووٹ دینے اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے جہازی سائز کے جلی قلم سے ایک اشتہار شائع کیا جس پر اپنے "امیر شریعت" اور اپنے محسن اعظم اور "محافظ ختم نبوت" مسٹر بھٹو کی تصاویر دیں اور پھر حسب ذیل الفاظ میں پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کی تلقین کی۔

"امیر شریعت حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری کا اعلان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے.... باغ بیرون دہلی دروازہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔ **جو شخص قادیانیوں کا مسئلہ حل کر دے گا اس کے کتے بھی میرے لئے باعث عزت ہوں گے۔"**

جناب قائد عوام بھٹو صاحب نے جس دلیری اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اس دیرینہ مسئلہ کو حل کیا ہے، اس سے تمام عالم اسلام قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا ممنون و مشکور ہے۔ میں بحیثیت سابق صدر مجلس احرار اسلام لاہور کے تمام احراری بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ الیکشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بھرپور حمایت کریں۔

منجانب: حاجی محمد جہانگیر سابق صدر مجلس احرار اسلام لاہور۔
جہانگیر بک ڈپو۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔

یہ تو "امیر شریعت احرار" کا فرمان تھا۔ اب جناب رشید اختر صاحب ندوی جیسے غیر احمدی اہلِ قلم کے جذبات عقیدت ملاحظہ ہوں۔ جناب اختر صاحب نے "ذوالفقار علی بھٹو" کی سوانح حیات کا پہلا حصہ ادارہ معارف ملّی اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع کیا جو قریباً آٹھ سو صفحات پر محیط تھا۔ آپ نے کتاب کے دیباچہ صفحہ 7 پر تحریر فرمایا:

"میرے نزدیک ذوالفقار علی بھٹو نے جون 1969ء کے بعد اس ملّت کے احیاء کے سلسلہ میں وہی خدمت انجام دی ہے جو جناب محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، نورالدین زنگی، حضرت صلاح الدین ایوبی اور آخری ایام میں حضرت اورنگ

زیب عالمگیر اور حیدر علی نے سر انجام دی تھی۔"

قائد عوام ریسرچ اکیڈمی کا قیام

بھٹوصاحب کی قرارداد تکفیر کی بدولت ان کے لاہوری عقیدت مندوں نے "قائد عوام ریسرچ اکیڈمی" قائم کی جس کی غرض وغایت ایک جہازی سائز کے اشتہار کے ذریعہ پبلک کو ان الفاظ میں بتائی گئی۔

"محسن قوم، فخر ایشیا، قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو بلاشبہ ایک مقدس تحریک کا نام ہے۔ زمانہ گواہ ہے کہ اس فرزند خلیل نے تباہیوں، بربادیوں اور قومی مایوسیوں کو مردانہ وار قبول کر کے مثالی تدبر وفراست، انتہائی سرعت، تندہی اور جرأت و شجاعت کے ساتھ کھنڈرات پر عالیشان عمارات تعمیر کر دکھائی ہیں۔ قائد عوام کی اعلیٰ وارفع سوچ اور فکر نے قوم کو فکر نو عطا کر دی ہے۔ چنانچہ قائد عوام کے مجاہدانہ سرفروشانہ اور حریت پرستانہ کارناموں اور ارشادات وافکار کو عظیم قومی سرمایہ سمجھ کر "تحریک فکر قائد عوام" کا قیام عمل میں لایا جاکر قائد عوام کے کارناموں پر ریسرچ اکیڈمی قائم کی گئی ہے۔"

اس کے بعد لکھا:

"پہلے مرحلہ میں درج ذیل موضوعات پر ریسرچ ورک کرنے والوں کو ہر موضوع پر علی الترتیب ایک ہزار روپے، پانچصد روپے انعامات دیئے جائیں گے۔ ملک کے ذہین و متین افراد خصوصاً وزرا، قومی وصوبائی اسمبلیوں کے اراکین، صحافی، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز، اساتذہ، طلباوطالبات سنجیدہ فکر پارٹی کارکنان کو اس ریسرچ ورک میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ قائد عوام ریسرچ اکیڈمی دوسرے مرحلہ کا عنقریب اعلان کر دے گی۔"

بعد ازاں جن بیس موضوعات میں دعوت تحقیق دی گئی، ان میں سے چند یہ تھے۔

قائد عوام اور اتحاد بین المسلمین۔ ایشیائی اور اسلامی دنیا کے محبوب لیڈر قائد عوام کا عطا کردہ آئین دیگر ممالک کے دساتیر کے مقابلے میں بہترین آئینی دستاویز ہے۔

قائد عوام بحیثیت عاشق رسولؐ، محافظ ختم نبوت اور ان کی اسلامی خدمات۔

یہ اشتہار رانا اعجاز احمد خاں ایڈووکیٹ چیئرمین تحریک فکر قائد عوام صدر دفتر سلیمی چیمبرز

ایڈورڈ روڈ لاہور کی طرف سے دیا گیا اور اسکی طباعت رضاکارانہ طور پر نیازی پرنٹنگ پریس 12 ہسپتال روڈ لاہور نے کی۔

نعمت اللہ ولی کے نام پر جعلی اشعار

بھٹو صاحب کے رسوائے عالم فیصلہ 7 ستمبر پر ہدیہ تبریک پیش کرنے کی ایک صورت یہ کی گئی کہ حضرت نعمت اللہ ولی کے نام پر شائع شدہ ایک قصیدہ میں مندرجہ ذیل جعلی اشعار کا اضافہ کر کے پورے ملک میں بذریعہ اشتہاران کا خوب پراپیگنڈہ کیا تا انہیں ایک موعود اور مذہبی شخصیت کی حیثیت دی جاسکے چنانچہ لکھا:-

"حضرت شاہ نعمت اللہ ولی نے اپنی منظوم پیشگوئیوں میں واضح طور پر ذوالفقار علی بھٹو کے بر سر اقتدار آنے کا بھی واضح اشارہ کر دیا تھا۔ انہوں نے پیشگوئی کی تھی۔

با نام ذال مردے حق گو ونیک نامے

گیرد عناں شود زوکارے مجاہدانہ

یعنی ذال سے شروع ہونے والے نام کا ایک شخص جو حق گو اور شہرت یافتہ ہو گا عنان حکومت ہاتھ میں لے گا اور اس کے ہاتھ سے کوئی مجاہدانہ کام انجام پائے گا۔ اس پیشگوئی سے پہلے دو شعر اور بھی ہیں:

الزام کفر باشد برنیک خُو مسلماں

از زاہداں بہ خامہ اقدام کافرانہ

یعنی نیک خُو مسلمانوں پر زاہدوں کے قلم سے کفر کا الزام لگانے کا کافرانہ کام واقدام کیا جائے گا۔

مثل یہوداں فرقہ در قلب کبر ونخوت

طامع نمود دنیا انداز عالمانہ

یعنی یہودیوں کی طرح ایک فرقہ ہو گا جس کے دلوں میں کبر ونخوت بھری ہو گی۔ یہ فرقہ شہرت اور دنیاوی جاہ کا لالچی ہو گا۔ بظاہر اس کا انداز عالمانہ ہو گا۔

عرب صحافت اور بھٹو کے مامور من اللہ ہونے کا پراپیگنڈہ

جہاں تک عرب صحافت کا تعلق ہے۔ 1973ء کے آئین کے منظر عام پر آتے ہی اس نے بھٹو کی شان میں قصیدہ خوانی شروع کر دی اور یہاں تک غلو کیا کہ انہیں خدا کی طرف سے مبعوث قائد

قرار دینے لگے۔ چنانچہ عرب کے بااثر مقبول اور کثیر الاشاعت روزنامہ "الاتحاد" نے 11 دسمبر 1973ء کی اشاعت میں صفحہ 3 پر بھٹو صاحب کی بڑی تصویر کے ساتھ ان کا تعارف درج ذیل الفاظ سے جلی قلم سے کرایا:

" القادم الينا اليوم زعيم من الزعماء الذين يبعث الله بهم الى الامم عند ماتشتد المحن وتتكاثف ظلمات الياس ذوالفقار على بوتو واحد من هؤلاء الرجال العظام القلائل فى تاريخ كل امة"

یعنی ذوالفقار علی بھٹو ان زعماء میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ امم کے مصائب اور مایوسی کے ظلمات میں مبعوث فرماتا ہے۔ بھٹو صاحب کا شمار ان عظیم شخصیات میں سے ہوتا ہے جو کسی امت کی تاریخ میں شاذونادر ہی ابھرتی ہیں۔

حواشی:

1 "نوائے وقت" یکم جولائی 1974ء صفحہ 6 کالم 3۔

2 لطائف علمیہ ترجمہ "کتاب الاذکیا" صفحہ 148 تالیف حضرت ابن جوزی ناشر دارالاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر 1 اشاعت اول مارچ 1974 بنام مولوی محمد رضی عثمانی۔

3 "اور لائن کٹ گئی" صفحہ 18 از مولانا کوثر نیازی ناشر جنگ پبلشرز لاہور۔ اشاعت ششم مارچ 1988ء۔

4 "مساوات" لاہور 8 ستمبر 1974ء صفحہ 10 کالم 1۔

5 روزنامہ "نوائے وقت" یکم اکتوبر 1974 (اداریہ)۔

6 ہفت روزہ "لیل ونہار" لاہور 13-19 ستمبر 1974ء۔ بحوالہ "بھٹو اور قادیانی مسئلہ" صفحہ 118 مولف سید محمد سلطان شاہ ناشر جنگ پبلشرز اشاعت اوّل اگست 1993ء۔

7 اردو ترجمہ دستور صفحہ 162-157 زیر نگرانی جسٹس ارشاد حسن خاں ناشر کلاسک چوک ریگل دی مال لاہور۔ اشاعت اگست 1992ء۔

8 ایضاً

9 ہفت روزہ "لولاک" 24 اگست 1973ء صفحہ 7 کالم 1۔

10 "نفاذ شریعت اور اس کے مسائل" صفحہ 36-35 ناشر مکتبہ دارالعلوم کراچی جون 1990ء۔

اٹھائیسویں فصل

بھٹو اور مفتی محمود سوشلزم کے سفیر

7 ستمبر 1974ء کا فیصلہ بھٹو اور مفتی محمود کی ساز باز سے ہوا جو عالمی سوشلزم کے پُر جوش نمائندے اور سر سے لیکر پاؤں تک سوشلسٹ تھے۔ چنانچہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی نئی پیپلز پارٹی کی تشکیل سے قبل برملا اعلان کر دیا تھا کہ میری پارٹی سوشلزم کے اصولوں کو اپنائے گی۔[1]

جہاں تک مفتی محمود کی دیوبندی پارٹی ''جمعیۃ علمائے اسلام'' کا تعلق ہے، صاحبزادہ فاروق علی صاحب سابق چیئرمین رہبر کمیٹی و سپیکر نیشنل اسمبلی کا بیان ہے کہ 1970ء[2] الیکشن میں میرے مقابل جمعیۃ علماء اسلام کے مفتی عبد اللہ دستبردار ہو گئے کہ ''پیپلز پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کے درمیان اچھے تعلقات تھے۔''[3]

پھر کہتے ہیں:-

> ''یوں تو جمعیت اور پارٹی کے درمیان دوستانہ مراسم پہلے ہی موجود تھے جمعیت بھی سرمایہ داری کے خلاف تھی لیکن دونوں پارٹیوں کے درمیان باقاعدہ اتحاد کا آغاز لاہور میں قرآن سوزی کے واقعہ کے بعد ہوا۔ جمعیت نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ حرکت سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے ایجنٹوں کی ہے۔ اگرچہ ہمارے مابین چند مشترکہ قدریں موجود تھیں اور ہم ایک دوسرے کے قریب تھے مگر اس واقعہ کے بعد جمعیت نے جو سچا موقف اختیار کیا اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر ہم کسی مذہبی تنظیم سے اتحاد کرنا چاہیں تو صرف جمعیۃ ہی ایسی تنظیم ہے جس سے اتحاد کیا جا سکتا ہے۔ مزید بر آں حالات نے ہمیں یہ بھی باور کرا دیا کہ اگر جمعیۃ سے اتحاد نہیں کریں گے تو سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے ایجنٹ ہمیں کافر قرار دے کر اپنی سیاسی دکان چمکائیں گے.... بھٹو نے کہا کہ ٹھیک ہے اگر کسی دینی جماعت سے اتحاد کرنا ہے تو جمعیۃ علمائے اسلام کو ترجیح دی جائے۔ کیونکہ اس جماعت کی جڑیں عوام میں ہیں اور **یہ جماعت اپنے کردار اور روایات کے حوالے سے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف ہے**.... علاوہ ازیں یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ ہم لوگ جمعیت کے مذہبی نظریات سے قریب ہیں اور جمعیت ہمارے سیاسی نظریات سے قریب ہے۔ کیونکہ اس سے قبل 1968ء میں جب بعض مذہبی حلقوں نے ترقی پسندوں کے خلاف کفر کا

فتویٰ دیا تو جمعیت اس سیاسی فتویٰ بازی کے خلاف سینہ سپر ہو گئی۔ جمعیت کا موقف یہ تھا کہ اگر فتویٰ بازی کی اس مہم کو روکا نہ گیا تو ملک کی ایک بڑی اکثریت غیر مسلم قرار پائے گی۔ جمعیت نے نہ صرف ہم پر بلکہ اکثر اہل ملک پر ثابت کر دیا تھا کہ جمعیت علماء اسلام میں رجعت پسندانہ طرز فکر کی گنجائش نہیں۔"[4]

یہاں بھٹو دور حکومت کے وزیر اعلیٰ پنجاب جناب محمد حنیف رامے صاحب کے اشتراکی خیالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"بچے کھچے پاکستان میں پیپلز پارٹی بر سر اقتدار آگئی۔ ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم بن گئے۔ میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ میں تو ایک سوچ کے تحت سیاست میں شامل ہوا تھا۔ ابتداً بھٹو مرحوم نئی جماعت نہیں بنانا چاہتے تھے۔ میں نے اور میرے جیسے کچھ لوگوں ہی نے انہیں اس پر آمادہ کیا تھا۔ میں پنجاب میں پہلا شخص تھا جس نے 1966ء میں ان سے اقتدار سے الگ کیے جانے کے بعد مل کر الاشتراکیۃ الاسلامیہ کے حوالے سے ایک نئی جماعت بنانے کے لئے کہا تھا۔ اس وقت مصر میں صدر ناصر کا انقلاب آچکا تھا اور اسلامی سوشلزم کے فلسفے کا عالم عرب میں بڑا چرچا تھا۔ یہی فلسفہ اقبال، قائد اعظم[5] اور لیاقت علی خان کے افکار میں بھی نمایاں تھا۔ پھر میرے ہفت روزہ نصرت نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین مسٹر اے۔ کے سومار اور میرے درمیان اسلامی سوشلزم کے موضوع پر ہونے والی ملک گیر بحث پر ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کرر کھا تھا۔ اگرچہ پیپلز پارٹی نے "اسلام ہمارا دین ہے" اور سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے دو الگ الگ نعرے دیئے تھے لیکن میری سوچ اور عوامی دباؤ کے تحت یہ دونوں نعرے "اسلامی سوشلزم" کی ایک اصطلاح میں ڈھل گئے تھے۔"[6]

اس ضمنی بات کی طرف اشارہ کر کے ہم دوبارہ پہلے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ اشتراکی وحدت فکر کے علاوہ بھٹو صاحب اور جمعیۃ کے دیوبندی علماء کا عوامی خواہشات اور امنگوں کے مطابق فیصلہ کرانے کا دوسرا نام ہی سوشلزم ڈیماکریسی ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مشہور دیوبندی مفتی محمد شفیع صاحب کے بیٹے محمد تقی عثمانی صاحب (سابق جسٹس شریعت بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان) تحریر کرتے ہیں:

"اسلام" اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جانے کا نام ہے، اور اس کی "شریعت" کے واجب العمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے اور ایک بندے کی حیثیت

سے ہمارا فرض ہے کہ اسے مان کر اس پر عمل کریں۔ خواہ عوام اس سے خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ اِتبّاع شریعت کا مقصد مخلوق کو نہیں، خالق کو راضی کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے نفاذ کے پیچھے قوت حاکمہ عوام کی مرضی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ "اسلام" عوام کے پیچھے پیچھے چلنے اور ان کی خواہشات کی پیروی کے لئے نہیں بلکہ ان کی قیادت ور ہنمائی کرنے اور انہیں نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لئے آیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو آسمان وزمین میں فساد پھیل جائے۔

"اسلام" تو ایسے ماحول میں آیا تھا کہ اس کے ارد گرد عوام کی اکثریت شروع میں اسے ناپسند کرتی تھی، اگر "عوام کی مرضی" ہی فیصلہ کن ہوتی تو اسلام کو کبھی بھی نافذ ہونا نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ مخالفین کے نرغے میں پروان چڑھا ہے۔ اس نے لوگوں کے طعنے سہہ کر اور ملامتیں سن کر اپنی راہ بنائی ہے اور عوام کی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے ان کی اصلاح کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے۔ لہٰذا "اسلام" کو "عوام کی مرضی" اور "جمہوریت" کے تابع قرار دینا درحقیقت اسلام کے بنیادی تصور ہی سے متضاد ہے۔

پھر یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ عموماً "سب کے لئے قابل قبول" ہونے کے اس "نظریئے" کی ساری زد بیچاری "شریعت" ہی پر پڑتی ہے۔ یہ خیال ہمارے "جمہوریت پسند" حکام اور دانشوروں کو بہت کم آتا ہے کہ جو قوانین ہم پر چالیس سال سے مسلط چلے آرہے ہیں، وہ کتنے افراد کیلئے "قابل قبول" ہیں؟ وہ کون سے عوام ہیں جنہوں نے ان قوانین کو سند منظوری عطا کی ہے؟ اور "سب کے لئے قابل قبول" کی یہ شرط ان قوانین پر کیوں لاگو نہیں ہوتی؟۔ وہاں تو حال یہ ہے کہ ایک بدیسی اور غیر مسلم حاکم ہمارے سینوں پر بندوق رکھ کر یہ قوانین ہمارے سروں پر مسلط کر گیا اور ہم ہیں کہ انہیں چالیس سال سے اپنے اوپر نہ صرف لادے چلے آ رہے ہیں، بلکہ مسلمان عوام کی فریاد وفغاں کے باوجود اس بات پر مصر ہیں کہ یہ قوانین غیر محدود مدت تک عوام پر مسلط رہیں گے، تا آنکہ ایسی "شریعت" وجود میں نہ آجائے

جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ کسی کی آمدنی کم ہو جائے گی، کسی کے خرچ میں اضافہ ہو گا، کسی کی لیڈری جاتی رہے گی، کسی کے منصب پر حرف آئے گا۔ کسی کی بے مہار آزادی میں فرق پڑے گا۔ کسی کے عیش و تنعم میں کمی ہو گی اور ایسے افراد جو ملکی مسائل کو اسی قسم کے مفادات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں، وہ یقینا ایسے احکام کے نفاذ کی مخالفت کریں گے یا کم از کم انہیں ناگوار سمجھیں گے جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی تعداد کم ہے لیکن اثر و رسوخ خاصا ہے، اور وہ نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے بجائے لادینی طرز زندگی کو پسند کرتے ہیں اور نفاذ اسلام کے ہر اقدام کی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اسلام کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا "سب خوش رہیں" کی پالیسی کے ساتھ "شریعت" کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر شریعت پر عمل کرنا ہے اور اللہ کے لئے کرنا ہے تو اس کے لئے کچھ حلقوں کی مخالفت مول لینی ہی پڑے گی۔ اگر ہم اس مخالفت کے لئے تیار نہیں ہیں تو نفاذ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔"[7]

حواشی:

[1] "ذوالفقار علی بھٹو" صفحہ 131 تالیف جناب ایم ایس نیاز۔ ناشر مقبول اکیڈمی چوک انار کلی بازار۔ لاہور۔ طبع اوّل 1976ء۔

[2] انتخاب 1970ء میں موصوف پیپلز پارٹی ملتان کے چیئر مین تھے۔

[3] "جنگ" جمعہ میگزین 3 ستمبر 1982ء صفحہ 4 کالم 5-4۔

[4] ایضاً صفحہ 5 کالم 3-2۔

[5] اقبال اور حنیف رامے کے تصور سوشلزم کو قائد اعظم کی طرف منسوب کرنا سراسر زیادتی اور خلاف حقیقت بات ہے جس پر قائد اعظم کی تحریرات و خطابات گواہ ہیں۔

[6] ماہنامہ "ترجمان القرآن" اکتوبر 2003ء صفحہ 122۔

[7] "نفاذ شریعت اور اس کے مسائل" صفحہ 184-182۔ مکتبہ دار العلوم کراچی۔ اشاعت جون 1990ء۔

انتیسویں فصل

حضرت مسیح موعودؑ اور آپ کے ہم عصر مغرب کے دہریہ فلاسفر

اسلام نے چودہ سو سال قبل جس خدا کا تصور پیش کیا ہے سورۃ فاتحہ میں اس کی پہلی صفت رب العالمین بتائی گئی جس کی تفسیر حضرت بانی احمدیت مسیح موعودؑ نے درج ذیل الفاظ میں فرمائی ہے۔

”اس کی ربوبیت کسی خاص قوم تک محدود نہیں اور نہ کسی خاص زمانہ تک اور نہ کسی خاص ملک تک بلکہ وہ سب قوموں کا رب ہے اور تمام زمانوں کا رب ہے اور تمام مکانوں کا رب ہے اور تمام ملکوں کا وہی رب ہے۔“[1]

نیز فرمایا:

”رب العالمین کیسا جامع کلمہ ہے۔ اگر ثابت ہو کہ اجرام فلکی میں آبادیاں ہیں تب بھی وہ آبادیاں اس کلمہ کے نیچے آئیں گی۔“[2]

اسلامی نقطہ نگاہ سے خدا تعالیٰ رب العالمین بھی ہے اور مالک یوم الدین بھی جس کے لطیف معنی حضرت مسیح موعودؑ کے الفاظ میں یہ ہیں کہ:-

”وہ خدا ہر ایک کی جزا اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اس کا کوئی کارپرداز نہیں جس کو اس نے زمین و آسمان کی حکومت سونپ دی ہو اور آپ الگ ہو بیٹھا ہو اور آپ کچھ نہ کرتا ہو، وہی کارپرداز سب کچھ جزا دیتا ہو یا آئندہ دینے والا ہو۔“[3]

غذا کا مسئلہ کوئی دو سو سال سے مختلف ممالک کے ماہرین معاشیات کے زیر بحث آرہا ہے۔ مگر قرآن مجید نے اپنا یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ خواہ کیسے ہی انقلابات آئیں اور انسانی آبادی کس قدر بڑھ جائے اللہ تعالیٰ اس زمین سے اس کی ضروریات کے دائمی سامان کرتا رہے گا۔ چنانچہ فرمایا:

”وَ جَعَلَ فِيۡهَا رَوَاسِىَ مِنۡ فَوۡقِهَا وَ بٰرَكَ فِيۡهَا وَ قَدَّرَ فِيۡهَاۤ اَقۡوَاتَهَا“

(حٰم السجدہ:11)

(ترجمہ) اس نے زمین پر پہاڑ بنائے ہیں اور اس میں بڑی برکت رکھی ہے اور اس میں رہنے والوں کے کھانے پینے کے لئے ہر چیز کو اندازہ کے مطابق بنادیا ہے۔

حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں:

”اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ایک زمانہ میں زمین کو پوری غذا پیدا کرنے

کے قابل نہیں سمجھا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اس کارد کرتا ہے اور فرماتا ہے ہم نے زمین
میں ایسے سامان پیدا کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے وہ حسب ضرورت غذا دے گی خواہ
زمین سے نکال کر یا نئی غذا کے ایجاد ہونے یا آسمانی شعاعوں کی مدد سے "۔4

اس طرح قرآن مجید نے قبل از وقت خبر دی کہ

اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ٭ وَ مَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ۔

(الحجر:22)

یعنی دنیا کی تمام چیزوں کے ہمارے پاس خزانے ہیں مگر بقدر ضرورت ومقتضائے مصلحت وحکمت ان کو نازل (یعنی پیدا) کرتے ہیں۔

اس کے برعکس یورپ وامریکہ کے ہر مذہب یا دہریہ فلاسفر اور معاشیات کے سکالرز عرصہ سے سرگرداں وپریشاں ہیں کہ انسانی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، ان کی غذا کا کیا سامان ہو گا؟ چنانچہ مالتھس(Malthus) نے اپنی تحقیقات کی بنیاد ہی اسی مفروضہ پر رکھی۔ اس طرح سینٹ سائن پرودھن (Proudhon) اور فوریئے (Fourier)، ایلفرڈ مارشل ڈیون پورٹ سلیگ مین، ٹاسگ، واکر اور ویلبین کی علمی کاوشوں میں یہی روح کارفرما تھی۔

حضرت مسیح موعودؑ کے ہم عصر ماہرین اقتصادیات میں کارل مارکس کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوئی کیونکہ اس نے اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" میں سوشلزم کا فلسفہ پیش کیا جس نے پوری دنیا میں دہریت کی بساط بچھادی اور رب العالمین کے فطری نظام معیشت کو تہہ وبالا کرنے کی ناکام کوشش کی۔

یہ تاریخی توارد یقینا عالم الغیب خدا کی قدرت نمائی کا ایک کرشمہ ہے کہ اس دہریہ فلاسفر (ولادت 5 مئی 1818ء۔ وفات 14 مارچ 1883ء) کے زہر کا تریاق چونکہ مہدی آخر الزماں اور آپ کی جماعت کے ذریعہ مقدر تھا اس لئے اس دہریہ فلسفی اور ماہر معاشیات کی زندگی کے بعض اہم مراحل کے ساتھ ساتھ حضرت مسیح موعودؑ کی زندگی کے احوال ووقائع بھی متوازی طور پر چلتے رہے ہیں مثلاً حضرت اقدس مسیح موعودؑ کی ولادت 1835ء میں ہوئی اور کارل مارکس نے اسی سال ٹرائر (Trier) کے ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ 1872ء میں کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" کا روسی ترجمہ شائع ہوا۔ اسی سال حضرت اقدس نے ملکی اخبارات میں دینی مضامین کا سلسلہ جاری کر کے قلمی جہاد کا آغاز فرمایا۔

اس طرح کارل مارکس کی زندگی کا آخری سال مسلمہ طور پر 1882ء ہے جس کے بعد وہ بیمار

ہو کر راہی ملک عدم ہوا۔ ٹھیک اسی سال حضور کو ماہ مارچ میں پہلا الہام ماموریت ہوا جس میں آپ کو الہاماً بتایا گیا کہ باطل مذاہب اور فلسفوں پر دین اسلام کا عالمی غلبہ آپ کے ظہور سے مقدر ہے۔ حضرت اقدس نے 1882ء میں ہی یہ الہام براہین احمدیہ حصہ دوم میں شائع کرتے ہوئے ایک نہایت بصیرت افروز نوٹ بھی شائع فرمایا جس میں قرآنی فلسفہ معاشیات پر بھی روشنی ڈالی اور انیسویں صدی کے مغربی فلاسفروں اور مفکروں کی نام نہاد تحقیقات کی دھجیاں بکھیر دیں چنانچہ حضور نے آیت:-

اَھُمۡ یَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّکَ ؕ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَھُمۡ مَّعِیۡشَتَھُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا۔ (الزخرف:33)

کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے بڑے بڑے مالداروں اور رئیسوں میں سے کسی بھاری رئیس اور دولت مند پر کیوں نازل نہ ہوا۔ تا اس کی رئیسانہ شان کے شایان ہوتا اور نیز اس کے رعب اور سیاست اور مال خرچ کرنے سے جلد تر دین پھیل جاتا۔ ایک غریب آدمی جس کے پاس دنیا کی جائداد میں سے کچھ بھی نہیں کیوں اس عہدے سے ممتاز کیا گیا (پھر آگے بطور جواب فرمایا) اَھُمۡ یَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّکَ۔ کیا قسّامِ ازل کی رحمتوں کو تقسیم کرنا ان کا اختیار ہے۔ یعنی یہ خداوندِ حکیم مطلق کا فعل ہے کہ بعضوں کی استعدادیں اور ہمتیں پست رکھیں اور وہ زخارف دنیا میں پھنسے رہے۔ اور رئیس اور امیر اور دولتمند کہلانے پر پھولتے رہے اور اصل مقصود کو بھول گئے اور بعض کو فضائل روحانیت اور کمالات قدسیہ عنایت فرمائے اور وہ اس محبوب حقیقی کی محبت میں محو ہو کر مقرب بن گئے اور مقبولان حضرت احدیت ہو گئے۔ (پھر بعد اس کے اس حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو اس اختلافِ استعدادات اور تباینِ خیالات میں مخفی ہے) نحن قسمنا بینھم معیشتھم۔ یعنی ہم نے اس لئے بعض کو دولتمند اور بعض کو درویش اور بعض کو لطیف طبع اور بعض کو کثیف طبع اور بعض طبیعتوں کو کسی پیشہ کی طرف مائل اور بعض کو کسی پیشہ کی طرف مائل رکھا ہے۔ تا ان کو یہ آسانی پیدا ہو جائے کہ بعض کے لئے بعض کا ربر آر اور خادم ہوں اور صرف ایک پر بھار نہ پڑے اور اس طور پر مہمات بنی آدم

بآسانی تمام چلتے رہیں۔ اور پھر فرمایا کہ اس سلسلہ میں دنیا کے مال و متاع کی نسبت خدا
کی کتاب کا وجود زیادہ تر نفع رساں ہے۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے جو ضرورت الہام کی
طرف فرمایا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے اور بجز ایک دوسرے کی
مدد کے کوئی امر اس کا انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک روٹی کو دیکھئے جس پر زندگانی
کا مدار ہے۔ اس کے طیار ہونے میں کس قدر تمدن و تعاون درکار ہے۔ زراعت کے
تردّد سے لے کر اس وقت تک کہ روٹی پک کر کھانے کے لائق ہو جائے، بیسیوں پیشہ
وروں کی اعانت کی ضرورت ہے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ عام امور معاشرت میں
کس قدر تعاون اور باہمی مدد کی ضرورت ہو گی۔ اسی ضرورت کے انصرام کے لئے
حکیم مطلق نے بنی آدم کو مختلف طبیعتوں اور استعدادوں پر پیدا کیا۔ تا ہر ایک شخص
اپنی استعداد اور میل طبع کے موافق کسی کام میں بہ طیبِ خاطر مصروف ہو۔ کوئی کھیتی
کرے۔ کوئی آلات زراعت بناوے۔ کوئی آٹا پیسے۔ کوئی پانی لاوے۔ کوئی روٹی
پکاوے۔ کوئی سوت کاتے۔ کوئی کپڑا بنے۔ کوئی دوکان کھولے۔ کوئی تجارت کا اسباب
لاوے۔ کوئی نوکری کرے اور اس طرح پر ایک دوسرے کے معاون بن جائیں اور
بعض کو بعض مدد پہنچاتے رہیں۔ پس جب ایک دوسرے کی معاونت ضروری ہوئی
تو ان کا ایک دوسرے سے معاملہ پڑنا بھی ضروری ہو گیا۔ اور جب معاملہ اور معاوضہ
میں پڑ گئے اور اس پر غفلت بھی جو استغراق امور دنیا کا خاصہ ہے، عائد حال ہو گئی
تو ان کے لئے ایک ایسے قانون عدل کی ضرورت پڑی جو ان کو ظلم اور تعدی اور بغض
اور فساد اور غفلت من اللہ سے روکتا رہے۔ تا نظام عالم میں ابتری واقعہ نہ ہو کیونکہ
معاش و معاد کا تمام مدار انصاف و خدا شناسی پر ہے اور التزام انصاف و خدا ترسی ایک
قانون پر موقوف ہے۔ جس میں دقائق معدلت و حقائق معرفت الٰہی بدرستی تمام
درج ہوں اور سہواً یا عمداً کسی نوع کا ظلم یا کسی نوع کی غلطی نہ پائی جاوے۔ اور ایسا
قانون اسی کی طرف سے صادر ہو سکتا ہے جس کی ذات سہو و خطا و ظلم و تعدی سے بکلی
پاک ہو۔ اور نیز اپنی ذات میں واجب الانقیاد اور واجب التعظیم بھی ہو۔ کیونکہ گو کوئی
قانون عمدہ ہو مگر قانون کا جاری کرنے والا اگر ایسا نہ ہو جس کو باعتبار مرتبہ اپنے کے
سب پر فوقیت اور حکمرانی کا حق ہو۔ یا اگر ایسا نہ ہو جس کا وجود لوگوں کی نظر میں ہر

ایک طور کے ظلم وخبث اور خطا اور غلطی سے پاک ہو تو ایسا قانون اول تو چل ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کچھ دن چلے بھی تو چند ہی روز میں طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں اور بجائے خیر کے شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے کتاب الٰہی کی حاجت ہوئی۔ کیونکہ ساری نیک صفتیں اور ہر یک طور کی کمالیت وخوبی صرف خدا ہی کی کتاب میں پائی جاتی ہے وبس۔"

ازاں بعد آپ نے ایک سوال کا جواب درج ذیل الفاظ میں سپرد قلم فرمایا:

"وسوسۂ ششم: معرفت کامل کا ذریعہ وہ چیز ہو سکتی ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں کھلے طور پر نظر آتی ہو۔ سو یہ صحیفہ نیچر کی خاصیت ہے جو کبھی بند نہیں ہوتا اور ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور یہی رہبر ہونے کے لائق ہے۔ کیونکہ ایسی چیز کبھی رہنما نہیں ہو سکتی جس کا دروازہ اکثر اوقات بند رہتا ہو اور کسی خاص زمانہ میں کھلتا ہو۔

جواب: صحیفۂ فطرت کو بمقابلہ کلام الٰہی کھلا ہوا خیال کرنا یہی آنکھوں کے بند ہونے کی نشانی ہے۔ جن کی بصیرت اور بصارت میں کچھ خلل نہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اسی کتاب کو کھلے ہوئے کہا جاتا ہے جس کی تحریر صاف نظر آتی ہو جس کے پڑھنے میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہتا ہو۔ پر کون ثابت کر سکتا ہے کہ مجرد صحیفہ قدرت پر نظر کرنے سے کبھی کسی کا اشتباہ دور ہوا؟ کس کو معلوم ہے کہ اس نیچری تحریر نے کبھی کسی کو منزل مقصود تک پہنچایا ہے؟ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے صحیفہ قدرت کے تمام دلالات کو بخوبی سمجھ لیا ہے؟ اگر یہ صحیفہ کھلا ہوا ہوتا تو جو لوگ اسی پر بھروسہ کرتے تھے، وہ کیوں ہزارہا غلطیوں میں ڈوبتے۔ کیوں اسی ایک صحیفہ کو پڑھ کر باہم اس قدر مختلف الرّائے ہو جاتے کہ کوئی خدا کے وجود کا کسی قدر قائل اور کوئی سرے سے انکاری۔ ہم نے بفرض محال یہ بھی تسلیم کیا کہ جس نے اس صحیفہ کو پڑھ کر خدا کے وجود کو ضروری نہیں سمجھا، وہ اس قدر عمر پالے گا کہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے گا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ صحیفہ کھلا ہوا تھا تو اس کو دیکھ کر ایسی بڑی بڑی غلطیاں کیوں پڑ گئیں۔ کیا آپ کے نزدیک کھلی ہوئی کتاب اسی کو کہتے ہیں جس کو پڑھنے والے خدا کے وجود میں ہی اختلاف کریں اور بسم اللہ ہی غلط ہو۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اسی صحیفہ فطرت کو پڑھ کر ہزارہا حکیم اور فلاسفر دہریئے اور طبعی ہو کر

مرے۔ یابتوں کے آگے ہاتھ جوڑتے رہے اور وہی شخص ان میں سے راہ راست پر
آیا جو الہام الٰہی پر ایمان لایا۔ کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے کہ فقط اس صحیفہ کے
پڑھنے والے بڑے بڑے فیلسوف کہلا کر پھر خدا کے مدبر وخالق بالارادہ اور عالم
بالجزئیات ہونے سے منکر رہے اور انکار ہی کی حالت میں مر گئے۔ کیا خدا نے تم کو اس
قدر بھی سمجھ نہیں دی کہ جس خط کے مضمون کو مثلاً زید کچھ سمجھے اور بکر کچھ خیال
کرے اور خالد ان دونوں کے بر خلاف کچھ اور تصور کر بیٹھے۔ تو اس خط کی تحریر کھلی
ہوئی اور صاف نہیں کہلاتی بلکہ مشکوک اور مشتبہ اور مبہم کہلاتی ہے۔ یہ کوئی ایسی
دقیق بات نہیں جس کے سمجھنے کے لئے باریک عقل درکار ہو بلکہ نہایت بدیہی
صداقت ہے۔ مگر ان کا کیا علاج جو سراسر تحکم کی راہ سے ظلمت کو نور اور نور کو ظلمت
قرار دیں۔ اور دن کو رات اور رات کو دن ٹھہراویں۔ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ
مطالب دلی کو پورا پورا بیان کرنے کے لئے یہی سیدھا راستہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے
مقرر ہے کہ بذریعہ قول واضح کے اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا جائے۔ کیونکہ دلی ارادوں
کو ظاہر کرنے کے لئے صرف قوت نطقیہ آلہ ہے۔ اسی آلہ کے ذریعہ سے ایک انسان
دوسرے انسان کے مافی القلب سے مطلع ہوتا ہے۔ اور ہر ایک امر جو اس آلہ کے
ذریعہ سے سمجھایا نہ جائے، وہ تفہیم کامل کے درجہ سے متنزل رہتا ہے۔ ہزارہا امور
ایسے ہیں کہ اگر ہم ان میں فطرتی دلالت سے مطلب نکالنا چاہیں تو یہ امر ہمارے لئے
غیر ممکن ہو جاتا ہے اور اگر فکر بھی کریں تو غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔"[5]

حضرت مسیح موعودؑ نے 1882ء میں اپنی حیرت انگیز ایمانی بصیرت سے کارل مارکس وغیرہ
دہریہ مغربی فلاسفروں کے معاشی نظریات کی نسبت جو کچھ تحریر فرمایا، بالشویکی روس کے عبرت ناک
انجام سے حرف بحرف درست نکلا اور دنیا پر خوب کھل گیا کہ کلام اللہ کے بغیر جو فلسفہ بھی اختراع کیا
جاتا ہے وہ ناکام ونامراد رہتا ہے۔

مشہور جرمن نومسلم محمد اسد نے اپنی کتاب The Road To Macca میں اپنے سفر روس
(1926ء) کا تذکرہ کیا ہے اور صفحہ 299 پر اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سوویٹ روس کے بارے میں میرا سب سے پہلا اور دیرپا تاثر وہ ہے جو مرد
کے ریلوے سٹیشن پر میرے ذہن میں رقم ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا پوسٹر تھا جس میں

مزدوروں کے یونیفارم میں ملبوس ایک نوجوان کی تصویر تھی۔ یہ نوجوان ایک سفید ریش اور عبا قبا میں ملبوس شخص کو (جسے ابر آلود آسمان سے نکلتے دکھایا گیا تھا) ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

سوویت یونین کے مزدوروں نے اسی طرح خدا کو اس کی بلندی سے اتار پھینکا ہے۔

یہ اشتہار سوویت یونین کی اشتراکی جمہورتیوں کی بدمذہب اور بدقماش انجمن کی طرف سے آویزاں کیا گیا تھا۔"[6]

یہ وہ حکومت تھی جو اکتوبر 1917ء کے سرخ انقلاب سے کارل مارکس کے نظریات کی بنیادوں پر استوار کی گئی اور سٹالین دور میں بام عروج تک پہنچی اور بالآخر 15 مارچ 1990ء کو اپنے منطقی انجام تک پہنچی جبکہ سویت یونین میں کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ ہوگیا اور تاجکستان، ترکمانستان، قازقستان، ازبکستان، کرغستان، آذربائیجان، بیلا روس، یوکرائن، مالدورا، جارجیا، اسٹونیا، لیتھونیا، اور لٹویا نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ 13 اکتوبر 1990ء کو برلن کی دیوار گرا دی گئی اور مشرقی اور مغربی جرمنی کے یکجا ہونے سے روس کے آہنی پردے پاش پاش ہوگئے اور 1991ء میں روس میں شامل تمام جمہوری ریاستوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔ روس کی بالشویک حکومت نے پون صدی تک جس طرح معاشی مساوات کے نام پر معصوم مزدوروں بلکہ پوری انسانیت کا قتل عام کیا، اس کے سامنے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے مظالم بھی مات ہوگئے جس کا کسی قدر اندازہ مارکس، اینجلز، لینن اور ٹراٹسکی کے انقلابی خیالات کے پیامبر کامریڈ ٹیڈ گرانٹ(Ted Grant) کی درج ذیل کتاب سے بخوبی لگ سکتا ہے:-

"Russia from Revolution to Counter Revolution"

ذیل میں اس کتاب کے ترجمہ "روس انقلاب سے ردّ انقلاب تک"[7] سے نمونتہً چند اقتباسات سپرد قرطاس کئے جاتے ہیں۔

"سٹالن کی طاقت کا دارومدار اس کی ذہنی صلاحیتوں پر نہیں بلکہ اس حقیقت پر تھا کہ وہ ان لاکھوں سرکاری اہلکاروں کے دباؤ اور مفادات کی عکاسی کرتا تھا **جو طاقت کے حصول کے لئے پاگل ہو رہے تھے.... یہ عمل بالآخر پرانے بالشویکوں کے قتل عام پر منتج ہوا جو انقلاب اور لینن کی پارٹی کو تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سٹالن نے بالشویک پارٹی کے خلاف جلاد کا کردار ادا کیا۔**" (صفحہ 166)

"اس مجنونانہ اشتراکیت کے لئے اقدامات کا ایک جزو یہ تھا کہ "کلاکوں کو بحیثیت طبقے کے" ختم کردیا جائے۔ این ایوٹسکی کے مطابق تین لاکھ کلاک خاندانوں

کو جلا وطن کیا گیا.... **یہ سب سٹالنسٹ نظام حکومت کی نوکر شاہانہ حکمرانی کا خوفناک نتیجہ تھا۔**"(صفحہ 187)

"سٹالن کے اقدامات ساری بیوروکریسی کے لئے خطرہ بن رہے تھے۔ صرف یہی بات نہیں کہ وہ بالائی پرت کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ سوویٹ یونین نے ابھی بمشکل جنگ کی تباہ کاریوں سے بحال ہونا شروع کیا تھا۔ اسے ایک اور تطہیر کے انتشار اور پاگل پن کی نذر کرنے کے **انتہائی تباہ کن اثرات مرتب ہوئے تاہم 5مارچ 1953ء کو اچانک سٹالن کا انتقال ہو گیا۔**"(صفحہ 396)

کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے اپنی کتاب میں سٹالین کے بعد بر سر اقتدار آنے والے ظالم اور سفاک حکمرانوں کے "فرعونی کارناموں" پر بھی روشنی ڈالی ہے چنانچہ خروشچیف حکومت کی نسبت لکھا ہے:

"اس جابرانہ نظام نے نوجوانوں پر شدید اثرات مرتب کئے جنہوں نے نام نہاد کمیونسٹ پارٹی کی آمرانہ حکمرانی کے خلاف کھلی تشکیک اور بدگمانی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ سوویٹ ویکلی نے آٹھ نومبر 1990ء کو ایک جائزہ شائع کیا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ سوویت یونین کے صرف 14 فیصد نوجوان سی پی ایس یو پر ایمان رکھتے ہیں۔ سکولوں میں ان پر مارکسزم لینن ازم کی جو مضحکہ خیز شکل مسلط کی جاتی تھی، وہ اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے تھے۔ اسی جائزے میں یہ شرمناک دعویٰ بھی کیا گیا کہ ان کی صرف 15-20 فیصد تعداد سوشلزم پر یقین رکھتی ہے.... ان کا پالا صرف اس کی بے جان اور دماغ کو سن کر دینے والی مضحکہ خیز نقل سے ہی پڑا تھا۔ ان کے علم میں آنے والا واحد "سوشلزم ایک آمرانہ عفریت تھا۔"(صفحہ 454)

بالشویکی روس کے سب دعاوی جس طرح ریت کے گھروندے ثابت ہوئے اور اس کی ٹوٹ پھوٹ نے عالمی سطح پر جو تباہی مچادی ہے، اس کا نقشہ کامریڈ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"تجربے نے ثابت کیا ہے کہ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ تمام قومیتوں کے لئے تباہی کا پیغام لائی ہے۔"(صفحہ 517)

"سارے جہان کی خرابیاں روس کے حصے میں آئیں یعنی نوکر شاہانہ گھپلے اور بدانتظامی اور ایک بدعنوان اور غنڈہ گردی پر مبنی سرمایہ داری کی تمام ترخامیاں۔" (صفحہ 553)

"کئی دہائیوں کی آمرانہ حکمرانی کے بعد سٹالن ازم کی طرف واپسی کے سلسلے میں

کوئی جوش وخروش نہیں پایا جاتا تھا۔ عوام انتشار، بدعنوانی اور بدمعاشی، روسی بورژوازی کے عمومی گھٹیا پن سے جس کی ریاستی اداروں کی لوٹ کھسوٹ کو فنانشل ٹائمز نے **بھی اس صدی کی سب سے بڑی چوری قرار دیا تھا۔**"(صفحہ 597)

کامریڈ ٹیڈ گرانٹ نے مستقبل کی نسبت یہ رائے دی ہے کہ:

"روس کی قسمت ایک ڈوری سے لٹک رہی ہے جو بالآخر ٹوٹ جائے گی۔ یلسن اور چبائس بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزدوروں کی اجرتیں ادا کرنے سے انکار کر کے بجٹ کو متوازن بنانے کا ڈرامہ رچا رہے ہیں۔ سماجی تصادم کے لئے یہ ایک آزمودہ فارمولا ہے ایک مخصوص مرحلے پر مایوسی اور بے دلی شدید غصے میں تبدیل ہو جائے گی۔"(صفحہ 726)

الغرض کارل مارکس، لینن اور ٹراٹسکی کے پرستار پون صدی بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں خدا کے مسیح نے 1882ء میں اس کی نشان دہی کر دی تھی اور قبل از وقت انتباہ فرما دیا تھا کہ

"خدائی قانون کے مقابل جو نظام بھی قائم ہوتا ہے اگر کچھ دن چلے بھی تو چند ہی روز میں طرح طرح کے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں اور بجائے خیر کے شر کا موجب ہو جاتا ہے۔"

خلفائے احمدیت اور سوشلزم

سیدنا حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانی کے زمانہ خلافت میں زار روس سے متعلق خدا کا قہری نشان رونما ہوا۔ سرخ روسی انقلاب آیا اور پنڈت نہرو کی سکیم کے مطابق مجلس احرار اسلام نے جماعت احمدیہ کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے سوشلزم کی نسبت 1942ء اور 1945ء میں سوشلزم اور اشتراکیت جیسی ملحد تحریکوں پر فاضلانہ لیکچر دیئے جو نظام نو اور اسلام کا اقتصادی نظام کے نام سے قیام پاکستان سے قبل چھپ گئے اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں خصوصاً ہسپانوی ترجمہ نے وہاں کے اونچے طبقوں پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔

حضرت مصلح موعود ایشیا میں ہی نہیں دنیا بھر کے واحد مذہبی پیشوا ہیں جنہوں نے خدا سے علم پاکر سوشلزم اور کمیونزم کے عبرتناک زوال کی اس وقت خبر دی جب یہ تحریکیں عالمی رفعتوں کی آخری حدوں کو چھو رہی تھیں۔ چنانچہ فرمایا:

1:-"کمیونزم انسان کو انسان نہیں بلکہ ایک مشین سمجھتا ہے.... مگر یہ مشینری

زیادہ دیر تک نہیں چل سکتی۔ **وقت آئے گا کہ انسان اس مشینری کو توڑ پھوڑ کے رکھ دے گا اور اس نظام کو اپنے لئے قائم کرے گا جس میں عائلی جذبات کو اپنی پوری شان کے ساتھ برقرار رکھا جائے گا۔**"[8]

2:-"اس وقت بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ روس اقتصادی طور پر کامیاب ہو رہا ہے لیکن جب اس کی صنعت بڑھے گی، اس وقت اس کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور اقتصادی طور پر وہ بالکل گر جائے گا"۔[9]

3:-"حال ہی میں اسٹیفن کنگ حال ممبر پارلیمنٹ انگلستان روس میں دورہ کر کے آئے ہیں انہوں نے اس دورہ کا مفصل ذکر ایک مضمون میں کیا ہے جو Soviet Union کے پرچہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

"روسی گورنمنٹ نہیں چاہتی کہ روس کی قوم آزادی سے اور بغیر کسی روک کے ہمارے خیالات سے یا کسی اور خیال سے جو روسی نہ ہو واقف ہو سکے۔"

یہ بتانے کے بعد حضرت مصلح موعود نے پیشگوئی فرمائی:

"آخر یہ کولڈ سٹورج میں رکھنے کا معاملہ کب تک چلے گا؟ ایک دن یہ دیوار ٹوٹے گی"

اور یہ بتانے کے بعد حضرت مصلح موعود نے پیشگوئی فرمائی۔

"دنیا ایک زبردست تغیر دیکھے گی۔"[10]

حضرت مصلح موعود نے کمیونزم کی مذہب دشمنی کا پردہ چاک کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ اس نظام میں وہ شخص جس کے پیروں کی میل کے برابر بھی ہم دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ کو نہیں سمجھتے، جس کے لئے ہم میں سے ہر شخص اپنی جان کو قربان کرنا اپنی انتہائی خوش بختی اور سعادت سمجھتا ہے یعنی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم.... اسی طرح مسیح، موسیٰ، ابراہیم.... سب کے سب نکمے اور قوم پر بار تھے اور ایسے آدمیوں کو ان کے قانون کے ماتحت یا تو فیکٹریوں میں کام کرنے کے لئے بھجوا دینا چاہیئے تاکہ ان سے جوتے بنوائے جائیں.... اور اگر یہ لوگ اس قسم کے کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر ان کا کھانا پینا بند کیا جانا چاہیئے۔ ان کے نزدیک یہ لوگ نکمے اور قوم پر بار ہیں۔

کمیونزم کے اس ظالمانہ اور ناپاک نظریہ کو پیش کرنے کے بعد حضرت مصلح موعودؓ نے صدائے ربّانی بن کر نہایت درجہ شوکت اور جلال سے فرمایا:

”میں دوسری دنیا کو نہیں جانتا مگر میں اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نظام جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ نہیں خدا کی قسم، اس میں میری بھی جگہ نہیں۔“[11]

یہی نہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اپنے عہد خلافت سے بھی بیس سال قبل جلسہ سالانہ قادیان 1945ء کے سٹیج سے جو پہلی تقریر فرمائی اُس کا عنوان ہی یہ تھا”اشتراکیت کے اقتصادی اصول کا اسلامی اقتصادی اصول سے موازنہ“۔ ازاں بعد جب خدا تعالیٰ نے آپ کو منصب خلافت پر متمکن فرمایا تو آپ نے اسلام کے اقتصادی نظام کے اصول اور فلسفہ پر بصیرت افروز خطبات ارشاد فرمائے نیز پاکستان کے عوام اور سیاسی پارٹیوں کی راہ نمائی کے لئے ”اسلام غریبوں اور یتیموں کا محافظ“ کے نام سے حضرت مصلح موعود کی تفسیر کبیر کے اہم اقتباسات کا دلکش مجموعہ شائع کرایا جو سید میر محمود احمد صاحب ناصر (سابق پرنسپل جامعہ احمدیہ) نے حضور کی ہدایت پر مرتب کیا اور نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان نے شائع کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن دو ہزار کی تعداد میں چھپا۔[12]

حواشی:

1 ”پیغام صلح“ صفحہ 6 طبع اول جون 1908۔

2 ”کشتی نوح“ صفحہ 38 حاشیہ طبع اول۔

3 ”اسلامی اصول کی فلاسفی“ صفحہ 57۔

4 ”تفسیر صغیر۔“

5 ”براہین احمدیہ“ جلد دوم صفحہ 188 تا 191 حاشیہ در حاشیہ 11 طبع اول۔

6 ”روس میں مسلمان قومیں“ صفحہ 228۔

7 مترجم ابو فراز ناشر جدوجہد پبلیکیشنز لکشمی چوک لاہور دسمبر 1999ء۔

8 ”اسلام کا اقتصادی نظام“ صفحہ 85 لیکچر 26 فروری 1945 اشاعت اگست 1945ء ناشر دفتر تحریک جدید۔

9 ایضاً صفحہ 87۔

10 ایضاً صفحہ 100۔

11 ایضاً صفحہ 70۔

12 اس مجموعہ کا دیباچہ ناشر کی طرف سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ارشاد کی تعمیل میں راقم الحروف (دوست محمد شاہد) نے لکھا۔

تیسویں فصل

احمدیوں نے الیکشن 1970ء میں اکثر ووٹ پیپلز پارٹی کو کیوں دیئے

اب آخر میں طبعاً یہ سوال اٹھتا ہے کہ جماعت احمدیہ نے ملکی انتخاب دسمبر 1970ء میں اپنے پیارے امام حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے خصوصی ارشاد پر اکثر ووٹ پیپلز پارٹی کو کیوں دیئے؟ دوسری مذہبی سیاسی پارٹیوں کو مسترد اور نظر انداز کرنے کا جواز کیا تھا۔ بلاشبہ یہ نہایت اہم سوال ہے جس پر تین زاویہ نگاہ سے غور کیا جانا ضروری ہے۔

اوّل: جنرل یحییٰ خاں نے انتخاب سے قبل دو ایسے اقدامات کئے جن سے مشرقی پاکستان کو پورے ملک پر سیاسی برتری حاصل ہو گئی۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے مغربی پاکستان کے ون یونٹ کو ختم کر دیا جس کے ٹوٹنے سے مغربی پاکستان کے سابق صوبے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان بحال ہو گئے۔ دوسرے انہوں نے مشرقی پاکستان کے لیڈروں کا یہ مطالبہ منظور کر لیا کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں نمائندگی برابر نہیں بلکہ آبادی کی بنیاد پر ہو۔ چنانچہ انہوں نے 27 مارچ 1970ء کے آئین کے ڈھانچے (Legal Frame) میں تسلیم کیا کہ آئندہ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد اور ''ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول'' پر ہوں گے۔ مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمن صاحب کے چھ نکات اور یحییٰ حکومت کے لیگل فریم کے پیش نظر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی دور بین نگاہ نے بھانپ لیا کہ اگر کسی ایسی پارٹی کو کامیاب نہ کرایا گیا جس کے جڑیں چاروں صوبوں میں مضبوط ہوں، پاکستان کا وجود شدید خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اور چونکہ عوامی لیگ کو مغربی پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ از حد بغض ہے اس لئے ممکن ہے وہ بنگال کی آزادی کا اعلان کر کے صوبوں کو بھی خود مختاری دے دیں اور ہر صوبہ ہمسایہ ملک میں سے کسی کے ساتھ الحاق کر لے جو یقیناً پاکستان کی مکمل تباہی پر منتج ہو گا۔ چنانچہ آپ کی مدبرانہ فراست وسیاست نے چاروں صوبوں میں ابھرنے والی نئی پارٹی کو ووٹ دلائے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب 16 دسمبر 1970ء کو ملک کا مشرقی بازو عوامی لیگ اور اس کے حامی احرار لیڈروں کی ملی بھگت اور سازش سے کٹ گیا اور افواج پاکستان کے ترانوے ہزار سپاہی ہندوستان کے قبضہ میں چلے گئے تو پیپلز پارٹی کی بدولت مغربی پاکستان کے چاروں صوبے دوبارہ ایک مرکز تلے جمع ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد پاکستانی فوج کے سپاہی آزاد ہو کر اپنے پیارے وطن میں آبرومندانہ طور پر پہنچ گئے۔ اس طرح قافلہ پاکستان پھر سے رواں دواں ہو گیا۔ بصورت دیگر خدانخواستہ

اس خطہ میں پاکستان کا نام ونشان ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا اور مسلم سپین کی طرح صرف قصہ پارینہ بن کے رہ جاتا۔ اس سنگین اور لرزہ خیز صورت حال ہی کا کسی قدر اندازہ لگانے کے لئے پیپلز پارٹی کے ترجمان "مساوات" کے ایڈیٹر اور پارٹی کے نامور مبصر جناب عباس علی شاہ (عباس اطہرؔ) کے تازہ اور حقیقت افروز انٹرویو کے درج ذیل حصہ کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے جو انہوں نے رسالہ "قومی ڈائجسٹ" کے خصوصی نمائندہ کو دیا اور اس رسالہ نے خاص اہتمام سے جولائی 2008ء کے شمارہ میں زیب اشاعت کر دیا ہے۔ متعلقہ حصہ درج کیا جاتا ہے۔

"سوال: بھٹو صاحب سیاستدان تھے کہ شعبدہ باز تھے؟

جواب: پتہ نہیں سیاستدان کیا ہوتا ہے اور شعبدہ باز کیا ہوتا ہے؟ لیکن وہ ایک درد مند دل رکھنے والا انسان تھا۔ وہ ایک آدمی تھا جس نے غریب آدمی کو عزت نفس کا احساس دلایا۔ اس کے دور کے پاکستان کا باقی ادوار سے موازنہ کر لیں تو میرے خیال میں اس کا دور معاشی اعتبار سے پاکستان کا بہترین زمانہ تھا۔ انہوں نے ملک کے اندر روز گار کے مواقع پیدا کئے۔ بیروز گاری ختم ہوئی۔ عرب ممالک کے دورے کر کے پاکستانیوں کو باہر کے ممالک، خلیجی ریاستوں میں ملازمتیں دلوائیں۔ اس کے لئے انہوں نے آتے ہی باہر کے دورے (پندرہ ایک دفعہ دورے کئے، تیرہ ایک دفعہ) کیے جس کے نتیجے میں ہمارے لوگ باہر جانے لگے۔ زرمبادلہ کی پاکستان آمد شروع ہوئی جس سے معاشی سرگرمیوں میں مثبت اثر پڑا۔ گاؤں گاؤں میں ریڈیو بج اٹھا۔ آج تو ٹیلی ویژن ہر گھر میں ہے۔ ان دنوں ریڈیو بڑی شے ہوتی تھی۔ لوگوں کو ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ کچھ آسائشیں بھی میسر آئیں۔ سعودی عرب، کویت، عراق، لیبیا اور خلیج کی ریاستوں میں پاکستانیوں کے جانے سے پاکستان میں باہر کا پیسہ آنا شروع ہوا تو یہاں پر ان کے رشتے داروں کے دن پھر گئے۔

سوال: بھٹو اور مجیب نے مغربی اور مشرقی پاکستان میں انتخابات میں ایک دوسرے کے مدمقابل امیدوار کیوں کھڑے نہیں کئے تھے؟ یہ سب غیر ارادی تھا یا کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ؟

جواب: میرا خیال ہے یہ سب حالات کا تقاضا تھا۔ دراصل بنگالیوں یا مشرقی پاکستانیوں کے دل میں مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب کے خلاف نفرت انتہا پر تھی۔ وہ اپنا ذہن بنا چکے تھے کہ یا تو ان کے استبداد سے نجات حاصل کرنی ہے یا پھر ان سے چھٹکارا پانا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا ہماری فوج کا تھا۔ وہاں پر مجیب صاحب کی مقبولیت عروج پر تھی۔ وہاں کے لوگ انہیں "بنگلہ بندھو" کے نام سے پوجتے تھے۔ میرے خیال میں ان کے مقابلے میں صرف ایک بندہ جیتا تھا۔ نور الامین۔ بھٹو صاحب اگر وہاں

جا کر انتخابی مہم چلاتے۔ امیدوار کھڑے کرتے تو صورت حال ہی کچھ ایسی ہو چکی تھی کہ سارے کے سارے امیدوار ہار جاتے۔ توانہوں نے اس لئے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب پہ توجہ مرکوز کر دی جس سے اس حصے سے وہ اکثریت حاصل کر گئے۔

سوال: مجیب الرحمن نے مغربی پاکستان سے امیدوار کیوں نہیں کھڑے کئے ؟

جواب: مجیب الرحمن کو بھی پتہ تھا کہ مغربی حصے میں اس کو پسند نہیں کیا جاتا۔ مجیب کے چھ نکات ادھر پسند نہیں کیے جاتے تھے۔ مجھے مجیب کا جلسہ یاد ہے وہ ادھر آئے تو برکت علی سلیمی کے گھر پر ٹھہرے۔ ایک جلسہ ہوا تھا گول باغ میں جسے اب ناصر باغ کہتے ہیں۔ وہ جلسہ میں آئے تو وہاں جماعت اسلامی والوں نے ہنگامہ کر دیا۔ وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلے آئے کہ مجھے تو لوگوں کے ووٹ نہیں چاہئیں۔ میں تو ویسے ہی آیا تھا۔

سوال: یحییٰ مجیب مذاکرات ناکام بنانے میں کس کا ہاتھ تھا؟

جواب: خود یحییٰ کا۔ آپ کا کیا خیال ہے یحییٰ کوئی صدارت چھوڑنی چاہتا تھا؟ فوج اقتدار سے ہاتھ دھونا چاہتی تھی؟ یہ سب یحییٰ اور فوج کی کارستانی تھی۔ اگر اس وقت مجیب وزیر اعظم بن کر چھ نکاتی ایجنڈا نافذ کر دیتا تو ایک پاکستان کی جگہ پانچ پاکستان بن جاتے۔ کیونکہ چھ نکات کے مطابق ہر صوبہ اپنی جگہ ایک خود مختار ملک کی صورت ہوتا۔ اس وجہ سے یہاں مغربی پاکستان میں اس کے سیاسی پروگرام کو پذیرائی نہ مل سکی تھی۔"[1]

دوم: پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے کی پاکستان کی سالمیت کے اعتبار سے بھی قومی ضرورت تھی اور وہ یہ کہ ملک اب تک مُلّاؤں کی فتنہ خیزیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور 1953ء کی ایجی ٹیشن نے پورے ملک کا امن غارت کر رکھا تھا اور خون ریز تصادموں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ فرقہ پرست پارٹیوں کا طوفانِ غیظ وغضب تھمنے میں ہی نہیں آرہا تھا بلکہ روز بروز اس کی تلاطم خیزیوں میں اضافہ ہو رہا تھا حتّٰی کہ انہوں نے دوسروں کی تکفیر کو اپنے انتخابی منشور کا جزو اعظم بنا لیا تا اپنے ہم مذہبوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ بٹور سکیں۔ مثلاً کل پاکستان جمعیت علماء اسلام نے ستمبر 1969ء میں اپنے شائع شدہ منشور[2] کی دفعہ 8 میں مسلمان کی خود ساختہ تعریف کر کے احمدیوں کے بھی غیر مسلم ہونے کا مفروضہ پورے طمطراق سے شامل کیا جس کے مطالبہ دفعہ 9 میں لکھا:

"جو فرقے اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ مثلاً ختم نبوت وغیرہ سے انحراف کے مرتکب ہو چکے ہیں ،انہیں غیر اسلامی قرار دیا جائے گا اور آئندہ اس قسم کے

انحراف کو دستور میں ممنوع اور واجب التعزیر قرار دیا جائے گا۔"(صفحہ 14)

منشور کی دفعہ 7 میں درج کیا گیا کہ "صدر مملکت کا مسلمان ہونا اور پاکستان کی 98 فیصد مسلمان اکثریت اہل سنّت کا ہم مسلک ہونا ضروری ہو گا۔"

دفعہ 6 یہ تجویز کی گئی:

"مملکت کی کلیدی اسامیاں غیر مسلموں اور مرتدوں کے لئے ممنوع قرار دے دی جائیں گی"(صفحہ 13)

فرقہ پرست پارٹیوں کے مقابل پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور اس مذہبی دہشت گردی سے بالکل مبرا تھا بلکہ اس نے عین انتخابات کے ایام میں مکتبہ جدید پریس لاہور سے ایک جہازی سائز کا اشتہار شائع کیا جس میں نہایت جلی قلم سے لکھا تھا۔

"ہم مسلمانوں کو کافر بنانے نہیں، کافروں کو مسلمان بنانے آئے ہیں"

سوم: انتخابات 1970ء میں جماعت احمدیہ کی طرف سے فرقہ پرست اور نام نہاد مذہبی پارٹیوں کو ووٹ نہ دینے کی تیسری اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد مبارک ہے۔

"انا واللہ لا نولی علٰی ھذا العمل احداً سألہ ولا احداً حرص علیہ"

(بخاری و مسلم)

خدا کی قسم ہم اس منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کا طالب ہو اور نہ کسی ایسے شخص کو جو اس کا حریص ہو۔

ابو داؤد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ مبارک الفاظ ریکارڈ ہیں۔

ان اخوانکم عندنا من طلبہ

"ہمارے نزدیک سب سے بڑا خائن وہ شخص ہے جو اس چیز کا حریص ہے۔"

امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "انتخابی جدوجہد" صفحہ 9 پر یہ احادیث نقل کر کے لکھا ہے۔

"رسول حق کے یہ ارشادات بجائے خود حکمت و دانائی کے جواہر تھے جن کی سچائی پر عقل عام گواہی دے رہی تھی۔ لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر پر کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری

اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے، ان میں **ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔**"[3]

فرقہ پرست علماء ان احادیث سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کا اپنے مدرسوں میں درس دیتے چلے آرہے تھے اور کتابوں میں عہدہ طلبی کی لعنت سے بچنے کی تلقین کرتے آرہے تھے۔

مسٹر بھٹو اور ان کی نئی پارٹی ایک سیاسی پارٹی کے طور پر مطلع سیاست پر ابھری۔ اس نے ان حدیثوں کو دیکھانہ پڑھا۔ اس کا درس دیانہ کسی تقریر و تحریر میں ان کا حوالہ دیا مگر پاکستانی عوام یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ ختم نبوت کے نام نہاد محافظ علماء نے محض اقتدار کی ہوس میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس حدیث ردی کی ٹھوکری میں پھینک دی۔

لہٰذا احمدیوں کا دینی فرض تھا کہ وہ اس دنیا پرست طائفہ کو کسی صورت میں بھی ووٹ نہ دیں کیونکہ یہ عشق رسول عربی کے منافی تھا اور ایسا اقدام جذبہ غیرت رسول پر ڈاکہ ڈالنے اور روح اسلام کو کچلنے کے مترادف تھا جس کا تصور کوئی احمدی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں۔ ؎

تیرے منہ کی ہی کی قسم میرے پیارے احمدؐ
تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے
کافر و ملحد و دجال ہمیں کہتے ہیں
نام کیا کیا غمِ ملّت میں رکھایا ہم نے

حواشی:

1 "قومی ڈائجسٹ" جولائی 2008ء صفحہ 24-23۔

2 مرتبہ احمد حسین کمال ناظم مرکزی دفتر علماء اسلام بیرون لوہاری دروازہ ملتان چوک رنگ محل لاہور۔

3 "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد۔ اس کے مقاصد اور دو طریق کار" صفحہ 7 شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان۔

اکتیسویں فصل

وزیر اعظم پاکستان کا حیرت انگیز اعتراف واقعہ ربوہ کا تعلق بیرونی استعمار سے ہے

اب آخر میں فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ قطع نظر اس بات کے کہ اس دور کے وزیر اعظم پاکستان مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے شاہ فیصل اور علماء یا عوام کے دباؤ میں نیشنل اسمبلی سے کیا فیصلہ کرایا، یہ حقیقت ہے کہ ان کے نزدیک بھی احراری مطالبہ کی کوئی مذہبی حیثیت نہیں تھی بلکہ ایک ایسا خوفناک سیاسی ناٹک تھا جو بیرونی استعمار کے ایجنٹوں نے رچایا تھا۔ جس کا مقصد بیک وقت پاکستان کے جہاد میں شامل مذہبی جماعت، جماعت احمدیہ اور مملکت پاکستان پر ضرب کاری لگانا تھا۔

اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت یہ ہے کہ وزیر اعظم پاکستان مسٹر بھٹو نے پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کی اطلاعات پر سانحہ ربوہ سے ایک ماہ پیشتر ایک خصوصی انٹرویو میں قبل از وقت بتایا:

> ”روس بھارت کو جدید میزائلوں، جنگی طیاروں اور بحریہ کی سامان کی صورت میں بڑے پیمانے پر امداد دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت خود بھی ہتھیاروں کی خریداری پر ڈھائی ارب خرچ کر رہا ہے.... جب آپ کے ارد گرد کے ممالک اپنے آپ کو ہتھیاروں سے لیس کر رہے ہیں تو قدرتی طور پر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔“[1]

پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں (Intelligentia) کی یہ اطلاعات حرف بحرف درست ہوئیں اور مئی 1974ء کے تیسرے ہفتہ میں بھارت نے پوکھراں (راجستھان) میں پہلا ایٹمی دھماکہ کیا جس کو اس درجہ مخفی رکھا گیا کہ امریکہ، چین اور یورپ تو رہا ایک طرف خود بھارت کے سیاسی حلقوں بلکہ اکثر بھارتی سائنسدانوں تک بھی اس راز سربستہ کی بھنک تک نہیں پہنچی۔ چنانچہ جناب زاہد ملک صاحب اپنی کتاب ”ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اور اسلامی بم“ کے صفحہ 179 پر رقم طراز ہیں۔

> ”چین کے جون 1967ء میں چھٹے دھماکے سے بہت پہلے بھارت ایٹم بم بنانے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ اور بھارت کی نیوکلیائی اہلیت کے فوجی استعمال کی طرف جانے کا فیصلہ لال بہادر شاستری نے کیا تھا۔ لیکن ان دنوں کمیشن کے چیئرمین سارابھائی کی زیادہ توجہ خلائی پروگرام پر مرکوز تھی۔ البتہ 1971ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد مسز اندرا گاندھی نے بھارت کی سیاسی برتری کو دیرپا بنانے کے لئے ایٹمی طاقت

بننے کا پختہ فیصلہ کر لیا اور 1972ء میں اس بارے میں ایٹمی سائنس دانوں کو ضروری ہدایات جاری کر دی گئی تھیں۔ مگر انہی دنوں ایٹمی ادارہ کا سربراہ اچانک چل بسا۔ اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو یہ منصوبہ نئے سربراہ ڈاکٹر ایم این سیتھنا کو سونپنا پڑا۔ بھارتی مصنفین اور خفیہ اداروں کا کہنا ہے کہ بھارت کے تمام ایٹمی سائنسدانوں میں سے وزیر اعظم کے اس فیصلے کا علم صرف سیتھنا کو تھا۔ اس لئے اس منصوبے پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے کام کیا گیا۔ یہ فیصلہ وزیر اعظم نے ذاتی طور پر کیا تھا اور اس کے لئے اپنی کابینہ سے بھی مشورہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ جب منصوبے کے مختلف ٹکڑوں کو یکجا کیا جانے لگا تب جا کر مسٹر سیتھنا نے اپنے پانچ قریب ترین ساتھیوں کو بتایا کہ وہ لوگ شب روز کس "چیز" پر دماغ سوزی کرتے رہے ہیں۔ جبکہ وزیر اعظم نے اپنی کابینہ کے سینئر وزراء، منتخب فوجی جرنیلوں اور چند اعلیٰ سول افسروں کو صرف چند روز قبل اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا تھا۔ باقی وزراء اور جرنیلوں کو 18 مئی 1974ء کو پوکھراں (راجستھان) میں دھماکے کے بعد خبر ملی تھی۔ اس دھماکے سے نہ صرف یہ کہ بھارت ایٹمی ہتھیاروں کے حامل ممالک کے کلب کا چھٹا ممبر بن گیا۔ بلکہ اس نے ایٹمی میدان میں ایک زبردست پیش رفت حاصل کر لی اور جوہری ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے نگہبان، چودھری کچھ نہ کر سکے۔"[2]

یہ تھی بھارت کی خفیہ جارحانہ کارروائی جس سے بے خبر رکھنے کے لئے بھارت کے ازلی ایجنٹ، موقع پرست اور طالع آزما احراری ملّا یکایک میدان میں آ گیا اور ایک خونی سکیم تیار کر کے خود ہی 29 مئی 1974ء کو نشتر کالج کے طلباء کے ذریعہ ایک ہنگامہ کھڑا کیا اور پھر اپنے خبث باطن سے اسے احمدی نوجوانوں کے جبر و تشدد کا نام دے کر اخباری رپورٹروں کو پُر افترا بیانات دے کر اگلے ہی دن پورے ملک میں جماعت احمدیہ کے خلاف پُر تشدد فسادات کے شعلے بلند کر دیئے اس طرح پاکستان دشمن صحافت نے ملّا کے مفتریات کو پوری طرح کوریج دے کر اہل پاکستان کی توجہ بھارت کے خفیہ دھماکہ سے منعطف کر کے مظلوم اور بے بس پاکستانی احمدیوں کی طرف کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مخالف احمدیت و پاکستان عناصر جماعت احمدیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور بھٹو حکومت سے پُر زور مطالبہ کیا کہ "قادیانیوں کو فی الفور غیر مسلم قرار دیا جائے"۔ حالانکہ ربوہ میں تو صرف ضرب خفیف کی واردات ہوئی جب کہ ملک کے ہر حصہ میں مذہب کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور

اس بناء پر کسی فرقہ نے دوسرے کو غیر مسلم قرار دینے کا کبھی مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی جواز ہو سکتا تھا۔

ضمناً یہاں یہ ذکر کرنا از بس ضروری ہے کہ اسمبلی سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کی پہلی آواز سانحہ ربوہ سے پہلے ملتان سے احرار اور "مجلس تحفظ ختم نبوت" ہی نے اٹھائی تھی۔ ان دین فروش اور خلاف اسلام حرکات کے خلاف خود علماء ہی کے حلقوں سے احتجاج کیا جارہا تھا۔ چنانچہ ایک سابق احراری و مودودی راہنما مولوی عبد الرحیم اشرف مدیر "المنیر" فیصل آباد نے واضح لفظوں میں لکھا:-

"اس وقت جو کوشش "تحفظ ختم نبوت" کے نام سے قادیانیت کے خلاف جاری ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کوشش کا اصل محرک خلوص، خدا کے دین کی حفاظت کا جذبہ ہے یا حقیقی وجہ معاشی اور منفی ذہن کے رجحانات کا مظاہرہ ہے۔ ہماری رائے میں یہ کوشش نہ صرف یہ کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مفید نہیں ہے۔ بلکہ ہم علی وجہ البصیرت کامل یقین واذعان کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ جدوجہد قادیانی شجرہ کے بار آور ہونے کے لئے مفید کھاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

تحفظ ختم نبوت ہو یا مجلس احرار.... ان دونوں کے نام سے آج تک قادیانیت کے خلاف جو کچھ کیا گیا ہے، اس نے قادیانی مسئلہ کو الجھایا ہے۔ ان حضرات کے اختیار کردہ طرز عمل نے راہ حق سے بھٹکنے والے قادیانیوں کو اپنے عقائد میں پختگی کا مواد فراہم کیا ہے اور جو لوگ متذبذب تھے انہیں بدعقیدگی کی جانب مزید دھکیلا ہے۔

استہزاء اشتعال انگیزی، یاوہ گوئی، بے سروپا لفاظی، اس مقدس نام کے ذریعہ مالی غبن، لادینی سیاست کے داؤ پھیر، خلوص سے محروم اظہار جذبات، مثبت اخلاق فاضلہ سے تہی کردار، ناخدا ترسی سے بھرپور مخالفت کسی بھی غلط تحریک کو ختم نہیں کر سکتی۔ اور ملّت اسلامیہ پاکستان کی ایک اہم محرومی یہ ہے کہ "مجلس احرار اور تحفظ ختم نبوت" کے نام سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اکثر و بیشتر حصہ انہی عنوانات کی تفصیل ہے۔"[3]

یہی نہیں مولوی عبد الرحیم صاحب نے "ختم نبوت اور وحدت امت" کے زیر عنوان نام نہاد محافظین ختم نبوت کو چیلنج کرتے ہوئے یہاں تک لکھا:-

"ختم نبوت کا ایک لازمی تقاضا یہ تھا کہ امت محمدیہ بنیان مرصوص کی حیثیت سے قائم علی الحق رہتی۔ اس کے جملہ مکاتب فکر اور تمام فرقوں کے مابین دین کے اساسات پر اس نوع کا اتحاد ہوتا جس نوع کا اتحاد ایک صحیح الذہن امت میں ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن غور کیجئے کیا ایسا ہوا؟

بلاشبہ ہم نے متعدد مراحل پر اتحاد امت کے تصور کو پیش کیا اور سب سے زیادہ قادیانیوں کے خلاف مناظرہ کے سٹیج سے ڈائرکٹ ایکشن کے ویرانے تک ہم نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کے تمام فرقے "یک جان" ہیں کیا حقیقتاً ایسا تھا؟۔ کیا حالات کی شدید سے شدید تر نامساعدت کے باوجود ہماری تلوار نیام میں داخل ہوئی؟ کیا ہولناک سے ہولناک تر واقعات نے ہمارے فتاویٰ کی جنگ کو ٹھنڈا کیا؟

کیا کسی مرحلہ پر بھی "ہمارا فرقہ حق پر ہے اور باقی تمام جہنم کا ایندھن ہیں" کے نعرہ سے کان نامانوس ہوئے؟ اگر ان میں سے کوئی بات نہیں ہوئی تو بتایئے اس سوال کا کیا جواب ہے کہ

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان رکھنے والی امت کے اگر تمام فرقے "کافر" ہیں اور ہر ایک دوسرے کو جہنمی کہتا ہے۔ تولا محالہ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو سب کو اس کفر اور جہنم سے نکال کر اسلام اور جنت کا یقین دلاسکے۔"[4]

خلاصہ کلام یہ کہ احراریوں، دیوبندیوں کی شورش کے دوران ہی وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی صاحب بھٹو کو بھارت کے خفیہ دھاکہ کا پتہ چل گیا۔ جس پر انہوں نے 13 جون 1974ء کو تقریر کی جس میں انہوں نے بتایا کہ واقعہ ربوہ کے پیچھے بھارت، کابل اور روس کا ہاتھ کارفرما ہے اور یہ سب کچھ دشمنان پاکستان کی طرف سے پاکستان کو تباہ کرنے کا خوفناک منصوبہ ہے۔

مسٹر بھٹو کی انگریزی تقریر کا متن اخبار "پاکستان ٹائمز" (Pakistan Times) نے حسب ذیل الفاظ میں شائع کیا۔

"The Prime Minister said that the people were aware that there were deep-rooted conspiracies against their country. The conspiracies had existed long before Pakistan came into benign. They existed even when the struggle for Pakistan had been launched.

He wanted the people to take note of the timing when the Ahmadiyya issue had been raised. There was a nuclear explosion by India, Sardar Dawood of Afghanistan had gone on a visit to Moscow where consultations had taken place, some leaders were in Kabul and the people knew why they were there. He said that the people were as well aware of the conspiracies against him and they knew that there were foreign hands in plots against Pakistan. It was not for him to point that out as the people were conscious enough to take note of developments across their borders, the Prime Minister said."

(The Pakistan Times, Lahore, June 14, 1974 page 1 and 10 Column 8)

روزنامہ "امروز" کے رپورٹر نے یہ تقریر درج ذیل الفاظ میں شائع کی:-

"ہندوستان کا ایٹمی دھماکہ، سردار داؤد کا دورہ روس اور واقعہ ربوہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔"

"وزیر اعظم نے آج ہی شام لاہور میں اپنی نشری تقریر میں کہا کہ عوام اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ **انہوں نے کہا ہندوستان کی طرف سے دھماکہ، افغانستان کے صدر داؤد کا دورہ روس اور ربوہ میں پیش آنے والا واقعہ جیسے تمام واقعات بیک وقت پیش آئے ہیں اور ان کا مقصد دوسرے مرحلے میں پاکستان کو تباہ کرنا ہے۔**"[5]

اس انکشاف نے اس بنیادی حقیقت پر ہمیشہ کے لئے مہر تصدیق ثبت کر دی کہ احراری دیوبندی ملّا کے تصورِ ختمِ نبوت نے دراصل روسی کمیونزم کی کوکھ ہی سے جنم لیا ہے اور اسی دہریہ تحریک کی پیداوار ہے جیسا کہ مفکر احرار چوہدری افضل حق کو تاریخ احرار باب دوم میں کھلے بندوں تسلیم کرنا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لینن اور سٹالن کے پرستار اور کمیونسٹ شاعر مدتوں سے یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ ؎

پھر کوئی آیا دل زار،[6] نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
سوگئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے چراغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ،کوئی نہیں آئے گا

(فیض احمد فیض)

اور سر اقبال کا توبابیت، بہائیت اور اشتراکیت کے سفیر کی حیثیت سے تمام سادہ لوح مسلمانوں کے لئے آخری پیغام فقط یہی ہے ؎

مینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظار مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے[7]

حواشی:

[1] روزنامہ "جسارت" کراچی 30اپریل 1974ء صفحہ 1۔
[2] "ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اور اسلامی بم" صفحہ 179 تالیف جناب زاہد ملک صاحب طبع سوم اگست 1989ء ناشر مطبوعات حرمت مرکز جی 8 اسلام آباد۔
[3] "المنیر" 6 جولائی 1956ء صفحہ 7۔
[4] "المنیر" 9 مارچ 1956ء صفحہ 5۔
[5] روزنامہ "امروز" لاہور 14جون 1974ء صفحہ 1۔
[6] رنج و غم اٹھانے والا۔ مونس و غم خوار۔
[7] رسالہ مخزن مئی 1905ء بحوالہ باقیات اقبال صفحہ 451 مرتب سید عبدالواحد معینی ایم اے (آکسن) طابع و ناشر آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور طبع دوم 1966ء۔

ضمیمہ

مسلم سربراہان کانفرنس 1974ء میں عیسائی وفد کے لیڈر کی تقریر کا مکمل متن

ذیل میں کانفرنس میں عیسائی وفد کے لیڈر کی تقریر کا مکمل متن دیا جاتا ہے جو کانفرنس کی سرکاری رپورٹ کے صفحہ 84 سے 87 پر مع تصویر درج ہے۔ یاد رہے کہ حضرت مسیح کے آسمانی صعود اور ان کے خالق طیور اور محی الاموات کے عقیدوں میں تمام غیر احمدی دنیا متفق ہے۔ مگر جماعت احمدیہ 1889ء سے اب تک ان غلط عقائد اور صلیب پرستی کے خلاف سرگرم جہاد ہے اس لئے قیام جماعت سے لے کر اب تک عیسائی بشپ، پادری اور عیسائی مولّف سب دوسرے فرقوں کے مخالفِ احمدیت علماء کے دوش بدوش تحریک احمدیت کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ خصوصاً 1953، 1974 اور 1984ء میں تو پاکستان کے مسیحی لیڈروں نے اپنے بیانات میں ڈٹ کر احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کی تائید کی ہے۔

سیدنا حضرت مسیح موعودؑ نے اس لئے دعویٰ مسیحیت کے آغاز میں ہی مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے نہایت درد بھرے دل سے یہ حقیقت بیان فرمادی تھی کہ

بحمد اللہ کہ خود قطع تعلق کرد ایں قومے　　　خدا از رحمت واحساں میسر کرد خلوت را

مسیح ناصری را تا قیامت زندہ مے فہمند　　　مگر مدفون یثرب را ندادند ایں فضیلت را

ہمہ عیسائیوں را از مقال خود مدد دادند　　　دلیری ہا پدید آمد پرستاران میت را

(ترجمہ) الحمد للہ اس قوم نے خود ہی مجھ سے قطع تعلق کر لیا اور خدا نے مہربانی اور کرم سے (خدمت دیں کے لئے۔ ناقل) خلوت میسر کر دی۔

یہ مسیح ناصری کو قیامت تک زندہ سمجھتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فضیلت نہیں دی

انہوں نے اپنے عقیدہ سے تمام عیسائیوں کی مدد کی۔ اسی وجہ سے مردہ پرستوں میں بھی دلیری آگئی۔

اس پس منظر میں اب عیسائی وفد کے لیڈر کی تقریر ملاحظہ فرمایئے۔

Speech of His Beatitude Muawad Elias IV

Patriarch of Antioch and All Orient

Mr. Chairman,

What can there be that is more enchanting than the meeting of brethren, when God Almighty is their purpose?

Your Majesties, Excellences,

It is indeed a great source of joy for our delegation to convey to your conference this message of brotherly love, and our prayers for your success.

Is not Jerusalem the goal of this long journey on the path to liberty which we are all engaged in together?

Are we not, Muslims and Christians alike, dedicated to Jerusalem, in hope, determination and sacrifice?

How can we forget thee Jerusalem, when thou art Humanity's "Meraj" to God and the symbol of the spiritual values that descended upon us from His holy inspiration?

In thee, O Jerusalem, Muslims and Christians, in their common yearning for eternal peace, find each according to his religion, their sacred community in their obedience to God and their concern for humanity.

To your esteemed Conference, we have come from the Ancient Churches of the East, prompted by the spirit of friendship and amity which has bound us to you, generation after generation. For God's mercy and benevolence have made it such that there has developed in our homeland more than a common humanity: a oneness that cannot be destroyed. Hence, we are conscious that it is our destiny to

convey to the Christian world abroad, the message of Palestine to kindle its fire wherever it is fading; voicing this message longest where sometimes people deafen their ears or close their eyes to its reality and truthfulness.

Whence the great honour that we have asked for, to speak from the rostrum of this very great conference, the Islamic Summit to the Christians of the world, and to the Muslims as well, proclaiming that Jerusalem is their pride and glory and that, once delivered by rightful struggle, this Holy City of God will be the source of the virtues of the new man who will, in our homelands, stand against the injustices from which we have all suffered.

You will allow me at this junction to salute His Highness Pope Paul VI for his constant concern about Jerusalem, his indefatigable struggle against, its judiazation, and his insistence on its remaining the city of' faith and peace. For then will Jerusalem appear again, in its glorious light, giving a new life to the oppressed who through their sufferings, have dreamt of it as the unique symbol of their perfection and ideals.

Now we say how much we are all nostalgic of this particular beauty and nobility of Jerusalem that emanated from a holiness that no other city has ever had, and which had been in the blessed custody of its Arab inhabitants, now subjected to tyranny, and many of whom have been forced to emigrate from their most beloved city.

But let the enemy know: the Arabs are still alive, a nation determined to fight for its right to return to Jerusalem.

This—and no other—is the sacred right to return, for then will the Arabs have recovered their spiritual home, saved their history. And then, and then only, will they be true to their civilization, able to fulfil their mission to mankind.

The continuity of the tradition which the Palestinians have kept as a cherished trust is an imperative call. A call for a Jerusalem delivered that will be again the home of its people. To us, the preservation of stones, be they sacred temples, cannot be more important than the live presence of peoples. For the presence of God is where people live in constant devotion.

Such is, in our understanding, the Palestinian character of Jerusalem, a human image both national and universal, a call upon all believers to meet in the free and tolerant pursuit of truth.

To us in particular, the significance of the Holy Places has acquired its latitude by the fact that through two thousand years, the temples have derived the substance of their life from the very life of the believers who constitute the human context of the temples.

It is, in this spirit that we understand the historic encounter, so rich in noble meanings, between the Caliph Omar and the Pat‘riarch of Jerusalem: an encounter in friendship and mutual respect.

Today, in our common struggle, the encounter between Muslims and Christians has become a creative unity, within the framework of Arabism.

For we are both threatened by Zionist and by racist and militaristic persecution of our people; a movement that has reversed the values that we have cherished in the Arab East.

Such is the arrogance of Zionism that it has not hesitated to egress the historical features of the City of God, thus attempting to destroy our common heritage, which had filled our lives with joy and inspiration.

In conclusion, let this be our common prayer: that we should all want a Jerusalem delivered that will be again a sanctuary of spirituality. There shall we defend the respect of man whilst yearning for God. There shall we lay the foundations of a new civilization for all the peoples of the world, a civilization based not on exploitation but on peace and justice which alone can assure a fruitful and brotherly meeting of nations.

Mr. Chairman,

It is with the greatest pleasure that I offer on behalf of my delegation and on my own behalf our sincere congratulations to the delegations of Cameroon, Gabon, Gambia, Guinea-Bissau, Uganda and Upper Volta on their admission as members of our Organization. We are also happy with the participation of Iraq for the first time as observer at this historic conference. I bid them a warm welcome and we are happy to have them with us. Their presence here is a clear indication of the growing strength and unity of our Muslim brother-hood.

Another unforgettable event which warms all our hearts is the reconciliation between Pakistan and Bangladesh. Pakistan and Bangladesh were one people and one country, but were separated by accident of history. However, thanks to the untiring efforts of this Conference, both the Governments of Pakistan and Bangladesh have forged a new bond of relationship between them. We all cannot but admire the magnanimity and a deep sense of understanding and accommodation shown by you, Mr. Chairman, as leader of Pakistan, and by His Excellency Prime Minister Shaikh Mujibur Rahman. May this historic event be the beginning of a new era of close and cordial relations between your two countries as brother nations within the Muslim World."

قرآن عظیم میں ہندوستان کے مفسدہ عظیم 1857ء کی پیشگوئی

سیدنا حضرت اقدس مسیح موعودنے وسط 1891ء میں ''ازالہ اوہام'' جیسی معرکہ آراء تالیف شائع کی جس میں آیت قرآنی اِنَّا عَلٰی ذَھَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ (المومنون:19) کے اعداد کی روشنی میں تحریر فرمایا:

> ''آیت اِنَّا عَلٰی ذَھَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوۡنَ ''میں 1857ء کی طرف اشارہ ہے جس میں ہندوستان میں ایک مفسدہ عظیم ہو کر آثار باقیہ اسلامی سلطنت کے ملک ہند سے ناپدید ہو گئے تھے کیونکہ اس آیت کے اعداد بحساب جمل 1274 ہیں اور 1274 کے زمانہ کو جب عیسوی تاریخ میں دیکھنا چاہیں تو 1857ء ہوتا ہے۔ سو در حقیقت ضعف اسلام کا ابتدائی زمانہ 1857ء ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ آیت موصوفہ بالا میں فرماتا ہے کہ جب وہ زمانہ آئے گا تو قرآن زمین پر سے اٹھا لیا جائے گا۔ سو ایسا ہی 1857ء میں مسلمانوں کی حالت ہو گئی تھی کہ بجز بد چلنی اور فسق و فجور کے اسلام کے رئیسوں کو اور کچھ یاد نہ تھا جس کا اثر عوام پر بھی بہت پڑ گیا تھا۔ انہیں ایام میں انہوں نے ایک ناجائز اور ناگوار طریقہ سے سرکار انگریزی سے باوجود نمک خوار اور

رعیت ہونے کے مقابلہ کیا۔ حالانکہ ایسا مقابلہ اور ایسا جہاد ان کے لئے شرعا جائز نہ تھا کیونکہ وہ اس گورنمنٹ کی رعیت اور ان کے زیر سایہ تھے اور رعیت کا اس گورنمنٹ کے مقابل پر سر اٹھانا جس کی وہ رعیت ہے اور جس کے زیر سایہ امن اور آزادی سے زندگی بسر کرتی ہے، سخت حرام اور معصیت کبیرہ اور ایک نہایت مکروہ بدکاری ہے۔ جب ہم 1857ء کی سوانح کو دیکھتے ہیں اور اس زمانہ کے مولویوں کے فتووں پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے عام طور پر مہریں لگادی تھیں جو انگریزوں کو قتل کر دینا چاہئے تو ہم بحر ندامت میں ڈوب جاتے ہیں کہ کیسے مولوی تھے اور کیسے ان کے فتوے تھے جن میں نہ رحم تھا نہ عقل تھی نہ اخلاق نہ انصاف۔ ان لوگوں نے چوروں اور قزاقوں اور حرامیوں کی طرح اپنی محسن گورنمنٹ پر حملہ کرنا شروع کیا اور اس کا نام جہاد رکھا۔ ننھے ننھے بچوں اور بے گناہ عورتوں کو قتل کیا، اور نہایت بے رحمی سے انہیں پانی تک نہ دیا۔ کیا یہ حقیقی اسلام تھا یا یہودیوں کی خصلت تھی۔ کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایسے جہاد کا کسی جگہ حکم دیا ہے۔ پس اس حکیم وعلیم کا قرآن کریم میں یہ بیان فرمانا کہ 1857ء میں میرا کلام آسمان پر اٹھایا جائے گا ،یہی معنے رکھتا ہے کہ مسلمان اس پر عمل نہیں کریں گے جیسا کہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ خدا تعالیٰ پر یہ الزام لگانا کہ ایسے جہاد اور ایسی لڑائیاں اس کے حکم سے کی تھیں یہ دوسرا گناہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ ہمیں یہی شریعت سکھلاتا ہے کہ ہم نیکی کی جگہ بدی کریں۔ اور اپنی محسن گورنمنٹ کے احسانات کا اس کو یہ صلہ دیں کہ ان کی قوم کے صغر سن بچوں کو نہایت بے رحمی سے قتل کریں اور ان کی محبوبہ بیویوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں - بلاشبہ ہم یہ داغ مسلمانوں خاص کر اپنے اکثر مولویوں کی پیشانی سے دھو نہیں سکتے کہ وہ 1857ء میں مذہب کے پردہ میں ایسے گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے جس کی ہم کسی قوم کی تواریخ میں نظیر نہیں دیکھتے۔"

(ازالہ اوہام طبع اول حاشیہ بحوالہ روحانی خزائن جلد 3 صفحہ 489 تا 492)

تاریخ کا انتقام

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے قادیان میں 2 جولائی 1935ء کے خطبہ جمعہ میں عالمی جماعت احمدیہ کو خطاب کرتے ہوئے نہایت پُر شوکت الفاظ میں فرمایا:

"ہماری جماعت تاریخی ہے۔ **آئندہ کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی جب تک جماعت احمدیہ کی تاریخ کا ذکر نہ کرے۔** یہ جماعت خدا تعالیٰ کے فضل سے عنقریب دنیا پر چھا جانے والی ہے۔ پس جو کچھ تم سے ہو رہا ہے اس کا بدلہ تاریخ لے گی اور آج جو لوگ تمہارے حقوق تلف کر رہے ہیں، ان کی نسلیں انہیں گالیاں دیں گی کیونکہ کون ہے جو اپنے آباء کی شرارتوں کا ذکر تاریخوں میں پڑھ کر شرمندہ نہیں ہوتا۔ بے شک آج لوگ ہم پر ظلم کر کے ہنستے ہیں جس طرح رسول کریم ﷺ پر اونٹوں کی اوجھڑی ڈالنے والے ہنستے تھے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ ان کی اس حرکت کو ہزار سال تک یاد رکھا جائیگا اور ہمیشہ کے لئے ان کی ناک کاٹنے کا موجب ہو جائیگی۔ آج بھی ہمارے دشمن اور بعض حکام خوش ہوتے ہیں اور اسے ایک کھیل سمجھتے ہیں مگر انہیں کیا معلوم ہے کہ یہ باتیں تاریخوں میں آئیں گی۔ بڑے سے بڑے مورخ کے لئے یہ ناممکن ہو گا کہ ان واقعات کو نظر انداز کر دے کیونکہ انکے بغیر اسکی تاریخ نامکمل سمجھی جائیگی۔ پڑھنے والے ان باتوں کو پڑھیں گے اور حیران ہونگے ان لوگوں کی انسانیت پر جنہوں نے یہ افعال کئے اور حیران ہونگے ان حکام کے رویہ پر جنہوں نے علم کے باوجود کوئی انتظام نہ کیا اور آنیوالی نسلوں کی رائے انکے خلاف ہو گی۔ ان کی وہ چیز جس کیلئے انسان جان کی قربانی کر سکتا ہے یعنی نیک نامی برباد ہو جائے گی۔"

(روزنامہ "الفضل" 20 جولائی 1935ء صفحہ 5-6)